ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کے لیے دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین معاونین اور احباء کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ہے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت ہے مجلد ہے

غلامانِ اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت ہے مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے قیمت ہے مجلد ہے

۱۹۴۱ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایہ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت ہے مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ہے

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت ہے

بُرہانؔ

جلد پنجدہم شمارہ (۱)

رجب ۱۳۶۴ھ مطابق جولائی ۱۹۴۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے جو سیاسی، معاشی اور کلچرل اثرات دنیا پر پڑے
آج کون نہیں جانتا۔ انہی میں سے ایک عام اثر جس کو ہر جاہل اور عالم محسوس کر سکتا ہے، یہ ہے کہ
مغربی تہذیب نے اپنی خاص عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے ساتھ جنم لیا۔ اور وہ ان خصوصیات
کے ساتھ تمام دنیا پر ایک ابتلائے عام کی صورت میں مسلط ہو گئی، اس کا سبب صاف ظاہر ہے
چار سالہ جنگ میں لاکھوں مرد نذرِ اجل ہو چکے تھے اور اسی تناسب سے لاکھوں عورتیں اور جوان
لڑکیاں بے شوہر ہو گئی تھیں یا باپ اور بھائی کی سرپرستی اور نگرانی سے آزاد ہو کر فقر و فاقہ کے
مصائب سے دوچار ہونے کے لئے زندہ رہ گئی تھیں۔ ایک وسیع اور طاقتور حکومت عورتوں کی
اس کثیر تعداد کے لئے کھانے پینے کا انتظام آسانی سے کر سکتی ہے۔ چنانچہ یورپ کی حکومتوں نے
بھی یہی کیا، ان عورتوں کے لئے کارخانوں اور دوسری دفتری ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے
اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ان غریبوں کے لئے ادنے پونے پیٹ بھرنے کا سامان ہو گیا لیکن ساتھ
ہی اس طریق کار نے معاشرتی زندگی کو حد درجہ متعفن اور گندہ بنا دیا۔ عورتوں میں اقتصادی آزادی
پیدا ہو گئی اور وہ "الرجال قوامون علی النساء" کے قید و بند سے نجات پا کر ہر ممکن من مانی
کارروائی کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ پھر چونکہ ان اقوام میں تعدد ازدواج قانوناً ممنوع تھا اور عورتوں
کی اتنی کثیر تعداد مردوں کی قلیل تعداد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکتی تھی۔ اس
بنا پر ان عورتوں کے لئے جو کارخانوں اور دفتروں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی
خوگر ہو چکی تھیں۔ جنسی خواہشات کی تکمیل و تسکین کے لئے بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہا
تھا کہ یہ آوارگی اور بدچلنی کی راہ اختیار کریں۔

چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام یورپ عیاشی اور بدکاری کے دلدل میں پھنس کر رہ گیا۔ اور چونکہ اس کو سیاسی اعتبار سے دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں بڑا تفوق حاصل تھا۔ اس لئے تقریباً تمام دنیا ہی اس رنگ میں رنگی گئی۔

جنگ جتنی زیادہ طویل ہمہ گیر اور شدید ہوگی۔ اس کے اثرات مابعد بھی اتنے ہی وسیع اور ہمہ گیر ہوں گے، موجودہ جنگ دنیا کی سب سے بڑی ہولناک اور عالمگیر جنگ ہے۔ اس بنا پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلی جنگ کے مقابلہ میں موجودہ جنگ کے نتائج انسانی اخلاق و معاشرت کے لئے کس درجہ تباہ کن ثابت ہوں گے۔
پہلی جنگ نے اگر عورتوں کی عریانی کو "تا بزانو" پہنچایا تھا۔ تو اب نہیں کہا جا سکتا کہ اگر مذہب اور اخلاق کی بے قدری کا عالم یہی رہا تو یہ عریانی کس حد تک پہنچ کر دم لیگی۔

چنانچہ موجودہ جنگ کی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں مردوں کی تعداد کے کم ہو جانے کی وجہ سے وہاں کی عورتوں میں جو آوارہ مزاجی پیدا ہو گئی ہے اس کی خبریں ابھی سے اخبارات میں آنے لگی ہیں اور ان سے ایک صاحب بصیرت انسان بآسانی قیاس کر سکتا ہے کہ فضا کا یہ تکدر مستقبل میں کس ہولناک طوفان کے آنے کی خبر دے رہا ہے۔ امریکہ کے ایک رسالہ "دی امریکن میگزین" میں ایک یورپین فاضل ڈاکٹر ہنری بومین (Henry Bowman) نے حال میں ہی ایک بیان شائع کرایا ہے جس میں موصوف نے کہا ہے کہ "امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں اب مردوں اور عورتوں کی تعداد ایک اور دس کی نسبت میں رہ گئی ہے اور یہاں عورتوں کی ایک نئی قسم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ عورتیں جوق در جوق سڑکوں پر چلتی پھرتی ہیں اور جہاں کہیں ان کو کسی ایک مرد کی شکل نظر آتی ہے۔ یہ عورتیں اس مرد کو دیکھ کر سیٹی بجاتی ہیں، اس کی طرف رومال اڑاتی ہیں اور طرح طرح کی ترکیبوں سے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہ حالت تو اب ہے جبکہ فوجیں ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔ فوجوں کی واپسی کے بعد ان عورتوں کا کیا حال ہوگا؟ اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔

اسی قسم کے خاص حالات کے پیش نظر اسلام میں تعدد ازدواج کو مباح اور جائز رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے ایک سوسائٹی جنگ کے بعد بد اخلاقی اور بدکاری سے محفوظ رہ سکتی ہے اور اس طرح جنگ میں جتنے مردوں کا نقصان ہوا ہے اس کی مکافات بھی جلد ہی ہو سکتی ہے، ورنہ اگر آپ ان حالات میں بھی ایک مرد کو ایک سے زیادہ عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تو پھر دنیا میں کوئی تدبیر ایسی نہیں ہے جس کے ذریعہ آپ بد اخلاقی، بدچلنی، آوارگی اور ہوس پرستی کے سیلاب کا انسداد کر سکیں۔"

اس سلسلہ میں مسز انی بسنٹ نے اپنے ایک بیان میں خوب کہا تھا وہ کہتی ہیں۔

"مغرب میں اگرچہ رسماً و قانوناً ایک ہی عورت سے شادی کرنے کا رواج ہے لیکن دراصل وہاں بھی عملاً بغیر ذمہ داری کے "تعدد ازدواج" پایا جاتا ہے۔ ایک مرد کئی کئی عورتوں سے ناجائز تعلق رکھتا ہے اور جب اس کا جی بھر جاتا ہے تو وہ جس کو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ اب اس غریب کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ بازاری عورتوں کی طرح گناہ کی زندگی بسر کرے جب ہم ہزاروں بدنصیب عورتوں کو دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بڑے بڑے شہروں کی گلی کوچوں میں رات کے وقت ان کے جھنڈ کے جھنڈ لگے رہتے ہیں تو اب ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم تعدد ازدواج کی وجہ سے اسلام کو برا بھلا کہیں۔ اسلامی احکام کی رو سے جو عورت اپنی سوکنوں کے ساتھ کسی ایک مرد سے وابستہ ہو کر گھر میں باعزت زندگی بسر کرتی ہے اور اپنی گود میں جائز بچہ رکھتی ہے وہ یقیناً یورپ کی ان عورتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور خوش نصیب ہے جو کسی ایک مرد سے وابستہ ہونے کے بجائے مختلف لوگوں کے لئے تفریح کا سامان ہو کر زندگی گذارتی ہیں کوئی ان کا کفیل اور ذمہ دار نہیں ہوتا۔ گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی ہیں اور اگر ان میں سے کسی کے بچہ ہو جاتا ہے تو وہ اسے داغ معصیت کی طرح سوسائٹی سے چھپاتی پھرتی ہے۔ اور ہر شخص انھیں نفرت اور حقارت سے دیکھتا ہے" لے

(Islam in the world by Dr. Zaki Ali p. 28. 29.

(۷)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

بہر حال جس طریقہ سے بھی دیکھا جائے مشاہدہ اور تجربہ کی راہ سے ہو یا قرآن وحدیث کی روشنی میں ہو، ہر حال میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کا اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے، بنانے والے نے آدمی کی ساخت ہی ایسی رکھی ہے کہ باہم ان کا مختلف ہوجانا ناگزیر تھا، اس کے ازالہ کا خیال قدرت سے مقابلہ کا خیال ہے۔ البتہ اس قسم کے جبلی صفات کے مفاسد کے روکنے کی کارگر تدبیر ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ازالہ نہیں بلکہ امالہ کرکے بجائے نقصان کے ان سے نفع اٹھالیا جائے اور اسلام نے یہی کیا بھی ہے، اس نے دین کے ایک حصہ کو تو شیوعِ عام اور استفاضہ کی راہ سے لوگوں میں اس طرح پھیلا دیا کہ خود شریعت کے العیاذ باللہ غلط یا صحیح ہونے کا احتمال تو ان قلوب میں پیدا ہو سکتا ہے جو اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہیں لائے ہیں۔

لیکن یہ بات کہ جس حصہ کو یہ کیفیت عطا کی گئی ہے وہ اسی دین کے اجزاء ہیں جس کی تبلیغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے، مثلاً خود قرآن کا جو چیزیں اسلام کی اسی راہ سے پہنچی ہیں جس راہ سے قرآن پہنچا ہے ان کا جو حال ہے، قرآن میں اسی کا نام "البینات" رکھا گیا ہے، یعنی ان کا دین کے عناصر و اجزاء میں ہونا ایک ایسی کھلی بین حقیقت ہے جس کا انکار عقل و فطرت کے حدود سے خارج ہے، ان ہی "البینات" پر متفق و متحد کرکے مسلمانوں کے اختلافی پہلو کا امالہ ان امور کی طرف کر دیا گیا، جن کی حیثیت دین میں "البینات" کی نہیں ہے

یعنی "البینات" میں متفق و متحد ہو کر اگر غیر بیناتی مسائل میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے تو اس اختلاف کو ایسا اختلاف نہیں قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک ٹولی کا دین دوسری ٹولی کے دین سے یا ایک فرقہ کا مذہب دوسرے فرقہ کے مذہب سے جدا ہو جاتا ہے، اور یہی وہ بات تھی کہ ابتدا ہی سے یعنی عہد صحابہ ہی سے مسلمان ان امور میں مختلف ہوتے رہے، لیکن نہ اس اختلاف کو انھوں نے چنداں اہمیت دی، اور یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ محض اس اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کے کسی گروہ کو دوسرے طبقہ سے جدا کیا گیا ہو، بلکہ اس اختلاف میں افادے کے نت نئے پہلو مختلف زمانوں میں مسلمان جو پیدا کرتے رہے، ان کی ایک حد تک تفصیل سنائی جا چکی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مختلف اقالیم و امصار میں جن بزرگوں کے جن خداداد کمالات کا ظہور اسلام کے مختلف شعبوں میں ہوتا رہا، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو بروئے کار لانے میں ان اختلافات کا بھی حصہ ہے، ان ہی کی تحقیق و تفتیش تنقید و تنقیح اور ان میں تطبیق و توفیق و ترجیح کی کوششوں ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی امامت و پیشوائی کے جلیل منصبوں پر وہ سرفراز ہوئے اور اپنی محنتوں، جانکاہیوں کا جو صلہ اس دن ان کے سامنے جب آئے گا جس دن ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا ہو گا، آج اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، سورۂ ہود کی مذکورہ بالا آیت کے متعلق بعض ارباب نظر کی نظر جو یہاں پہنچی ہے جسے قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

اوالیہ والی الرحمۃ　　یعنی ذالک کے اسم اشارہ کا اشارہ اختلاف کی
(ج ا ص ۴۸۹ مطبوعہ ہند)　　طرف بھی ہو، اور رحمت کی طرف بھی ہو۔

توجہاں تک واقعہ ہے اس سے تو اسی کی تائید ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ میلانات و رجحانات کے فطری اختلاف کے رخ کو "البینات" سے ہٹا کر جن لوگوں نے دین کے "غیر بیناتی" حصے کی تحقیق و ریسرچ کی طرف پھیر دیا، ظاہر ہے کہ اپنے اجتہاد و کوشش کے صلہ سے وہ محروم نہیں ہو سکتے اور محروم کیا معنی خدا کی رحمتوں اور کرامتوں کے وہ مستحق نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا،

پس کھلی ہوئی بات ہے کہ یہی اختلاف ان کے حق میں ذریعہ رحمت بن گیا، اور یوں ذٰلک۔ کے اسم اشارہ کا اشارہ "اختلاف اور رحمت" دونوں طرف صحیح ہو جاتا ہے۔

بلکہ کل ان کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا ثبوت آج ہی اس سے مل رہا ہے، کہ کروڑہا کروڑ مسلمانوں کے قلوب نسلاً بعد نسل ان بزرگوں کے تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہیں اتنے لبریز کہ "رحمۃ اللہ علیہم"، "رضی اللہ تعالیٰ عنہم" کی دعاؤں کے بغیر ان کا تذکرہ نہیں کر سکتے، آخر کوئی بات ہی تو ہے کہ مکتب خانوں کے میاں جی بیچارے بھی تو بچوں کو قرآن ہی پڑھاتے ہیں، خدا کی باتیں ہی سکھاتے ہیں، مگر اعزاز و احترام کا وہ حصہ ان کو کیوں نہیں دیا جاتا جو صرف ان بزرگوں کے ساتھ مخصوص ہے جنھوں نے خلافیاتی مسائل کے سلجھانے کی کوششوں میں اپنی جانیں لڑا دی ہیں۔

یہی وہ وجوہ و اسباب ہیں جن کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ انسانی افراد کے باہمی اختلافات کے ازالہ کی کوشش دنیا کے جن مکاتبِ خیال میں چاہا جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق دین سے یا دنیا سے یا زندگی کے کسی شعبہ سے ہو یہ ایک لاحاصل کوشش اور بے معنی سعی ہے بلکہ یہ نصب العین خود اس نصب العین کی غلط اور باطل ہونے کی دلیل ہے۔[1]

ضرورت جو کچھ بھی ہے وہ ازالہ کی نہیں، بلکہ صرف امالہ کی ہے اور یہی تدبیر اسلام نے اختیار کی، مسلمان ابتدا سے اسی پر عمل پیرا رہے۔

---

[1] مجھے تو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ انسانوں میں کوئی اونچا کیوں ہو اور نیچا کیوں ہو، اس سوال کے اٹھانے والے اس کے سوا اور کیا چاہتے ہیں کہ دنیا جو کچھ مان رہی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی ماننے لگے، ان کو اپنا امام بنالے، اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ کیا خود یہ نظارہ اسی کا نہیں ہے کہ سب کو نیچا کر کے ایک ان میں اونچا بن رہا ہے یا بننا چاہتا ہے۔ آخر جاہ کی راہوں میں یہ نشیب و فراز بہر حال جب باقی ہی رہے گا تو بالفرض اگر مال کی حد تک ہمواری پیدا کرنے میں کامیابی بھی ہو جائے تو اس کا کیا حاصل، ضرورت کی حد تک مال کی طلب کا پیمانہ ہی کیا ہے۔ ضرورت تو اس کی بھی پوری ہوتی ہے جو غریب مہینہ میں دس پانچ سے زیادہ کما نہیں سکتا۔ معاشی تگ و دو کی ساری گرم بازاری کے پیچھے غور کرنے والے جانتے ہیں کہ زیادہ تر آبرو جاہ ہی کا جذبہ چھپا ہوا ہے، اور اگر جاہ طلبی کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا تو دنیا ہیں ہو یا آخرت میں افراد کے فطری کمالات کے ظہور کا ذریعہ ہی کیا رہ جائے گا۔

لیکن اچانک مسلمانوں کو کچھ دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ "مذہبی اختلاف" جس میں گوناگوں مصالح و منافع کی ضمانتیں پوشیدہ تھیں، ایک ایسا لفظ بن گیا ہے کہ زبان سے ادھر نکلا نہیں اور پیشانیاں چڑھ گئیں، حقارت و نفرت کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شدید ترین جرم ہے جس کے مسلمان مرتکب ہیں، ان پر تو زبانیں بہ ظاہر نہیں کھلتیں، جن پر زبان کھولنے کا نتیجہ اگر اپنے خون سے نہیں تو کم از کم اپنی عزت و آبرو سے کھیلنا بن جاتا ہے، لیکن لعنت کی کوئی قسم اور ملامت کا کوئی طریقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا جو عام مسلمانوں پر نہ برسائے جاتے ہوں، وہ دھتکارے جاتے ہیں، دردرائے جاتے ہیں، اسی قصور میں کہ مذہبی "اختلافات" کے قصوں کے مٹانے میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہو سکے، ذمہ داری اسی کی تھوپی جاتی ہے مذہبی پیشواؤں کے سر اور دھجیاں اس کے بعد بکھیری جاتی ہیں ان غریبوں کے جبہ و دستار کی۔

یہ حال ہے جس میں کسی ایک ملک ہی کے مسلمان مبتلا نہیں ہیں بلکہ تقریباً آج جہاں کہیں ایسے مقامات میں مسلمان آباد ہیں جہاں کسی نہ کسی بھیس میں مغربی تہذیب تمدن کے تھپیڑے پہنچ سکے ہیں، سب کی یہی کیفیت ہے؟

وقت آگیا ہے کہ کچھ اس کے متعلق بھی عرض ہی کر دیا جائے، طوالت تو ہو ہی چکی، لیکن جس لئے طوالت کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ڈر ہے اگر یوں ہی خاموشی اختیار کی گئی، جیسے اب تک کی جا رہی ہے تو اس کا طول و عرض حد سے زیادہ نہ متجاوز ہو جائے، میں نے کسی موقعہ پر اشارہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے حال کو ان کے ماضی سے بے تعلق کر کے جب تک توڑا نہیں گیا تھا اس وقت تک ان "مذہبی اختلافات" کی ضرر رسانی کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ بالعکس اس کے ہمیشہ ہر دور میں بزرگوں نے اس کے افادی پہلوؤں ہی کو مسلمانوں پر واضح کرنے کی کوشش کی۔ دراصل ان اختلافات کی تاریخ کا یہی وہ ماضی تھا جس سے بتدریج مسلمانوں کو جدا کیا جا رہا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اپنے ماضی سے توڑنے پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے جا رہے ہیں یا قصداً کئے جا رہے ہیں جن کی بدولت اپنوں سے ٹوٹ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمان اپنے حال کو

ن قوموں کے ماضی سے جوڑ رہے ہیں جن کا ماضی مسلمانوں کے ماضی سے مختلف بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بالکلیہ مختلف ہے، لیکن مغالطہ یہ ہو رہا ہے' یا دیا جا رہا ہے کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں. پس انسانوں کی تاریخ ماضی کا مطالعہ انسانوں ہی کے حال کی تصحیح کے لئے اگر کیا جائے و اس کے سوا فطری قاعدہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

لیکن میں اس کو مغالطہ اور بد ترین قسم کا مغالطہ یقین کرتا ہوں، تفصیل کے لئے تو شاید یک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا خلاصہ شاید یہ ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مذہبی اختلافات کے باب میں مسلمانوں کی اگلی نسلوں کے جو احساسات ہے، غالباً اس کا ایک معتدبہ اور کافی حصہ آپ سُن چکے، اب ذرا آئیے، جن قوموں کی ماضی کا اپنے ی جیسے انسان باور کرا کے اپنے حال کی تصحیح کے لئے ہم سے مطالعہ کرایا جا رہا ہے، یا ہم آج ان کا طالعہ کر رہے ہیں، واقعۃً ان کے ماضی کی صحیح اور سچی داستان مذہبی اختلافات کے مسئلہ میں کیا ہے یں صرف اشارے کروں گا. کیونکہ واقعات سے کم و بیش لوگ آگاہ ہیں، البتہ ان کے متعلق جس قطۂ نظر کو اس تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں، عموماً اس سے غفلت برتی جاتی ہے س لئے میرا یہ بیان تفصیل کی نہیں صرف تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ مذہب کے متعلق آج یورپ کے احساسات کچھ ہی ہوں لیکن زیادہ دن نہیں گذرے ہیں، صدی دو صدی سے بھی شاید کم ہی مدت کہ یورپ ایک مذہبی اور غالی قسم کا مذہبی ملک تھا. مختلف عوامل و موثرات، اسباب و وجوہ کے تحت آج سو سینکڑوں سال بلکہ ہزار ڈیڑھ ہزار سال بھی اگر کہا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا کہ مذہب نے اس ملک میں اپنا ایک عجیب و غریب نظام قائم کر لیا تھا، وہی نظام جس کی عام تعبیر لفظ "کلیسا" سے کی جاتی ہے۔

یہ کلیسا اور اس کا قائم کیا ہوا نظام کیا تھا، جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ ہزار ڈیڑھ ہزار سال کی ایخ ہے. لیکن اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ یہ ایک بے پناہ طاقت اور قوت تھی، جو مذہب کے نام

مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، غریب ہو یا امیر، حتی کہ چھوٹے چھوٹے راجواڑوں سے لیکر بڑے بڑے صاحبانِ تخت و تاج باشوکت و جبروت سلاطین بھی طاقت و قوت کے اس آہنی ... میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ کلیسا کی مرضی کے خلاف ہل بھی نہیں سکتے تھے، یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے جس دور کا نام یورپ کی تاریخ میں "قرونِ متوسط" رکھا گیا ہے، اور آج ان ہی قرونِ متوسط کو ریسرچ کے زور سے مسلمانوں کی تاریخ میں بھی ڈھونڈھا جارہا ہے۔ چاہا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے گذرے ہوئے قرون میں بھی کچھ ایسے قرون پیدا کئے جائیں جن کا نام بھی وہی یورپ کے "قرونِ متوسط" کا نام ہو، اور ثابت کردیا جائے کہ ان سے کام بھی وہی تھے جو یورپ سے "قرونِ متوسط" میں انجام دیئے گئے۔

خیر یہ تو الگ بات ہے کہ مسلمانوں پر بھی کچھ ایسے قرون گذرے ہیں یا نہیں، جنھیں ... میں لفظاً و معناً یورپ کے قرون متوسطہ کا ہمدوش و ہم زلف قرار دیا جاسکتا ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ اپنے قرون متوسط کے متعلق کلیسا کی بے پناہ قوتوں اور طاقتوں، عنان گیر اقتدارات و اختیارات کی جو داستان بیان کرتا ہے یقیناً وہ وہی ہے جو وہ بیان کرتا ہے۔

کہہ چکا ہوں کہ تفصیلات کا نہ تو یہاں موقعہ ہے اور نہ ان کی ضرورت ہے۔ صرف موٹی موٹی چند مشہور چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ "...sidoran Decretalis" نام کا وہ مجموعہ ہے جسے آج یورپ اپنی تحقیقاتی روشنی میں خواہ کچھ ہی قرار دیتا ہو لیکن جب ۸۴۰ء میں رومۃ الکبریٰ سے وہ شائع کیا گیا اور تقریباً ہزار بارہ سو سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ تک مقدس صحیفہ کی حیثیت سے کلیسا کے خزانہ میں وہ محفوظ رہا، سب جانتے ہیں کہ اس کی نوعیت ان لاریبی وثائق و مستندات کی تھی جن کے کسی ایک فقرہ پر شک کا اظہار ارتداد، اور دینِ مسیحی سے خارج ہونے کے لئے کافی تھا۔ اے۔ جی۔ گرانٹ صاحب اپنی کتاب تاریخ یورپ میں ان مندرجات کا جو اس مجموعہ میں تھے یہ خلاصہ بیان کرتے ہیں:

"یورپ کو کلیسا کے معاملات میں بلا شرکت غیرے کامل اختیارات حاصل ہیں، اور مغربی ممالک (یورپ) پر حکمرانی کا حق بھی اسی کو حاصل ہے۔" ۱؎

اس مجموعہ کے نہ براہِ راست دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے نہ ان کے تراجم تک میری (رسا)ئی ہے لیکن جن تحریروں کے کسی مجموعہ کا یہ خلاصہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ شاہی وثیقہ ہے جو سب سے پہلے عیسائی مذہب کے (قبو)ل کرنے والے بادشاہ "قسطنطین" کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کلیسا کے نام تعمیل کیا گیا۔ گرانٹ صا(حب) نے جس کا نام "عطیہ کانس ٹن ٹائن" بتایا ہے اور وہی راوی ہیں کہ اس عجیب وغریب نوشتہ میں یہ بیان (کیا) گیا ہے۔

"شہنشاہ کانس ٹن ٹائن وفادار، رحمدل، قادر و نیک منش، شاہ اقوام المانی و سرمانی و جرمانی، و برطانی، و ہونی، پارسا، و خوش نصیب فاتح و غازی و ذی شان، مرض جذام میں مبتلا تھا اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہلائے بغیر اسے صحت نہیں ہو سکتی۔ مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اسے صحت حاصل ہوئی اور صحت یابی کے شکریے میں اس نے حکم دیا کہ کلیسا روما کا قسیس اعلیٰ تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا، اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات واقع روما، اور خود شہر روما، اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب (یورپ) پر قابض رہیگا۔"

اور آخر میں لکھا ہوا تھا کہ

"ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے۔" ۲؎

جیسا کہ گرانٹ صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ پہلا مجموعہ بھی

"زمانہ حال کے تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ یہ سب تحریریں جعلی تھیں۔" ۳؎

۱؎ تاریخ یورپ گرانٹ، مترجمہ دار الترجمہ سرکار عالی ص ۳۵۱ ۔ ۲؎ ایضاً ص ۲۵۲ ۔ ۳؎ ایضاً ص ۲۵۱

اسی طرح "کانس ٹن ٹائن کا عطیہ" والے وثیقہ شاہی کے متعلق بھی وہی لکھتے ہیں کہ

"پندرہویں صدی تک جب تک کہ یورپ میں پھر علوم و فنون کا دور دورہ نہ ہوا، کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے یا اس کی صحت میں شک لائے" (۲۵۲)

اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں پر اقتدار کے پنجوں کو مضبوط کرنے کے لئے یہ جعلی تحریریں وقتاً فوقتاً بنائی جاتی تھیں، ان بھولے بھالے مسکینوں پر ان کا کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تدریج پوپوں کی قوت اپنی جڑیں جماتی چلی جاتی تھی۔ تا ایں کہ گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گری گوری ہفتم کے زمانہ میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس عہد کی ایک تحریر کا ترجمہ گرانٹ صاحب نے ان الفاظ میں دیا ہے:۔

"پاپائے روما کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں، اسی کو بشپوں کے عزل و نصب کا اختیار ہے، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسہ روما کو نہ کبھی دھوکہ ہوا ہے اور نہ ہوگا، پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے۔ انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی ہے، اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی ہے پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے۔" (ص ۲۶۸)

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ اسی قسم کی تحریروں کا اثر تھا کہ پوپ

"کلیسہ کو دنیا کی اعلیٰ ترین قوت خیال کرتے جسے اقتدار ذات باری تعالیٰ سے براہِ راست عطا ہوا تھا اور جس کے بادشاہ اور شاہزادے دست نگر تھے۔" (ص ۲۶۸)

نہ صرف پوپ ہی کا وجود ہر قسم کی حرف گیریوں سے آزاد تھا بلکہ جن بشپوں اور پادریوں کو خدا کے رحم نے پیدا کیا تھا، ان کے متعلق بھی پوپ کا دعویٰ تھا کہ

"سلطنت کی عدالتوں کو پادریوں کے مقدمات سماعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے" (ص ۳۳۶)

گرانٹ صاحب نے ۱۰۷۵ء میں گری گوری ہفتم کی اس پاپائی گشتی کا ترجمہ ایک موقعہ پر یہ درج کیا ہے۔

"دنیاوی حکام خواہ شہنشاہ ہوں یا بادشاہ وغیرہ وہ ہرگز مجاز نہیں ہیں کہ عہدہ داران کلیسا کا تقرر عمل میں لائیں اور عصا اور انگشتری سے اس کو سرفراز کریں۔"

آگے لکھا:۔

"اگر کوئی شہنشاہ یا بادشاہ یا ڈیوک وغیرہ مذہبی خدمات کے تقررات میں دخل دینے کی جرأت کرے گا تو وہ کافر و مرتد ہے۔" (ص ۲۰۰)

کفر و ارتداد کے اس پاپائی فتوی کے بعد پادریوں کے اقتدار کا جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ یورپ تو یورپ تمام دنیا کے مسیحی ممالک کے لئے ان کی تعمیل واجب و فرض سمجھی جاتی تھی، گرانٹ نے شاہ فریڈرک کے حالات میں ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ پوپ نے شہنشاہ کو کلیسا سے خارج کردیا تھا اور یہ کم سے کم سزا تھی جو کسی بادشاہ کو پاپائی آستانہ سے بہ نظر ترحمانہ دی جاتی تھی، اثر صرف اس قدر تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں جو صلیبی لڑائیاں یورپ پوپ کی فتویٰ نمائیوں کی روشنی میں لڑ رہا تھا، اس جنگ میں "کلیسا بدر" بادشاہوں کو شرکت کا استحقاق باقی نہ رہتا تھا۔ بہرحال فریڈرک کو بھی سزا دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا، جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہے۔

"جب وہ (فریڈرک) وہاں (یروشلم) پہنچا تو اسے کوئی پادری ایسا نہ ملا، جو تاج اس کے سر پر رکھتا (یہ ایک رسم تھی جو بادشاہوں کے لئے پادری ادا کرتے تھے) کیونکہ وہ کلیسا سے خارج ہو چکا تھا اس لئے اس نے قربانگاہ سے تاج اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھ لیا۔" (ص ۲۹۸)

یہ چند سرسری اور عام باتیں ہیں، جن سے یورپ کی تاریخ کا شاید کوئی معمولی طالب علم بھی ناواقف نہ ہوگا، آپ ان حقائق کو اپنے سامنے رکھئے جن کا حاصل صرف یہ ہے کہ کلیسائی نظام جو درحقیقت ایک انتہائی قسم کا آہنی سیاسی نظام تھا، لیکن اس کی جڑوں میں مذہب کے نام سے پانی پہنچایا جاتا تھا، بات بات پر خدا اور خدا کے بیٹے اور خدا کے بیٹے کے حواری پطرس کے ناموں سے

وہ سب کچھ کیا جاتا تھا جس کی نظیر شاید دنیا کے جابرہ وعمالقہ یا نمرودوں اور فرعونوں کی زندگیوں میں بھی بمشکل ہی مل سکتی ہے، مگر ان کے کسی قول وفعل پر حرف گیری کفر وارتداد اور ابدی جہنمی ہونے کے مرادف تھا، حکومت ان پر مقدمہ نہیں چلا سکتی تھی۔

ایک طویل قصہ کے واقعات سے متاثر ہو کر ہنری چہارم نے پوپ کو اس خط کے لکھنے کی ایک دفعہ جرأت کی بجنسہ جسے گرانٹ نے نقل کیا ہے۔ شروع میں تھا۔

"از شاہ ہنری، جو غاصب نہیں بلکہ بفضل الٰہی حکمراں ہے، بنام ہلڈی برانڈ (نام پوپ)
جو بظاہر پوپ ہے، لیکن در اصل ایک بدکردار راہب ہے۔ . . . .

گرانٹ نے آگے نقاطِ ایمائی دے کر غالباً ان بدکرداریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا ذکر ہنری نے اپنے مکتوب میں کیا ہوگا، پوپ نے جو اس کا جواب دیا تھا اس میں پہلے تو پطرس حواری کی روح کو خطاب کر کے اپنی مظلومیت پر رو دیا ہے اور آخر میں تھا۔

"میں تمام مسیحیوں کو ہنری چہارم کی فرمانبرداری سے بری کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص اس کو بادشاہ تسلیم نہ کرے، چونکہ اس نے عیسائی ہو کر فرمانبرداری سے منہ موڑا ہے اور خدا سے منحرف ہوا ہے لہذا میں اسے ملعون قرار دیتا ہوں۔" (ص ۷۶)

آج ظاہر ہے کہ یہ بے جان الفاظ ہیں، لیکن جن دنوں پوپ سے انحراف خدا سے انحراف کے ہم معنی بنا ہوا تھا اس وقت اس کا کیا اثر پڑتا ہوگا، پھر کلیسا کے اس نظام سے پوپ اور پوپ کے ماتحت بشپوں اور پادریوں نے جس قسم کے مطلق العنانہ اقتدارات حاصل کئے تھے، ان اقتدارات سے جو نفع وہ مسلسل سرزمین یورپ میں تقریباً ایک ہزار سال تک اٹھاتے رہے، آج ان سے کون ناواقف ہے "اعتراف جرم" کی چلتی ہوئی تدبیر نے عوام کی گردنوں کو ان مذہبی نمائندوں کے فولادی پنجوں میں جس طریقے سے دبا یا تھا، کہ پادریوں کے جرائم سے کوئی واقف نہیں، لیکن ہر خونی، چور، ڈاکو، بٹ مار، اپنی زندگی کا سارا کچا چٹھا ان کے آگے اگل آتا تھا، جنت کے ان ٹھیکیداروں نے عوام کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہوئے جن جن

طریقوں سے ان کو لوٹا کھسوٹا ہے، کیا ان کی تفصیل کی حاجت ہے؟ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی لوتھر کے متعلق تو کہتے ہیں کہ شروع میں کلیسا کی مخالفت پر اس کو جس چیز نے آمادہ کیا وہ ان پادریوں ہی کا پرانا دستور "جنت فروشی" کا تھا۔ گرانٹ نے اس قصہ کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تہتر نامی پادری، لوتھر کے زمانے میں جرمنی آیا، ایک گرجے کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرتا تھا، لیکن کس طریقہ سے،

"اس نے لوگوں کے سامنے معافی کے پروانوں کی فروخت شروع کی۔۔۔۔۔۔"

اور یہ کہ

"اگر وہ چندہ دیں گے تو اس کے معاوضہ میں خود اُن کے اعزہ و احباب دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں گے" (ص ۴۹۷)

اور یہ کوئی استثنائی مثال نہ تھی، کلیسا، جس کا نظام پورے ملک پر محیط اور حاوی تھا چپہ چپہ پر گرجوں اور خانقاہوں میں کلیسا کے ملازم پادری اور بشپ بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کرتے رہتے تھے کہ نزع کی کیفیت کس ڈیوک یا نائٹ پر ہمارے علاقہ میں طاری ہوتی ہے، لکھا ہے کہ پادری کا اس وقت مرنے والے کے سرہانے پر موجود رہنا ضروری تھا، مرنے والے کا اُدھر دم نکل رہا ہے اور پادری صاحب مراقبہ سے سر اٹھا کر سیاہ سیاہ چہروں، نیلی نیلی آتشیں آنکھوں والے فرشتوں کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں، جو اس گناہ گار کی روح قبض کرنے کے لئے آدھمکے ہیں نجات کی راہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ کلیسا کے نام کچھ وقف کیا جائے، خیرات نکالی جائے، کس کا جگر اتنا سخت ہوگا جو ایسے وقت میں بھی نہ پگھل جاتا ہوگا، علاقے کے علاقے ان تدبیروں سے کلیسا کی ملک میں مسلسل منتقل ہوتے جاتے تھے، خدا کی رحمت کی باضابطہ تجارت ہوتی تھی۔

اور یہ تو اس وقت کے قصے ہیں جب تک کلیسا کے خلاف لب ہلانے، پیشانی پر بل ڈالنے کی ہمت کسی میں نہ تھی، لیکن سولھویں صدی کی ابتدا میں جب لوتھر کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور

قریب تک اسی غریب مذہب کے نام سے خون کی جو ندیاں کلیسا کی طرف سے بہائی گئیں، اس وقت سے جب سولہویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۵۷۲ء میں جو قتل عام پیرس کی گلیوں میں رومن کیتھولک (یعنی کلیسا کے علمبرداروں) کی طرف سے پروٹسٹنٹ فرقہ کا کیا گیا، نو دن تک قتل کا یہ بازار گرم رہا، پچیس سے ستر ہزار تک مختلف اندازہ کرنے والوں نے مقتولین کی تعداد بتائی ہے، حاملہ عورتوں کے بچوں کو پیٹ پھاڑ کر زندہ نکالا جاتا تھا اور کتوں کے آگے ان ہی معصوم بچوں کو ڈال دیا جاتا تھا۔ دریائے سین کا پانی سرخ ہو گیا تھا، اسی کا نام "بارتھلمو کا ہنگامہ" ہے[1]

اور ان قصوں کو میں کہاں تک نقل کروں، کلیسا کے در و دیوار، اس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر جس سے اس کی تعمیر ہوئی تھی "لمن الملك اليوم" کی آواز نکل نکل کر یورپ کے گاؤں گاؤں کھیڑے کھیڑے میں گونجتی رہتی تھی۔ گرانٹ صاحب نے ایک اور موقعہ پر ایک پاپائی دعویٰ ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"خدا نے ہمیں تمام بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے، تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کر دیں"

یہ پاپائی جلال کا اظہار تھا، جو خدا کے نام سے کیا جاتا تھا، اور اس تخریبی اقتدار مطلق کے بعد تعمیری اختیار کی تعبیر ان الفاظ میں کی جاتی تھی۔

"یا اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں، اور نئی عمارت بنائیں"

گرانٹ صاحب نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ کلیسا کا عام ادعا یہ تھا۔

"اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے لیکن اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کا انصاف کرنیوالا خدا ہی ہے (ص ۲۳۲)

(۱) گرانٹ ہی نے لکھا ہے کہ ان پوپوں کے پاس گذشتہ بالا وثائق اور دعاوی کے علاوہ چار چیزیں اور تھیں سینٹ پیٹر (پطرس حواری) کی عبا (۲) قسطنطین کا تاج (۳) جنت کی کنجی،

[1] تفصیلات کے لئے یورپ کی عام تاریخیں اور علامہ فرید وجدی کی کنز العلوم واللغۃ ...

(۴) صلیب، کسی قسم کا کوئی شخص ہو، ان چیزوں کے پہن لینے کے بعد وہ دنیا کی تمام قوتوں کی دسترس سے باہر ہو جاتا تھا ایک پوپ جس کا نام "بانی فیس" تھا اور مشہور شاعر "ڈانٹے" کا معاصر تھا اس پر بیسیوں قسم کے الزامات تھے، خود شاعر ڈانٹے بھی اس کے شدید مخالفوں میں تھا لیکن مخالفوں کے محاصرہ میں اپنے آپ کو پاکر اس نے بقول گرانٹ،

"سینٹ پیٹر کی عبا زیب بدن کی، قسطنطین کا تاج سر پر رکھا، اور بہشت کی کنجیاں اور صلیب اپنے ہاتھ میں لیکر تخت پاپائی پر جلوہ افروز ہوا" (ص ۲۳۷)

لیکن اس پر بھی بعض مخالفوں نے سخت وسست سنایا، بلکہ کہتے ہیں کہ اس بڈھے پوپ کے منہ پر زرہ پوش کولونا نے گھونسہ بھی مارا، حالانکہ وہ اپنے منصب کا پورا لباس پہنے ہوئے تھا۔ گرانٹ کا بیان ہے کہ یہ ایسا واقعہ تھا کہ

"ابنائے زمانہ کو اس (مجرم پوپ) سے ہمدردی پیدا ہوگئی، وہ ان قصوں اور روایتوں کو بھول گئے جو اس کے افعال وخصائل کے متعلق مشہور تھیں، حتی کہ شاعر دانتے جو اس کا مخالف تھا مگر اس نے بھی ایک عظیم الشان نظم میں اس اندوہناک واقعہ کا ذکر نہایت تاسف سے کیا ہے، اس کا قول ہے "مسیح پھر حواریوں کے درمیان مصلوب کیا گیا، سرکہ اور زہر اس کے لبوں سے پھر لگایا گیا" (ص ۲۳۷)

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پوپ تو خیر پوپ ہی تھے ان کے اعمال وافعال، خصائل وعادات کی تفصیلات تو کتابوں میں پڑھئے، کلیسا کے دائرہ میں جو لوگ راہب بن کر زندگی گذارتے تھے، گرانٹ نے ان کی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بعض راہب تو پورے پورے ڈاکو بن گئے" (ص ۲۳۰)

اور یہ تو ابتداء میں ہوا، بعد کو دین اور دین کی نصرت وتائید کے نام سے صدیوں تک مذہبی اختلافات کے اس قصہ میں جو کچھ کیا گیا ہے "محکمہ تفتیش" نے جو فرائض انجام دیئے ہیں، ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ والوں کو موقعہ پانے کے بعد جن ہوش ربا، روح فرسا تدبیروں سے قتل

کیا ہے یا زندہ جلایا ہے اور مختلف ترکیبوں سے مارا ہے، حساب لگانے والے کہتے ہیں کہ ان کی تعداد دس لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور میں کہاں تک تفصیل کروں کہ اس راہ میں کیا کیا نہ کیا گیا۔ مذہب اور مذہبی نمائندوں کے متعلق کیا بتایا جائے کہ غریب یورپ کو کن کن تجربات سے گذرنا پڑا ہے؟ ہم سُن رہے ہیں اور ہمارا خون کھول رہا ہے، صرف اِس لئے کھول رہا ہے کہ کچھ بھی ہو، آخر وہ بیچارے بھی تو انسان ہی تھے، لیکن یورپ کو تو بھگتنا پڑا ہے، سال دو سال نہیں، صدی دو صدی بھی نہیں ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک یورپ کے مذہب نے ان ہی آتشیں تماشوں کو اس کے آگے مسلسل پیش کیا ہے اور یہ ہے یورپ کے مذہب اور مذہبی اختلافات کے ماضی کی تاریخ جس کا نام اس نے "قرونِ متوسط" رکھا ہے۔

جنھوں نے نہیں سوچا ہے، اگر واقعی حقائق و واقعات کی روشنی میں وہ کچھ سوچنا چاہتے ہیں، خدارا اب تو انھیں سوچنا چاہئے کہ اسلام کے مذہبی اختلاف کی تاریخ کو یورپ کے مذہبی اختلافات کی تاریخ پر منطبق کر کے آئے دن جن نت نئے نتائج سے سیدھے سادے ناواقف مسلمانوں میں وہ حیرانی و تشویش پیدا کر رہے ہیں، دین کی نہ سہی علم ہی کی کیا کوئی سچی راستبازانہ خدمت انجام دے رہے ہیں؟

یہ صحیح ہے کہ ان نتائج کے پیدا کرنے میں ان مخفی کنایوں اور معصومانہ اشاروں کو بھی گونہ دخل ہے، جن کا ذکر اسلامی تاریخ کے متعلق یورپ کے مورخین کسی نہ کسی وجہ سے ایک حد تک اپنا خوش گوار فرض یا لذیذ مشغلہ قرار دئے ہوئے ہیں، ان کا تو شاید التزام ہے کہ جن جن آلائشوں سے ان کی تاریخ کا دامن ملوث اور آلودہ ہے واقعہ ہو یا نہ ہو، لیکن کسی نہ کسی طرح ان ہی داغوں اور ان ہی دھبوں کو اسلام کے دامن پر بھی نمایاں کر کے دکھا دیا جائے۔

غیر مذہب والوں کو بہ جبر عیسائی بنانا، قرونِ متوسطہ کی ایک عام خصوصیت ہے خود مسلمانوں کے ساتھ ملکہ ازابیلا اور اس کے شوہر فرڈی نینڈ نے اسپین میں جو سلوک کیا، آج اس سے کون ناواقف ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ جس ملک میں مسلمانوں کی حکومت چھ سو سال تک رہی

آج وہاں اسلام کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہے سسلی ہو یا مالٹا یا وہ سارے جزائر جو مسلمانوں سے چھینے گئے. تقریباً سب کا یہی حال ہے. گرانٹ صاحب جنھیں اپنے آباؤ اجداد کی عیب پوشیوں میں کچھ کم مہارت حاصل نہیں. ایک موقعہ پر جرمنی کی ایک قوم فرینک نامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں.

"انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ وہاں کے باشندوں کو عیسائی ہونے پر مجبور کیا"

اسی پر اور اضافہ کرتے ہیں.

"شارلی میں (جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا حریف مقابل تھا) بھی اپنے شکست خوردہ حریف کو ہمیشہ عیسائی ہونے پر مجبور کیا کرتا تھا، بغیر اس کے ان کے اظہار اطاعت کو قبول نہ کرتا" (ص ۳۵۱)

لیکن پھیلا دیا گیا کہ اسلام ہی دنیا میں بہ جبر پھیلا، حالانکہ مشکل ہی سے اس کا کوئی ایسا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے جو قابل تسلیم ہو.

مخالف قوموں پر فتح پانے کے بعد قرونِ متوسطہ کے عیسائیوں کا عام دستور تھا کہ ان کے کتابخانوں کو جلا دیتے تھے، عبادت گاہوں کو ڈھا دیتے تھے. گرانٹ صاحب نے ایک موقعہ پر لکھا ہے حالانکہ اس قسم کے واقعات کے تذکرہ کرنے میں وہ بہت زیادہ محتاط ہیں. تاہم لکھتے ہیں.

"مسیحیت کی فتح کے ساتھ ہی افسوس ہے کہ فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو اس بے دردی سے تباہ کیا گیا کہ صفحاتِ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں.

"شعراء و فلسفیوں اور مورخوں کی ان تصانیف کے ساتھ بھی یہی برتاؤ روا رکھا گیا" (ص ۲۱۰)

اور یورپ کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہم نے جو کچھ کیا ہے، تم بھی اسی جرم کے مجرم ہو، صرف اس کو دکھانے کے لئے کون نہیں جانتا کہ سکندریہ کے کتب خانہ کا لطیفہ تراشا گیا، جو بات نہ عقلاً درست ہو سکتی تھی اور نہ نقلاً، کوشش کی گئی کہ اسی کو صحیح اور درست

ثابت کر کے دکھایا جائے، خیر یہ تو چند خارج از بحث مثالیں تھیں، قصہ مذہبی اختلافات اور ان کے نتائج کا ہو رہا تھا، یورپ کی پوری تاریخ چونکہ ان ہی ہنگاموں کا ایک خونیں مرقع ہے کلیسا اور کلیسا کے وابستوں نے جو کچھ کیا، یہ تو پچھلے زمانہ کی تازہ تاریخ ہے، مشکل سے ان واقعات پر صدی دو صدی سے زیادہ مدت گذری ہے لیکن سچ پوچھئے تو عیسائیوں کا یہ حال ابتدا ہی سے تھا، سنہ ۳۶۰ء کے واقعات کے سلسلہ میں گرانٹ صاحب نے لکھا ہے،

"مختلف مسیحی فرقے اس وحشیانہ پن کے ساتھ آپس میں لڑ رہے تھے، کہ صوبہ افریقہ کا ایک بڑا حصہ ویران ہو گیا" (ص ۲۰۶)

بہر حال ہو سکتا ہے کہ اسلام کے مذہبی اختلافات کی تاریخ سے آج جن نتائج کے پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ان میں مغربی مورخین کے اس طرز عمل کو بھی دخل ہو کہ جو تیر ان کے کلیجوں میں چبھے ہوئے ہیں، ان ہی کو نکال نکال کر حسب عادت وہ اسلام کے سینے میں بھونکنا چاہتے ہوں لیکن ان سے ہماری شکایت بے جا ہے، مجھے تو گلہ اپنوں سے ہے، ان سے پوچھتا ہوں کہ اپنے حال کو سمجھنے کے لئے بجائے اپنی آنکھوں کے غیروں سے مانگی ہوئی آنکھوں سے مطالعہ کرنا کہاں تک درست تھا، جن لوگوں کو اب تک اس کی توفیق نہیں ہوئی ہے، کاش میرے پیش کردہ بیانات ہی کے بعد ان میں خود تصوریت کے جذبۂ غیرت میں کچھ جنبش پیدا ہو۔

خیر کچھ بھی ہو اب بتایا جائے کہ مذہب کے لباس میں یورپ نے اپنے قرونِ متوسطہ میں جو کچھ دیکھا، اور جو کچھ مذہبی نمایندوں کی طرف سے اس کو دکھایا گیا ہے مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کے کسی حصہ میں اسے ڈھونڈھا جائے، غریب مسلمانوں نے کب اور کہاں کلیسا کا نظام قائم کیا، پاپائیت مطلقہ کا مقام عام مسلمانوں کے مقابلہ میں یا ان کے سلاطین و امرا کے مقابلہ میں کن کن لوگوں کو کس کس قرن میں کہاں کہاں حاصل ہوا تھا، نہ جاننے والوں کو جاننے کی قدرتی ضرورت نے عام مسلمانوں کو مختلف زمانوں میں جن جن جاننے والے بزرگوں پر جمع کر دیا تھا۔ جہل کا علم کے ساتھ جو یہ ناگزیر فطری تعلق ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں جو مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں بھی مسیحیوں کے

قرون متوسطہ کی تصویروں کو نمایاں کرنے کے لئے بے چین و مضطرب ہیں ان ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ احتیاج کے اس تعلق سے نفع اٹھاتے ہوئے کب، کہاں، کس زمانے میں، کن لوگوں کی طرف سے ان دعووں کی منادی کی گئی کہ سب کچھ ان ہی کا ہے جو مذہب کے جاننے والے ہیں، نہ جاننے والوں کا کام صرف اس قدر ہے کہ جاننے والوں کی طرف سے جو کچھ جس شکل میں بھی انھیں عنایت کیا جائے صبر و شکر کے ساتھ اسے قبول کرلیں، صاف لفظوں میں دریافت کرتا ہوں بتانے والے خدارا بتائیں کہ مسلمانوں کے کن اماموں، کن مجتہدوں، کن فقیہوں، کن محدثوں، کن متکلموں کی طرف سے ایسا وثیقہ پیش کیا گیا، کہ

"اسلامی ممالک پر حکمرانی کا حق صرف ان ہی کو حاصل ہے"

مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے کس خلیفہ یا بادشاہ کے عطیہ کو دنیا میں اس نام سے پیش کیا کہ جس کا مالک تھا، اس نے اپنی شفایابی کے شکرانے میں تمام شاہی محلات، شاہی دارالسلطنت پر تمام صوبوں اور اضلاع و ممالک کے ساتھ قبضہ دلایا ہے، کس کی طرف سے اس دعویٰ کا اشتہار دیا گیا کہ مذہب کی نمائندگی کا جن کو حق ہے، ان پر کوئی حرف گیری نہیں کرسکتا، سلطنت کی عدالتوں کو ان کے مقدمات کی سننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، دنیا کے سلاطین اور شاہزادے ان کے دست نگر ہیں، وہ جس بادشاہ یا بادشاہوں کے بادشاہ شہنشاہ کو بھی جب چاہیں معزول کرسکتے ہیں، ان بیچاروں میں ایسا کون تھا جس نے شاہنشاہوں کی سرتاجی کا دعویٰ کرکے اعلان کیا ہو کہ خدا کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کردیں، برباد کردیں نیست و نابود کردیں، منتشر کردیں، ہاتھ میں جنت کی کنجیوں کو لے کر معافی اور رامرزش کے پروانوں کی ان میں کس نے کب اور کہاں تجارت کی ہے، خدا کی رحمت کا سوداگر ان میں کون تھا، کس قرن اور کس عہد میں یہ باور کرایا گیا کہ دنیا کی حکومتوں سے غلطی ہوجائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کرسکتی ہے، لیکن روحانی حکومت سے اگر غلطی ہوجائے تو اس کا انصاف کرنے والا صرف خدا ہے۔

باوجود عیسائی ہونے کے، کلیسا کے پوپوں نے جو مذہب کی تشریح کی تھی، اس تشریح سے اختلاف کرنے والوں پر عیسائی مذہب کے پیشواؤں نے انتقام کی جو آگ، مذہب کے نام سے برسائی، دین کے نمائندوں نے قتل عام کے خونیں سمندر میں انھیں جو غوطے دئیے جس کے سننے سے اب بھی سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا مذہب اسلام کی تشریح کرنے والوں کی تاریخ میں اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ اس طرزِ عمل کو کسی پیمانے پر سہی، کبھی روا رکھا گیا ہے، دینی اختلافات کے متعلق عام مسلمانوں کا جو نقطۂ نظر ابتدا رسے آخر تک رہا، اس کا حال سنایا جا چکا ہے، کیا دونوں میں کوئی نسبت ہے؟

کلیسا کے تشریحی نظریات و آرا رسے اختلاف کرنے والوں کی تفصیل سے یورپ کی تاریخ بھری پڑی ہے، اجمالاً میں نے بھی اشارے کئے ہیں، لیکن "مذہبی اختلاف" کے جس لفظ نے یورپ کی سرزمین کو سینکڑوں سال تک انسانوں کے خون سے رنگین رکھا، بجنسہٖ اسی "مذہبی اختلاف" کی جو تاریخ اسلام میں مرتب ہوئی ہے، سنئے ہو اس کے واقعات کیا ہیں، خود امام مالکؒ راوی ہیں۔

قال لما حج المنصور قال لی	جب عباسی خلیفہ منصور نے حج کیا تو اس نے
عزمت علی ان امر بکتبک	مجھ سے (یعنی امام مالکؒ سے) کہا میں نے یہ پختہ ارادہ
ھذہ التی وضعتہ فتنسخ ثم	کر لیا ہے کہ جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں ان کی نقلیں کرا دوں
ابعث الی کل مصر من امصار	پھر مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں انھیں بھیج کر یہ فرمان
المسلمین منھا نسخۃ و	کر دوں کہ لوگ صرف ان ہی کتابوں کے مطابق
امرھم ان یعملوا بما فیھا	عمل کریں، ان کے حدود سے متجاوز ہو کر کوئی اور
ولا یتعدوہ الی غیرہ[1]	طریقہ نہ اختیار کریں۔

[1] میزان الکبریٰ الشعرانی وغیرہ۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو خود تو کیا خیال آتا، ان سے اختلاف رکھنے والوں کے متعلق اس
وشاہ میں خیال پیدا ہوتا ہے، اور پیدا کیا ہوتا ہے، پختہ ارادے کی شکل اختیار کر چکا ہے جو اپنی عسکری
ور سیاسی قوت میں غالباً روئے زمین پر اس زمانہ کا سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا، اپنی سلطنت کے
ارے وسائل و ذرائع کو امام مالکؒ کے قدموں پر اس لئے ڈال دیتا ہے کہ جو ان سے اختلاف رکھتے
یں، ان کا ہمیشہ ہمیش کے لئے خاتمہ کر دیا جائے اور جس تلوار کو منصور امام کے ہاتھ میں دے رہا تھا، اگر
ہ لیتے تو کامیابی میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی، لیکن مذہبی اختلاف کے جس تماشے کو یورپ کے
رون متوسطہ اور مسیحی مذہب کے دورِ کلیسائیت میں دیکھا جا چکا ہے، اب اسی اختلاف کے نتائج
و اسلام کی تاریخ میں بھی چاہیے کہ سنا جائے اور بگوشِ عبرت سنا جائے۔ خلیفہ منصور کے اس ارادے
ے مطلع ہونے کے بعد امام نے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔

یا امیر المومنین لا تفعل ھذا — اے مسلمانوں کے امیر آپ ہرگز ایسا نہ کیجئے،

یوں نہ کیجئے، خود ہی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فان الناس قد سبقت الیھم	مسلمانوں کے پاس (دوسرے علماء کے) اقوال پہلے پہنچ
اقاویل وسمعوا احادیث ورووا	چکے ہیں، حدیثیں وہ سن چکے ہیں، روایتیں روایت
روایات واخذ کل قوم بما سبق	کر چکے ہیں، لوگوں کے پاس جو بات پہلے پہنچ چکی ہے
الیھم ودانوا فدع الناس	اسی پر وہ عمل پیرا ہو چکے ہیں، پس ہر آبادی کے باشندے
وما اختار اھل کل بلد منھم	جو باتیں اپنے لئے اختیار کر چکے ہیں ان ہی کے ساتھ
لانفسھم	لوگوں کو چھوڑ دیجئے۔

جو اختلاف کرے گا، اکھاڑ پھینکا جائے گا، برباد کر دیا جائے گا، نیست و نابود کر دیا جائیگا
ور جنھوں نے اختلاف کیا وہ اکھاڑ پھینکے گئے، برباد کیے گئے، نیست و نابود کیے گئے" مذہبی اختلافات"
ے تحفظ کے یہ نتائج یورپ کے قرون متوسطہ میں پیدا کیے اور آپ قرون متوسطہ مسلمانوں کے
جن قرون کو قرار دینا چاہتے ہیں اسی مذہبی اختلاف کے رکھنے والوں کو جب برباد کرنے

اکھاڑ پھینکنے، نیست ونابود کرنے کا ارادہ اور پختہ ارادہ کیا گیا، تو جس سے اختلاف کی وجہ سے یہ ارادہ کیا گیا تھا، اسی نے نہ صرف اختلاف کرنے والوں کو بلکہ ان کے اختلاف کو بھی نیست ونابود ہونے سے بچالیا، اور ہمیشہ کے لئے بچالیا۔ کہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد منصور کے بعد عباسی حکومت کا جو تیسرا خلیفہ ہارون الرشید تھا وہ بھی حج کے سلسلہ میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ پہنچتا ہے۔ امام مالکؒ سے اس کی بھی ملاقات ہوتی ہے۔ امام ہی اس قصہ کے بھی راوی ہیں۔

شاورنی هارون الرشید	ہارون الرشید نے مجھ سے اس باب میں مشورہ کیا کہ
فی ان یعلق الموطأ فی	خانہ کعبہ میں الموطا (امام مالکؒ کی کتاب) لٹکا دیجائے
الکعبہ ویحمل الناس	اور عام مسلمانوں کو اسی کے متعلق عمل کرنے پر
علیٰ ما فیہ	آمادہ کیا جائے۔

جواب میں اس وقت بھی امام نے یہی فرمایا۔

لاتفعل فان اصحاب رسول الله	ایسا نہ کیجئے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
صلی الله علیہ وسلم اختلفوا فی	صحابہ اسلام کے فروعی مسائل (یعنی البینات میں
الفروع وتفرقوا فی البلدان و	نہیں) باہم اختلاف رکھتے تھے، وہی لوگ مختلف
کل مصیب [1]	آبادیوں میں پھیل گئے، ان میں ہر ایک حق وصواب پر تھا۔

مطلب وہی تھا کہ اختلاف کی یہ شکل اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، نبوت کے صحبت یافتوں نے جب اس کے ازالہ کی کوشش نہیں کی، بلکہ زیادہ تر یہ اختلافات ان ہی کے اختلافات پر مبنی ہیں، تو جس نے جو طریقہ اختیار کرلیا ہے، اس سے خواہ مخواہ ہٹانے کی ضرورت کیا ہے۔

"کلیسائیت" کا شبہ اگر کچھ ہوسکتا تھا تو ہماری فقہ کے ان ہی مکاتب خیال کے متعلق ہوسکتا تھا، لیکن امام مالکؒ ان ہی فقہی طریقوں میں سے ایک طریقہ کے امام الائمہ ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اقتدار واختیار کے باوجود "مذہبی اختلاف" کے ان الفاظ کو انھوں نے کتنا سبک اور نرم فرمادیا تھا۔

---

[1] میزان الکبریٰ وغیرہ۔

اور کچھ وہی اس معاملہ میں منفرد نہ تھے، کچھ پہلے عمر بن عبدالعزیز خلیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مختلف اقوال میں سے اسی مذہبی اختلاف کے متعلق یہ الفاظ نقل کر چکا ہوں، یعنی ان سے جب یہ خواہش کی گئی کہ مسلمانوں کو ایک ہی مسلک پر کاش آپ بزور حکومت جمع فرما دیتے تو آپ نے جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ "مسلمانوں میں اگر یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ بات مجھے اچھی نہ لگتی" ممالک محروسہ میں یہ فرمان جاری فرما دیا تھا۔

لیقضی کل قوم بما اجتمع — ہر جگہ کے لوگ اسی کے مطابق فیصلہ کریں

علیہ فقہاء ھم ؎۲ — جس پر ان کے فقہاء ہیں۔

پس وہ تھا مسلمانوں کے اماموں کا رویہ ان مذہبی اختلافات کے متعلق، اور یہ تھا امراء وسلاطین کا طرز عمل، کہتے ہیں ہارون الرشید کو مشورہ کے بعد امام مالکؒ نے جو جواب دیا تو ہارون الرشید نے سن کر کہا،

یا ابا عبد اللہ — اے ابو عبداللہ (امام مالکؒ کی کنیت ہے) خدا نے آپ کو

وفقك اللہ ؎۳ — نیک توفیق عطا فرمائی (جو یہ بات سمجھائی)

اور یہی میں کہتا چلا آ رہا ہوں کہ ہمارے عوام ہوں یا خواص، مذہبی پیشوا ہوں یا سیاسی زعماء، اس باب میں سب کا ایک ہی خیال شروع میں بھی یہی تھا، درمیان میں بھی یہی رہا، اور آخر میں بھی یہی رہا لیکن نہ جاننے والوں کو کیا کہا جائے کہاں تک سنایا جائے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتابوں میں جو یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ

ترك القنوت لما زار قبر — جب امام ابو حنیفہؒ کے مزار کی زیارت کو تشریف لے

ابی حنیفة وادی صلوة الصبح عندہ — گئے تو انھوں نے (امام شافعیؒ نے) صبح کی نماز میں

وقال کیف اقنت بحضرة الامام — قنوت کی دعا چھوڑ دی، اور بولے کہ امام کے سامنے

وھو لا یقول بہ ع — کیسے پڑھوں وہ اس کے قائل نہ تھے۔

؎۱ دارمی ص ... ؎۲ میزان ۔ ؎۳ میزان ص ۱۵

بعض کتابوں میں یہ بھی ہے کہ خود امام شافعیؒ فرماتے تھے۔

صلیت الصبح فلم اجہر بالبسملۃ — میں نے صبح کی نماز پڑھی تو بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھا

ولا قنت حیاء من ابی حنیفۃ[1] — اور قنوت کی دعا امام ابو حنیفہؒ کے شرم سے نہ پڑھی،

تقریباً اسی قسم کی بات حنبلیوں کے امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی منقول ہے ان سے پوچھا گیا کہ وضو کے بعد جس کی نکسیر پھوٹی ہو یا اس نے حجامت (پچھنا) لیا ہو، کیا اس کے پیچھے نماز آپ پڑھ سکتے ہیں، باوجودیکہ امام احمد کا مذہب تھا کہ ان چیزوں سے یعنی خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن صحابہ و تابعین میں ایک جماعت اس کی قائل نہ تھی، جن میں سعید بن المسیب مدینہ کے افضل تابعین بھی ہیں۔ امام احمد نے جواب میں فرمایا۔

کیف لا اصلی خلف سعید بن المسیب — سعید بن المسیب کے پیچھے میں نماز کیسے نہ پڑھوں گا۔

دیکھ رہے ہو خود براہِ راست اسلام کے فقہی مکاتب خیال کے ان ائمہ کا ذاتی خیال اختلافاتِ مذہب کی ان شکلوں کے متعلق کیا ہے، حنفیوں کے مشہور امام یعنی "الامام الثانی" قاضی ابو یوسف کے متعلق ہدایہ وغیرہ تک میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ عید کی نماز میں ہارون الرشید کے منشار کے مطابق انھوں نے اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ کر اس فتوی پر عمل کیا جو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے، بلکہ کتابوں میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون کے ساتھ قاضی ابو یوسفؒ مدینہ میں ساتھ تھے، اس زمانہ کے دستور کے مطابق ہارون ہی کو امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا، وضو کرنے کے بعد اس نے حجامت (پچھنے) کا عمل اپنے اوپر کرایا تھا جس میں خون نکلا تھا حنفی مذہب کی رو سے وضو ٹوٹ گیا۔ لیکن امام مالکؒ نے جو خون نکلنے سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں، اسی حال میں ہارون کو نماز پڑھانے کا فتوی دیا۔ قاضی ابو یوسفؒ بغیر کسی تذبذب کے ہاتھ باندھ کر پیچھے کھڑے ہو گئے فصلی خلفہ ولم یعد (ابو یوسفؒ نے ہارون کے پیچھے نماز پڑھی اور اسے نہیں لوٹایا)[3]

---

[1] جواہر مضیئہ ج ۲ ص ۴۲۳ [2] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۱۵۶ [3] ایضاً

اور میں تو کہتا ہوں کہ خود امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ راشدین قاضی ابویوسف و محمد بن حسن الشیبانی وغیرہم حضرات میں فقہ کے تقریباً ہر باب میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، اگرچہ عوام میں مشہور کردیا گیا ہے کہ ان اختلافات کی نوعیت اصولی اختلافات کی ہے، لیکن میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اصولی اختلاف یعنی دین کے "البینات" میں بحمداللہ ان بزرگوں میں قطعاً کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے، اختلافات جو کچھ بھی ہیں وہ مذہب کے صرف غیر بیناتی حصے سے متعلق ہیں، پھر یہ کہنا کہ دوسرے ائمہ اور امام ابوحنیفہؒ میں تو اصولی اختلافات ہیں، صحیح نہیں ہے، اور اگر اصولی اختلافات کا کچھ اور مطلب ہے تو کسی حیثیت سے بھی سوچا جائے، میں قطعاً اس فرق کے سمجھنے سے عاری ہوں، جس قسم کے اختلافات امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ و مالکؒ میں نظر آتے ہیں، بجنسہ اسی نوعیت کے اختلافات امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ میں بھی تقریباً شریعت کے ہر باب میں پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس تاتاری عالم علامہ ہارون شہاب الدین المرجانی کی یہ تنقید جو قول مشہور پر انھوں نے کی ہے بالکل صحیح ہے۔ اور واقعات کے مطابق ہے ان کی کتاب "ناظورۃ الحق" سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے "النافع الکبیر" میں نقل فرمایا ہے۔

لیت شعری ما معنی قولھم ان	کچھ سمجھ میں نہیں آتا، لوگوں کا اس سے کیا مطلب
ابا یوسف و محمد وزفر وان خالفوا	ہے کہ ابویوسف و محمد و زفر نے بھی اگرچہ
اباحنیفہ فی بعض الاحکام لکنھم	امام سے بعض احکام میں اختلاف کیا ہے
یقلدونھم فی الاصول ما الذی	لیکن یہ لوگ امام ابوحنیفہؒ کی اصول میں
یریدون بہ۔	تقلید کرتے ہیں۔

پھر خود ہی مرجانی نے بڑے بسط و تفصیل سے مختلف شواہد و نظائر کی روشنی میں یہ ثابت کردیا ہے کہ اختلاف کی ان دونوں قسموں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے اسی لئے ان کا خیال ہے کہ امام شافعیؒ و مالکؒ وغیرہم حضرات کو جس طرح امام ابوحنیفہؒ کے مقابلہ میں مجتہد مطلق سمجھا

جاتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ابویوسف و محمد وغیرہما کو بھی اجتہادِ مطلق کے اس منصب سے اتار کر مجتہد مقلد ٹھیرایا جائے۔ آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ لوگ چونکہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے اس لئے اپنے آپ کو تلمذاً امام ابوحنیفہؒ ہی کی طرف منسوب کرتے رہے، اسی لئے کسی مستقل کتبِ خیال کی حیثیت سے ان کے نظریات و اجتہادات نے شہرت حاصل نہیں کی، ورنہ بقول ان کے

لو انھم اولعوا بنشر آرائھم بین	اگر یہ لوگ (تلامذہ امام) بھی عام لوگوں میں اپنے
الخلق لکان کل ذالک مذھبا	آراء کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوجاتے تو ان کا بھی
منفردا عن مذھب ابی حنیفة	ایک مستقل مذہب ابوحنیفہؒ کے کتبِ خیال سے
(نافع الکبیر ص ۱۵)	جدا ہوجاتا۔

بہرحال جب یہی واقعہ ہے، اور اسی کے ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں جیسا کہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا کہ حنفی فقہ کی تدوین، ماہرین کی ایک باضابطہ مجلسِ شوریٰ نے کی ہے، جس میں گویا صدر کی حیثیت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، اور ان کے تلامذہ جو مختلف علوم و فنون کے مستند ماہرین میں تھے، ان کی حیثیت ارکان کی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ کتابوں میں امام کی رائے کے ساتھ ساتھ ان کے تلامذہ کے اختلافی آراء جو نقل کئے جاتے ہیں، یہ وہی اختلافات ہیں، جن کے اظہار کی آزادی اس مجلس میں ہر رکن کو حاصل تھی۔ صدر کی رائے کے ساتھ "متفق" ہونے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا تھا، اسی لئے جن امور میں امام سے ان کے شاگردوں کو اختلاف باقی رہتا تھا، وہ مجلس کی "یادداشت" میں اختلافی نوٹ کی حیثیت سے التزاماً درج کیا جاتا تھا، آئندہ معلوم ہوگا کہ شوریٰ کی اس مجلس میں بحث و تمحیص، سوال و جواب اعتراض و تنقید کی کتنی آزادی ہر ایک کو حاصل تھی، اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مذہبی مسائل کے ان اختلافات کی نوعیت امام اور ان کے شاگردوں کی نگاہوں میں کیا تھی؟ اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کو اگر یہ لوگ العیاذ باللہ دین کے دائرہ سے انحراف کرنے والوں میں شمار کرتے تھے، تو ان تعلقات کا باہم ان میں باقی رہنا کیا ممکن تھا۔ اور آج ہزار و بارہ سو سال سے بغیر کسی دغدغہ کے ادر

شک وشبہ کے حنفی فقہ کی کتابوں میں اختلافات کے یہ سارے قصے جو نقل ہوتے چلے آرہے ہیں کیا یہ خود دلیل نہیں ہے کہ "مذہبی اختلافات" کی جو نوعیت یورپ کے قرونِ متوسطہ میں کلیسا اور وابستگانِ کلیسا کے نزدیک یا ان کے مخالفوں کے نزدیک تھی "اس میں اور مسلمانوں کے مذہبی اختلافات میں کسی قسم کی کوئی مشابہت یا کسی قسم کی کوئی مجانست نہیں ہے۔

مگر کیا کیجئے اور ان لوگوں سے کیا کہیے جن کے آگے مذہبی اختلافات کے الفاظ کا ذکر چھڑا نہیں کہ اچانک یورپ کے قرونِ متوسطہ کی وہی مذہبی تاریخ ان کے سامنے آجاتی ہے۔ جس میں بڑے بڑے اہم اختلافات ہی نہیں، بلکہ جیسا کہ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے "ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں، بڑے معرکۃ الآرار مسائل کی حیثیت رکھتے تھے مثلاً

"عشاء ربانی میں خمیری روٹی استعمال کی جائے یا بلا خمیر کی، روح القدس باپ کا مظہر ہے، یا باپ اور بیٹے دونوں کا، سب سے اہم سوال یہ تھا کہ روما کے اسقف کو تمام کلیسا پر تفوق حاصل ہے یا نہیں" (تاریخ یورپ ص ۲۱۶)

اور یہ تھے یورپ کے قرونِ متوسطہ کے وہ مذہبی مسائل جن سے عیسائیوں کی ایک ٹولی کا دین دوسری ٹولی کے دین سے جدا اور قطعاً جدا ہو جاتا تھا، اتنا جدا کہ ان ہی اختلافات کے شعلوں میں صدیوں یورپ کے سارے ممالک جلتے رہے، بھنتے رہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آج بھی یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے، شعور کسی کو اس کا ہو یا نہ ہو، لیکن انسانی نفسیات اور ان کے عمل و ردِ عمل کے قوانین سے جو واقف ہیں، اگر وہ غور کریں گے تو اس کے پیچھے، بہت پیچھے ان ہی کی چنگاریاں چھپی دبی نظر آئیں گی۔

(باقی آئندہ)

اسلامی روایات اور ان کا تحفظ

مقالہ سویم

تعدد ازدواج

از جناب پروفیسر سید محمد جمیل صاحب واسطی ایم اے (کینٹب)

اس باب میں کثیر الازدواجی کے مضمون پر بحث کی گئی ہے، جس سے مراد ایک مرد کا کئی عورتوں سے جنسی تعلق رکھنا ہے۔ ایک عورت کے کئی مردوں سے جنسی تعلق رکھنے کے لئے ان مقالوں میں پولی اینڈری (Polyandry) کا انگریزی لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے۔

اس مقالہ میں مضمون زیرِ بحث کثیر الازدواجی ہے، پولی اینڈری نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام میں پولی اینڈری حرام ہے اور کثیر الازدواجی کی اجازت ہے۔ اس لئے اسلام پر مغربی مصنفین کے حملے کثیر الازدواجی کے جواز کی بنا پر ہی ہوتے رہے ہیں۔

ہندوستانی تاریخ میں دروپدی کا واقعہ پولی اینڈری کی مشہور مثال ہے۔ گلگت اور تبت کے بدھوں اور مالابار کے نائر لوگوں میں یہ رسم اب بھی رائج ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم زمانہ سے چلی آئی ہے۔ دروپدی پانچ پانڈووں سے بیاہی نہ جا سکتی اگر یہ اس زمانہ کا عام رواج نہ ہوتا۔ ڈارلنگ کی "پنجاب پیزنٹ" یعنی "پنجابی کسان" میں بھی پنجاب کی ایک جاہل غیر مسلم قوم میں اس رسم کے مروج ہونے کا ذکر کرتا ہے۔

کثیر الازدواجی ہر مذہب میں جائز ہے۔ اس ضمن میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں پولی گامی (Polygamy) یعنی کثیر الازدواجی کے مضمون پر جو آرٹیکل ہے اس کا مطالعہ کر لینا چاہیئے۔

ہندوستان کی تاریخ میں راجہ دسرتھ کی بیویوں کے جھگڑوں سے ہم خوب واقف ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی میں ریاست وجیانگر دکن کے حاکم دیو راجہ ثانی کی بارہ ہزار بیویاں تھیں جن میں سے دو تین ہزار کے قریب اس کے ساتھ مرنے کے بعد آگ میں زندہ جلائی گئیں۔ ل‍ہ

ظاہر ہے کہ راجہ دسرتھ اور دیو راجہ کے درمیان کثیر الازدواجی کی ایک دراز اور مسلمہ روایت ہے۔ اور یہ رسم ہندوؤں میں آج بھی رائج ہے۔ ۱۹۰۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری میں ہر ایک ہزار ہندو آبادی میں آٹھ خاندانوں میں کثیر الازدواجی رائج تھی۔ مسلمانوں میں کثیر الازدواجی کی مثالیں اس سے بھی کم ملتی ہیں۔ کیونکہ ہر مردم شماری میں ہندوؤں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے اور مسلمانوں میں یہ تفاوت نہیں پایا جاتا۔ لہذا کثیر الازدواجی مسلمانوں میں عملاً بہت کم ہے۔

اسلام میں کثیر الازدواجی کی محض اجازت ہے۔ کثیر الازدواجی کا حکم نہیں ہے، اگر آپ ایک مرد سے ایک ہی بیوی کے تعلق رکھنے کو اعلیٰ ترین ازدواجی زندگی خیال کرتے ہیں تو بھی آپ اچھے اور سچے مسلمان رہ سکتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ تمام مسلمان چار بیویاں بیاہتے ہیں۔ اگر تمام مسلمان مرد چار بیویاں کریں تو دنیائے اسلام میں عورتوں کی تعداد مردوں سے قریباً چار گنا ہونی چاہئے، لیکن یہ نہیں ہے۔ تمام اسلامی ممالک کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ عام طور پر نصف آبادی مردوں اور نصف عورتوں پر مشتمل ہے۔ لہذا عملاً کثیر الازدواجی مسلمانوں میں شاذ امر ہے اور غیر معمولی حالات میں یہ اجازت مفید ہوتی ہے۔ البتہ غیر مسلموں میں مثلاً عیسائی ممالک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور پردہ رائج نہیں ہے۔ لہذا باوجود اس کے کہ وہاں ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی قانوناً ممانعت ہے۔ عملاً جیسا کہ پچھلے باب میں اعداد و شمار سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کثیر الازدواجی و پولی اینڈری دونوں ہی رائج ہیں۔

ل‍ہ Oxford History of India by Vincent Smith Page 308.

مگر اسلام میں کثیر الازدواجی کی اجازت ضرور ہے، جیسا کہ یہودیت اور عیسائیت میں بھی ہے۔ اور یہ رواج اسلام نے یہودیت اور عیسائیت سے ہی ورثہ میں لیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں بیویوں کی تعداد مقرر نہیں کی گئی۔ اس لئے چار سے زیادہ بیویوں کو نکاح میں لانا یہودیت اور عیسائیت میں جائز ہے۔ اسلام میں کثیر الازدواجی کی اجازت کو صرف چار بیویوں تک محدود کیا گیا ہے۔

عیسائی اور یہودی بائبل کے پرانے عہد نامہ کو اپنی مقدس کتاب مانتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ کو اللہ کے مقدس نبی مانتے ہیں، یہ سب پیغمبر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سارہؓ و ہاجرہؓ دو بیویاں تھیں، حضرت یعقوبؑ نے پہلے دو بیویوں سے اور اس کے بعد ان کی دو لونڈیوں سے شادی کی۔ حضرت موسیٰؑ کا قانون یہودیوں کے لئے خدائی حکم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن حضرت موسیٰؑ نے کہیں بھی کثیر الازدواجی کی مذمت نہیں کی۔

حضرت داؤدؑ کی آٹھ بیویوں کے نام بائبل میں درج ہیں۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہم السلام نے سینکڑوں بیویوں سے شادی کی۔ حضرت سلیمانؑ سات سو بیویاں اور تین سو لونڈیاں رکھتے تھے۔ ان نبیوں میں سے پہلی بیوی کی اولاد کے سوا باقی بیویوں کے بچوں کو کتاب مقدس میں ناجائز قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ حضرت سلیمانؑ کا خدا کی جانب سے نبی منتخب ہونا حالانکہ وہ پہلی نہیں، بلکہ بعد کی بیاہی ہوئی بیوی کے چھوٹے لڑکے تھے۔ اس بات کی بین دلیل ہے کہ خدا کا حکم ان کے والد داؤد علیہ السلام کی کثیر الازدواجی کے حق میں تھا۔ اور خدا کے نزدیک پہلی شادی کے علاوہ دوسری شادیاں بھی ہر لحاظ سے حقیقی اور مذہبی نکاح کی حیثیت رکھتی تھیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہی مقدس پیغمبروں کی نسل میں سے تھے۔ اور انہی پیغمبروں سے نسلی و روحانی تعلق رکھتے تھے۔ اور انہی کی طرح خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔

غرض یہودیوں میں کثیر الازدواجی رائج تھی۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کے مقتدر

پیغمبر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ عیسائی بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ اپنی اخلاقی تعلیم اور صاف گوئی کی وجہ سے مصلوب ہوئے۔ اگر وہ کثیر الازدواجی کو ناجائز اور خدا کی لعنتوں میں سے خیال کرتے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ صاف گوئی سے کام نہ لیتے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے ایک دفعہ بھی نئے عہد نامے میں اس عبرانی روایت کو منسوخ نہیں کیا۔ مقدس ڈومی نیکن عیسائی راہب کامپ نیلا سنہ ۱۶۰۲ء میں اپنی کتاب "کیوی ٹاس سولس" یعنی شہر خورشید" میں جس کا لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ ٹیوڈر پبلشنگ کمپنی نیویارک نے شائع کیا ہے فرماتے ہیں

"مقدس رومی کلیمنٹ کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے اپنے مال و دولت کی طرح اپنی بیویوں کو بھی بہم کر لیا تھا۔" (ص ۲۹۴)

مگر عہد نامۂ جدید سے حضرت عیسیٰؑ کا کوئی حکم اس حالتِ ازدواجی کے جواز میں بھی نہیں پایا جاتا۔ پیٹر بین، مارٹن لوتھر کی سوانح عمری کی دوسری جلد میں مارٹن لوتھر کا یہ فقرہ تحریر فرماتے ہیں

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص ایک سے زیادہ بیویاں بیاہنا چاہے تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کا یہ فعل انجیل مقدس کے احکام کے خلاف ہوگا۔"

مارٹن لوتھر عبرانی و یونانی و لاطینی زبانوں کے فاضل تھے اور پروٹسٹنٹ عیسائیت کے بانی ہیں۔ اور انھوں نے ایک جرمن امیر فلپ ہیس کو دوسری بیوی بیاہنے کی اجازت دی۔ اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون پولی گامی Polygamy میں صاف درج ہے کہ کثیر الازدواجی انجیل کے احکام کے خلاف نہیں ہے۔

مارٹن لوتھر کی رائے عیسائیت کی ایک دراز روایت سے منسلک ہے، عیسائی عمل اور عقیدہ کثیر الازدواجی کو ناجائز قرار نہیں دیتا۔ پوپ گری گوری اپنے ایک خط میں سنہ ۷۵۳ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اگر ایک بیوی ایسی بیمار ہو کہ وہ شادی کے تعلقات کے فرائض انجام نہ دے سکے تو اس کا خاوند ایک اور بیوی بیاہ سکتا ہے۔"

سینٹ آگسٹائن کثیر الازدواجی کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں اگر ایک ملک کا رواج اجازت دے تو کثیر الازدواجی کوئی جرم نہیں۔ پوپ کلیمنٹ ہفتم نے کئی عیسائیوں کو دوسری شادی کی اجازت دی۔ جان ملٹن مشہور شاعر عبرانی یونانی و لاطینی کا فاضل تھا۔ اپنی کتاب "کرسچن ڈاکٹرین" یعنی "عقائدِ نصرانیت" میں لکھتا ہے کہ

"چوتھی صدی عیسوی میں کلیسا کے احکام کے مطابق کلیسا کے عمائد اور ڈیکنوں کے انتخاب کو ان عیسائیوں پر محدود کیا گیا جو صرف ایک بیوی رکھتے تھے۔

جان ملٹن آگے لکھتا ہے۔

"اس سے ظاہر ہے کہ کلیسا کے دوسرے ممبروں کو کثیر الازدواجی کی اجازت تھی، اور وہ اس اجازت پر بلا تکلف عمل کرتے تھے۔"

یہ یقینی امر ہے کہ عیسویت کی اولین صدیوں میں اور قرونِ وسطیٰ میں کثیر الازدواجی عیسائیوں میں عام رائج تھی۔ مشرقی رومی سلطنت کا قریباً ہر بادشاہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا تھا۔ ان بادشاہوں کی فہرست دراز ہے۔ اور مشرقی رومی سلطنت یعنی بازنطین حکومت کی کسی تاریخ سے اس امر کا ثبوت مل سکتا ہے۔ شہنشاہ ویلنٹیانس اور کونسٹینٹیس جو کونسٹینٹائن اعظم کا بیٹا تھا، کئی بیویاں رکھتے تھے۔ کلوتیر شاہ فرانس، ہیری برتوس، داگی بیرٹس اس کا بیٹا سب کثیر الازدواج تھے پیپن و شارلیمین مشہور صلیبی مجاہد شاہِ فرانس کو بھی اس فہرست میں شامل کر لینا چاہیے، سینٹ اسپر گنسس شاہ شارلیمین کی کئی بیویوں کا ذکر کرتا ہے۔

ارنالفس ہفتم شہنشاہِ جرمنی [illegible] فریڈرک بار بروسہ، فلپ تھیوڈاتس شہنشاہ فرانس، مشہور بادشاہ ہیں اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ فرینک بادشاہوں کی پہلی نسل میں اکثر بادشاہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ اور شاہ گونتران کی تین بیویاں مسلّم تھیں۔ فادر وانیالی فرانسیسی بادشاہوں کی کثیر الازدواجی کا ذکر کرتا ہے۔ اور شاہ دیگوبرٹ اول کی تین بیویاں تسلیم کرتا ہے۔ غرض اس قسم کی مثالیں عیسائی تاریخ سے بے شمار مہیا کی جا سکتی ہیں جن سب عیسائی مورخین ان عیسائی

بادشاہوں سے عیسائی قوانین کے مطابق شادی شدہ تھیں۔ عوام بھی علی ہذا القیاس کثیر الازدواجی
کو جائز خیال کرتے تھے۔ اور حسب ضرورت اس پر عمل پیرا تھے۔ ایک بیوی بیاہنے کا قانون عیسائیت
سے پہلے سلطنتِ روما کا قانون تھا۔ جو عیسائی یورپ نے ورثہ میں لیا۔ لیکن اگرچہ روایتی تعصب اور
زندگی کی عام آسانی ایک بیوی کے اصول کے حق میں تھی عیسائی مذہب میں کثیر الازدواجی کی اجازت
مذہبی طور پر ہمیشہ رہی ہے اور عیسائی مذہبی اکابرین نے کبھی اس سے انکار نہیں کیا۔

عیسائی فرقہ انابیپٹسٹ کثیر الازدواجی کے حق میں تھا۔ انیسویں صدی میں امریکہ میں
ایک عیسائی فرقہ ظہور میں آیا جس کا نام مورمن ہے۔ انھوں نے اولین عیسائیت کی روایات کا
احیا کیا اور کثیر الازدواجی کو دوبارہ علی الاعلان رائج کیا۔ یہ فرقہ بیسویں صدی کے شروع میں
بھی کثیر الازدواجی پر عمل پیرا تھا۔ آخر کار ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے قانوناً اس
کثیر الازدواجی کو ممنوع قرار دیا۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ کثیر الازدواجی کے مسئلہ میں یہودیت ونصرانیت اور اسلام میں
کوئی فرق نہیں۔ اگر ہے تو اتنا کہ پرانے مذاہب میں کثیر الازدواجی کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اسلام
نے چار بیویوں کی حد مقرر کی۔ اور ایک بیوی رکھنے کو ازدواجی زندگی کی اعلیٰ ترین حالت ظاہر کیا
ایک سے زیادہ بیوی سے شادی نہ کرنے کی عیسائیوں پر کوئی مذہبی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ یہ
یورپ کا صرف ملکی قانون ہے۔ اور اگر ہم ان اعداد وشمار پر غور کریں جو یورپ کی جنسی کیفیت
کے متعلق پچھلے باب میں بیان کئے گئے ہیں تو ظاہر ہو جائے گا کہ صرف ایک بیوی سے
تعلق رکھنے کا ملکی قانون بھی یورپ میں واقعیت کے لحاظ سے محض ایک مُردہ قانون ہے۔ اور
جنسی بدنظمی کی حالت میں کثیر الازدواجی کے ساتھ پولی اینڈری بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ہمارے خیالات یورپ کے متعلق وہی ہیں جو یورپی قیصریت کے پروپگنڈہ نے
یورپ کی عظمت وشوکت ہمارے دلوں پر بٹھانے کے لئے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ اور یورپ
کی معاشرتی زندگی کو یورپ کے مذہبی مبلغین نے اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمیں اس کو مکمل طور پر

اختیار کرنے کی خواہش ہو۔ اور ہم اس معیاری اور اعلیٰ نمازندگی کو قبول کرنے میں یورپی مذہب
کو بھی قبول کر لیں۔ یورپ کی کامیابی اور ہماری سیاسی مجبوری بھی ہمارے ذہن کو نقل پر مائل کرتی
ہے۔ اور ہمیں اپنی معاشرتی زندگی کے متعلق بے اطمینانی پر مجبور کرتی ہے۔ یورپ کی موجودہ برتری
کے وجوہات مقالۂ اول میں بیان ہو چکے ہیں۔ عناصر قوت کا حصول ہی حصولِ قوت پر منتج ہو سکتا
ہے۔ معاشرتی زندگی کو یورپ کی معاشرتی زندگی پر ڈھالنے سے وہ سیاسی واقتصادی قوت
حاصل نہیں ہو سکتی جس کے ہم متلاشی ہیں۔ کیونکہ اس قوت کے عناصر معاشرتی زندگی سے مختلف
ہیں اور بالوضاحت مقالۂ اول میں بیان ہو چکے ہیں۔

مگر خود یورپ کے لوگ اپنی زندگی کی مشکلات سے واقف ہیں۔ اور کئی عیسائی . . .
کثیر الازدواجی کو عیسائیت میں جائز سمجھکر اس کے حق میں کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ لندن کی "سوسائٹی
فار پروموٹنگ کرسچن نالج" ان کتابوں کے جواب لکھتی رہتی ہے۔ مگر وہ حضرات جو یورپی
عیسائی زندگی کے اسقام ونقائص سے آگاہ ہیں۔ کثیر الازدواجی کی اجازت میں ہی اپنی فلاح و
اصلاح پہچانتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں جے۔ ای۔ کلیٹر میکفارلین نے ایک کتاب "دی کیس فار پولی گامی" لکھی ہے
جو یورپ اور خاصکر انگلستان میں کثیر الازدواجی کے اختیار کرنے کے حق میں دلائل پیش کرتی ہے
اور اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کے نہ رکھ سکنے کے خلاف یورپ کے ملکی قانون کی پرزور مذمت
کی گئی ہے۔ یہ کتاب "دی سرچ پبلشنگ کمپنی" لندن نے شائع کی ہے۔ ایسے حضرات کو
اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس مسئلہ پر صداقت کے متلاشی ہیں، یا یورپ
کی زندگی کے متعلق فردوسی نقشے دماغ میں رکھتے ہیں۔ بہر حال کیونکہ یورپ کے متعلق
ایک یورپی مصنف کے بیانات قابلِ وقعت ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مفید ضرور
ثابت ہو سکتا ہے۔

"دی کیس فار پولی گامی" میں کلیٹر میکفارلین بیان کرتے ہیں کہ انگلستان میں

۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق سترہ لاکھ چھتیس ہزار (۱۷۳۶۰۰۰) عورتیں تعداد میں مردوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن ایک سے زیادہ بیویوں کے خلاف قانون نے اتنی عورتوں کے لئے شادی اور اولاد کی خوشی خلاف قانون بنادی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی ہی مردم شماری کے مطابق پنتالیس لاکھ ستاسی ہزار (۴۵۸۷۰۰۰) عورتیں انگلستان میں ایسی ہیں جو پندرہ اور پنتالیس سال کی عمر کے درمیان ہیں، اور غیر شادی شدہ ہیں۔ ان میں سے چھتیس لاکھ پچپن ہزار (۳۶۵۵۰۰۰) عورتیں ایسی ہیں جن کا کوئی ذاتی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ جب غیر شادی شدہ عورتیں معاش کی تلاش میں مردوں کے مقابلہ میں اترتی ہیں تو لاکھوں مردوں کو اپنی اُجرت اتنی کم کرنی پڑتی ہے کہ وہ اہل وعیال کے اخراجات کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس طرح بیکار عورتوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوجاتا ہے لیکن جب لاکھوں عورتوں کو مردوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو "انھیں اس سنگدل خود غرض دنیا سے محض ضروریاتِ حیات حاصل کرنے کے لئے اپنے جسم کو بھی بیچنا پڑتا ہے۔" عورتوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مرد اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے شادی کرلیں۔ بے پردہ سوسائٹی میں مردوں سے ملاقات بڑھانے کے مواقع تو عام ہوتے ہیں۔ خاوندوں کے لئے عورتوں کی اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بقول فاضل مصنف

> "اکثر عورتوں کا پچھتر فی صدی وقت ایک خاوند کو حاصل کرنے یا حاصل کرکے اس کو اپنے قابو میں رکھنے پر خرچ ہوجاتا ہے۔ اس طرح عورتوں کے قوائے ذہنی بالکل برباد ہوجاتے ہیں۔ اور ان کے دل بغض وحسد وحشیانہ نفرت وشدید مخاصمتوں اور ذلیل سازشوں کی وجہ سے تنگ اور تاریک رہتے ہیں"

۱۸ / اکتوبر ۱۹۳۱ء کے دن کے اخبار "سنڈے ایکسپریس" میں درج ہے کہ عدالتوں میں ہر روز نوّے طلاق کے مقدمات پیش ہوتے ہیں۔ نیز ان سب غیر شادی شدہ عورتوں کو ناپسندیدہ حمل کے مواقع پیدا ہوسکتے ہیں جن کا نتیجہ خلافِ قانون اسقاط الحمل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں

عورتوں کی تجارت زندگی کا ایک اور ناخوش کن پہلو ہے جو ان حالات کا لازمی نتیجہ ہے۔

فاضل مصنف میکفارلین افسوس کرتے ہیں کہ عورت پر یہ سب ظلم عیسائیت کے نام پر روا رکھا جاتا ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ کتاب مقدس کے عہد نامہ عتیق و جدید میں کثیر الازدواجی کی کہیں بھی ممانعت نہیں ہے۔ عیسائی کثیر الازدواج پیغمبروں کے الہامات کو خدائی احکام تصور کرتے ہوئے کثیر الازدواجی کے خلاف ہیں۔ پھر یہی مصنف فرماتے ہیں۔

"ہم صرف اپنی عورتوں کو فاحشہ بنانے پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ جہاں جہاں ہم علیہ السلام مسیح کا پیغام لے جاتے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ اپنا معاشرتی نظام بھی لے جاتے ہیں اور غیر مسیحیوں کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح اپنی عورتوں کو بازاروں میں دھکیل دیں تاکہ وہ بھی ہماری عورتوں کی طرح بے خانماں زنانِ بازاری بنجائیں" (ص ۶۵)

اور آگے بیان کرتے ہیں۔

"لیکن ہمارا کلیسا ایک رہنما محافظ کی بجائے ایک ڈکٹیٹر رہا ہے۔ ایک طرف یہ محبت کا پیغام دیتا ہے جس سے شہید اور ولی پیدا ہوں۔ دوسری طرف تلوار چلاتا ہے۔ انسانی روح کو غلام بنانے کے لئے اس نے وحشیانہ جنگ کی ترغیب دی ہے اور ایسی لڑائیاں لڑی ہیں۔ مختلف العقیدہ لوگوں پر خونی مظالم کئے ہیں۔ ارتداد کے بہانے انسانوں کو جلایا ہے اور انسانی غلامی دور کرنے کی شدید مخالفت کی ہے۔" (ص ۹۹)

اور فاضل مصنف کلیسا کے اس رویے کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں جو کلیسا نے کثیر الازدواجی کے متعلق یعنی اس کے خلاف اختیار کیا ہوا ہے۔ اور وہ اپیل کرتے ہیں کہ زندگی کے روزمرہ مشاہدات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کیونکہ روزمرہ کے بین واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔

"کہ باوجود مذہبی مجبوری کے مردوں سے ایک بیوی کے قانون کی متابعت نہیں کرائی جا سکتی۔ ... ہمارے ملک اور اپنے ممالک میں جہاں کثیر الازدواجی کا

رواج ہے۔ فرق صرف یہی ہے کہ وہ ایمانداری اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں
اور ہم منافقت پر مجبور ہیں"

غالباً اس کتاب سے زیادہ اقتباسات کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ جو فاضل مصنف یورپ کی تشنۂ جنسیت عورتوں کے متعلق مشاہدہ کی بنا پر تحریر کرتے ہیں اس مختصر مقالہ میں بیان نہیں ہوسکتا مگر جو کچھ بیان ہوچکا ہے اس سے اسلامی اصولوں کی برتری اور اعتدال پسندی واضح ہے۔

فطرت کے قوانین سے بھی کثیر الازدواجی کی اجازت کی ضرورت کو ثابت کیا جاسکتا ہے مگر میں نے ایسے دلائل کو اس لئے نظر انداز کردیا ہے کیونکہ سب مسلمان کثیر الازدواجی کے حق میں واضح فطرتی براہین سے واقف ہوتے ہیں۔ حمل کے خاصکر آخری ایام میں، چلہ میں۔ اور بچہ کو دودھ دینے کی مدت میں۔ ممنوعہ حالات میں عورت ازدواجی فرائض سرانجام نہیں دے سکتی۔ اور مردوں کی ایک اقلیت ایسی ہے جو اگر کثیر الازدواجی کی اجازت نہ ہو تو جنسی بدنظمیوں پر مجبور ہوجائے گی۔ لہذا ایک قوم کی معاشرتی پاکیزگی صرف محدود کثیر الازدواجی سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اگر دراز جنگ یا اس لئے کہ زندگی کی کٹھن ذمہ داریاں مرد پر عورت کی نسبت زیادہ ہیں، یا اور اتفاقی وجوہات سے عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوجائے تو قوم کو اخلاقی اور نسلی بربادی سے روکنے کا واحد علاج صرف کثیر الازدواجی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے کئی مفکرین کثیر الازدواجی کے حق میں ہیں۔

پہلی بیوی کو صرف اس لئے طلاق دیدینا کیونکہ مرد کو دوسری عورت سے نکاح کرنے کی خواہش یا ضرورت ہے۔ پہلی بیوی اور اس کی اولاد سے سخت ناانصافی ہے کیونکہ غالباً اس وقت تک پہلی بیوی گھر کے آرام اور بچوں کی پیدائش کی وجہ سے آزادانہ روزی کمانے کے قابل نہیں رہتی۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنا اور اس کو بیاہ نہ سکنا، کیونکہ سوسائٹی دوسری عورت سے نکاح کی اجازت نہیں دیتی اس کو اور اپنے آپ کو اور سوسائٹی کو اخلاقی ذلت میں کھینچتا ہے۔ اور اپنی اولاد کو جو دوسری عورت سے ہو

ورثے سے محروم کرنے کے علاوہ ذلت اور خواری میں دھکیلنا ہے، جو سراسر ظلم اور بے انصافی ہے
یہ مانتے ہوئے بھی کہ ایک عورت اور ایک مرد کا مستقل نکاح اعلیٰ ترین ازدواجی حالت
ہے۔ کثیر الازدواجی کی اسلامی قسم کی محدود اجازت کا ہونا قومی و نسلی پاکیزگی کے لئے
سخت ضروری ہے۔

اسلام فطرت اور اخلاقی پاکیزگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے محدود کثیر الازدواجی کی
اجازت دیتا ہے۔ اور اس حالت میں بیویوں کے درمیان سخت انصاف اور مکمل انصاف
کا حکم دیتا ہے۔ جو کڑی شرط ہے۔ اور جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔ یہ حالات
ان حالات سے بہت بہتر ہیں جہاں ایک سے زیادہ بیوی نہ کر سکنے کی قانونی مجبوری
صرف جنسی بدنظمی، بے سود طلاقیں، بے ورثہ و ناجائز اولاد، معاشرتی ابتری اور منافقت
پیدا کرتی ہے۔

میں اس مقالہ کو کپتان آئزیک ٹیلر کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے
انگلستان کی چرچ کانگریس کو خطبہ دیتے ہوئے فرمائے تھے اور جو "ٹائمز" سے ماخوذ ہیں۔

"مسلمان ممالک میں کثیر الازدواجی کے عمل میں نہایت سخت ضبط و نظم برتا جاتا
ہے اور یہ کثیر الازدواجی اس پولی اینڈری کے مقابلہ میں جو یورپی شہروں کی
لعنت ہے اور جو اسلام میں بالکل نہیں پائی جاتی عورتوں کے لئے بہت کم باعثِ
ذلت اور مردوں کے لئے بہت کم باعثِ نقصان ہے۔"

زہیر بن ابی سُلمیٰ[۱]

سوانح حیات اور کلام پر تبصرہ

از ڈاکٹر محمد یوسف صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی استاذ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

زہیر بن ابی سلمیٰ، زمانۂ جاہلیت کے ان تین شعراء میں سے ہے جن کی اولیت پر تمام علمارِ لغت اور جہابذہ شعر نے اتفاق کیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ زہیر اور صفِ اول کے بقیہ دو ساتھیوں یعنی امرؤالقیس اور نابغہ میں کون مقدم ہے۔ اس کا کوئی مختتم جواب آج تک نہیں دیا گیا اور سچ پوچھئے تو دیا بھی نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ اول تو خود شاعر کا مذاقِ طبع اور اس کے فطری رجحانات اس کے ساتھ مخصوص اور دوسرے شعراء سے مختلف ہوتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر اس کی شاعری کی خصوصیات بھی جداگانہ قسم کی ہوتی ہیں اور موازنہ کی اجازت نہیں دیتیں۔ دوسرے مختلف جگہوں کے باشندوں اور پھر ایک ہی جگہ کے رہنے والوں میں بھی ہر فرد کا مذاقِ سخن جداگانہ ہوتا ہے اس لئے کسی ایک شاعر کے متعلق یہ عام رائے قائم ہونا کہ وہ اشعر الشعراء ہے مشکل ہے۔ البتہ یہ بالکل معقول بات ہے کہ تین شاعروں کی بابت یہ اتفاق ہوسکے کہ مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھنے کے بعد تقدم ان کے اندر محصور ہے۔

کلام کی نوعیت کے لحاظ سے زہیر مدح میں اپنا مقابل نہیں رکھتا۔ اس کا کلام خاص طور پر حجاز میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور حجازی لوگ اس کو تمام شعراء پر مقدم مانتے تھے۔

---

[۱] یہ مقالہ عربک لٹریری سوسائٹی کے جلسہ منعقدہ ۲ رفروری ۱۹۵۰ء میں پڑھا گیا۔

زہیر کے جانبداروں میں جو اس کو اشعر الشعراء کہتے تھے حضرت عمرؓ اور مشہور شاعر جریر کے نام
قابلِ ذکر ہیں۔

عربی ادب کا مطالعہ کرتے وقت ایک بڑی کمی جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ شعراء کی
زندگی کے حالات تقریباً بالکل نہیں ملتے۔ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں
وہ چند سطروں یا زیادہ سے زیادہ ایک صفحہ میں آسکتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کی وجہ
سے راویوں نے اپنی دلچسپی اشعار تک محدود رکھی اور صرف ان واقعاتِ زندگی کو یاد رکھا جو یا
غیر معمولی اہمیت رکھتے یا ان کی جانب شاعر کے کلام میں اشارے پائے جاتے ہیں۔

یہی حال زہیر کا ہے۔ زہیر کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ نسب کے اعتبار
قبیلۂ مُزَینہ سے تعلق رکھتا تھا جو کہ مُضَر کی ایک شاخ تھی۔ اس کا پورا نسب نامہ یہ ہے:۔

"زهير بن أبي سلمى رياح بن قرط بن الحارث بن مازن بن خلاوة
بن ثعلبة بن ثور بن هذمة بن لاطم بن عثمان بن عمرو (وهو مزينة)
بن أد بن طابخة بن الياس بن مضر"

زہیر کے والد ابو سلمیٰ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سسرالی تعلقات کی بناء پر بنو
میں جو کہ قبیلہ ذبیان کی ایک شاخ تھی سکونت اختیار کی۔ بعد کو کچھ مالِ غنیمت کی تقسیم میں
اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا کہ وہ کبیدہ خاطر ہو کر واپس چلا گیا اور اپنے قبیلہ مزینہ کی امداد سے
بنو ذبیان پر غارت ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس بارے میں خود اس کے ہم قبیلہ لوگوں نے اس
کے ساتھ کچھ ایسی بے وفائی کا مظاہرہ کیا کہ پھر اس کو ان کے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا اور وہ ان کو
ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر قریب کے ایک اور قبیلہ بنو عبداللہ بن غطفان کے ساتھ جا ملا اور وہیں
رہنے سہنے لگا۔

مندرجہ بالا روایت کی تفصیلات اگرچہ ان میں کوئی بات بعید از قیاس نہیں ہو سکتا ہے
کہ سب کی سب صحیح نہ ہوں، لیکن اس میں تو شبہ کی گنجائش نہیں، اور درحقیقت اتنا ہی ہمارے

یہ مطلب بھی ہے، کہ زہیر کی پیدائش کے وقت ابوسلمی مستقل طور پر اپنے اصلی قبیلہ مزنیہ کے
بجائے بنوعبداللہ بن غطفان کی سرزمین یعنی نجد کے مقام الحاجر میں سکونت پذیر تھا اور وہ بھی
اس طرح کہ اس نے قبیلہ مزنیہ اور اپنے گھرانے کے مابین ہر قسم کے تعلقات منقطع کر رکھے تھے زہیر
نے بھی قبیلہ مزنیہ سے کوئی واسطہ نہ رکھا، اور اپنے آپ کو تمامتر عبداللہ بن غطفان کے ساتھ
وابستہ بنائے رکھا۔ وہ اپنے اشعار میں جابجا عبداللہ بن غطفان کا ذکر کرتا ہے۔ اس قبیلہ کی حمایت
کرتا ہے۔ اس کے مخالفین اور بدخواہوں کو دھمکیاں دیتا ہے اور یہ سب کچھ کامل یگانگت کے
انداز میں، لیکن مزنیہ کا نام تک نہیں لیتا۔ چنانچہ عبداللہ بن غطفان کے ساتھ زہیر کے گھرانے
کی وابستگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوگ مزنیہ کے ساتھ اس کا تعلق فراموش کر جاتے اور ان کا نسب
عبداللہ بن غطفان کے ساتھ ملانے لگے تھے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کعب بن زہیر اپنے کو مزنی
کہتا ہے۔

ھم الاصل منی حیث کنت واننی من المزنیین المصفین بالکرم

(میری اصل وہی ہیں میں جہاں بھی ہوں، بیشک میں مزنیہ والوں میں سے ہوں جو شرافت کی پاکیزگی رکھتے ہیں)

زہیر کی ازدواجی زندگی کے متعلق اس کے اشعار میں ایک دو اشارے پائے جاتے ہیں
وہ نسیب میں عموماً اُمّ اَوفی اور ام کعب کو اپنا مخاطب بناتا ہے۔ ام اوفی اس کی پہلی بیوی تھی اس سے
جو اولاد پیدا ہوئی وہ زمانۂ طفولیت ہی میں مرگئی۔ بعدازاں اس نے ایک اور عورت کبشہ بنت
عمار سے شادی کی جو بنو سُحَیم یعنی قبیلہ بنو عبداللہ بن غطفان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتی تھی اور
جس کو وہ ام کعب کی کنیت سے یاد کرتا ہے۔ ام کعب سے شادی ہونے کے بعد ام اوفی کا جذبہ
حسد و رقابت اس حد تک ابھرا کہ اس نے اپنے شوہر سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی ٹھان لی اور
اس غرض سے اس کو پریشان کرنا شروع کیا۔ بالآخر زہیر نے مجبور ہوکر طلاق دیدی لیکن اس کو
اس بات کا اتنا ہی قلق ہوا جتنا کہ بعد کے زمانے میں عربی ضرب المثل کے مطابق فرزدق نے
نوار کو طلاق دیکر محسوس کیا ہوگا۔ ام اوفی کی جدائی پر زہیر کے دو شعر محفوظ ہیں ان سے اندازہ

ہوتا ہے کہ اس کو ام اوفی کے ساتھ بالکل بے تعلقی نہ تھی۔

لعمرك والخطوب مغيرات　　وفي طول المعاشرة التقالی

تیری قسم زمانہ کے حادثات انسان کو بدل دیا کرتے ہیں اور بہت دن ساتھ رہنے میں کشیدگی پیدا ہو جاتی

لقد باليت مظعن أم اوفى　　ولكن ام اوفى لا تبالی

میرے لئے تو بیشک ام اوفی کی جدائی بہت بڑی بات ہے لیکن ام اوفی کو اس کی کچھ پروا نہیں

برلین کے نسخہ میں دو شعر اور زیادہ ہیں:۔

فاما إذ ظعنتِ فلا تقولى　　لذى صهر أُذِلتُ ولم تُذالی

بہرحال اب جبکہ تو مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے تو کسی میکے والے سے یہ نہ کہنا کہ مجھے تکلیف سے رکھا گیا درانحالیکہ تجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی

أصبتُ بنىّ منك ونلتِ منى　　من اللذّاتِ والحلل الغوالی

میں نے تجھ سے اولاد پائی اور تجھے میری ذات سے بہت سی عیش و آرام اور بیش قیمت کپڑے حاصل ہوئے

ام کعب سے نسبتاً زیادہ لگاؤ ہونے کی ایک ظاہر وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے

تھی۔ ام کعب سے زہیر کے تین لڑکے تھے: کعب، بجیر اور سالم۔ سالم جوانی میں گھوڑے سے گر کر

زہیر نے اس کا ایک مرثیہ بھی کہا جو دیوان (نسخہ برلین B ۸۴ - A ۸۵) میں درج ہے۔ کعب

بجیر نے آگے چل کر اپنے جذبۂ محبتِ اسلام کے باعث کافی نام پیدا کیا۔ زہیر کی ایک

وبرہ کا نام بھی ملتا ہے (برلن B ۸۵)۔

زہیر کے اشعار سے اس کی جن خصوصیات کا پتہ چلتا ہے وہ علمی طور پر اس کی سیرت

جزو تھیں۔ وہ فطرتاً بہت متین، سنجیدہ اور باوقار تھا۔ روزمرہ کے تجربات پر غور و خوض کرنا

ان سے زندگی کے اصول اخذ کرنا اس کا فطری رجحان تھا۔ وہ اپنے فکر اور اعمال میں عام معاد کا

رکھتا تھا جس کو آجکل کی زبان میں ایک اخلاقی معیار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ

ہردلعزیز اور محترم تھا۔ اپنے قبیلہ کا سید اور سردار مانا جاتا تھا، اس کی اصابتِ رائے اور پا

سیرت مسلم تھی۔

کہا جاتا ہے کہ زہیر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر یوں دی تھی کہ جلد ہی کسی ربانی ہدایت کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس نے اپنے بیٹوں کو نصیحت بھی کی تھی کہ وہ اس ہدایت کے پیرو بنیں۔ چنانچہ کعب اور بجیر کے جوشِ اسلامی کا ایک محرک ان کے باپ کی یہ نصیحت بھی تھی۔

زہیر نے کافی طویل عمر پائی۔ اسّی اور نوّے سال تک کے حوالے تو اس کے اشعار میں ملتے ہیں۔ مشہور ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سو سال کا بوڑھا دیکھا تھا اور دیکھکر فرمایا تھا "اللہم أعذنی من شیطانہ"۔ اغلباً زہیر کی وفات ۶۳۱ء یا اس کے آس پاس بعثت رسول اللہ سے کچھ قبل ہوئی۔

زہیر کے گھرانے کی ایک اور خصوصیت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اس گھرانے میں مسلسل کئی نسل تک شاعری کا فن باقی رہا۔ اس کی ابتدا زہیر کے باپ ابو سلمیٰ سے ہوتی ہے جو شاعر تھا۔ زہیر کے ننہال میں بشامۃ بن الغدیر[1] بھی شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور اس کے ادّعا کے مطابق زہیر کو شاعری کا ملکہ اسی سے ملا تھا۔ زہیر کی بہنیں سلمیٰ اور خنسا، اس کے پوتے سعید اور عقبۃ المضرب، اور اس کے پرپوتے السوّار اور العوام (ابنا عقبہ) اور عمرو بن سعید سب کے سب شاعر تھے۔ پرپوتوں نے بادیہ چھوڑ کر بصرہ میں سکونت اختیار کی اور ان کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گھرانے میں شاعری ختم ہوگئی۔ البتہ کچھ زمانہ بعد ایک اور شاعر کا نام الحجاج بن ذی الرقیبہ عبدالرحمٰن بن عقبۃ المضرب ملتا ہے جس کا تذکرہ ابن حزم[2] نے کیا ہے۔

زہیر کی بہن خنسا نے اس کے مرثیہ میں یہ اشعار کہے ہیں:-

وما یغنی توقی المرء شیئاً ولا عقد التمیم ولا الغضار

انسان کی احتیاط کچھ کام نہیں آتی اور نہ تعویذوں کا باندھنا اور نہ سونا چاندی

---

[1] بشامۃ بن الغدیر زہیر کی ماں کا چچا (برلن 8 ۸۰) اور ابو سلمیٰ کا ماموں (اغانی ۹/۱۵۰) تھا۔ بشامۃ کا ایک بھائی اسعد تھا جس نے زہیر سے تقسیم غنیمت کے بارے میں جھگڑا کیا تھا (برلن 8 ۲) [2] جمہرۃ النسب نسخہ بانکی پور نمبر ۲۳۱۷ صفحہ 8 ۵۶)

اذا لاقی منیتہ فامسی یُساق بہ وقد حق الحذار

جب اس کو موت آگئی تو یہ حال ہوا کہ اس کو آگے آگے اٹھائے گئے بیشک عبرت سزاوار ہے

ولاقاہ من الایام یوم کما من قبل لم یخلد قدار

آخر اس کا بھی دن آہی گیا۔ جیسا کہ اس سے پہلے قدار کو خلود نصیب ہو سکا

زہیر کے کلام کے مجموعے | معلقہ کے علاوہ زہیر کا باقی کلام ہم تک مندرجہ ذیل مجموعوں کی صورت میں پہنچا ہے۔

(۱) قدیم ترین مجموعہ السکری (المتوفی ۲۷۵ھ = ۸۸۸ء) کا ہے۔

(۲) ثعلب الکوفی (المتوفی ۲۹۱ھ و ۹۰۴ء) کا مجموعہ مع شرح۔

جرمن اورینٹل سوسائٹی برلن کے خزانہ میں ایک مخطوطہ "مجموعہ دیوان زہیر وابنہ کعب روایۃ السکری" کے عنوان سے پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ دیوان زہیر بروایۃ السکری ہے۔ یہ غلطی ہے۔ صنع السکری صرف دیوان کعب ہے اور دیوان زہیر بروایۃ ابی العباس ثعلب ہے جیسا کہ اسپانیا کے نسخہ میں ہے۔ نیز زہیر کے دیوان کے دو نسخے استنبول میں ہیں جو نسخہ اسپانیا کے مطابق ہیں۔ استنبول کے نسخوں کی دو نقلیں دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہیں، ان سب کے آخر میں قصیدہ دالیہ

"ھل فی تذکر ایام الصبی فند ام ھل مما فات من ایامہ رد" الخ

دار الکتب المصریہ نے ان سب نسخوں سے فائدہ اٹھا کر دیوانِ زہیر کی طباعت شروع کی تھی، معلوم نہیں جنگ کے حالات نے تکمیل کی اجازت دی یا نہیں۔

جرمن اورینٹل سوسائٹی کے نسخہ کی نقل اختصار کے ساتھ میرے استاذ محترم علامہ عبدالعزیز المیمنی کے پاس ہے۔ جس سے میں نے اس مضمون کی ترتیب میں اہم فائدہ اٹھایا ہے۔ "برلن" کا اشارہ اسی نسخہ کی جانب ہے۔

(۳) بعد کو اسپینی عالم الاعلم (المتوفی ۴۷۶ھ و ۱۰۸۳ء) نے ایک مختصر مجموعہ تیار کیا اس میں

اس نے صرف وہ اشعار شامل کیے جو بصری عالم الاصمعی کے نزدیک مستند طور سے زہیر کے کہے جا سکتے ہیں۔ چند قصائد جو اصمعی کے نزدیک مردود لیکن ابو عمرو اور المفضل کے نزدیک ثابت تھے وہ بھی آخر میں ملحق کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ شرح بھی ہے۔ زہیر کے دیوان کے تمام ایڈیشن جو اس وقت تک نکلے ہیں اسی الاعلم کے مجموعہ پر مبنی ہیں۔ سب سے بہتر ایڈیشن وہ ہے جو شیخ عمر السویدی نے ۱۳۰۶ھ میں لیدن سے شائع کیا۔ مشہور مستشرق آلوارد نے لندن سے ۱۸۷۰ء میں الاعلم کی شرح کو حذف کر کے صرف اشعار کا مجموعہ "العقد الثمین فی دواوین الشعراء الجاھلیین" کے ضمن میں شائع کیا اور اس کے ساتھ کچھ اور ابیات کا بھی اضافہ کیا جو مختلف مآخذ میں زہیر کی طرف منسوب پائے جاتے ہیں۔

جرجی زیدان کے بیان کے مطابق جرمن مستشرق Dyroff نے زہیر اور اس کے کلام کی بابت ایک کتاب لکھی ہے جو ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ (افسوس ہے کہ میں اس کتاب سے استفادہ نہ کر سکا)

زہیر کا ماحول زہیر نے نجد کی سرزمین میں بنو عبد اللہ بن غطفان کے درمیان آنکھ کھولی۔ اور تمام عمر وہیں بسر کی۔ اس کے کلام کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دامانِ نظر ہی نجد کی سرزمین تھی۔ غطفان، خیبر اور حدود حجاز سے مشرق کی جانب آجا و سلمیٰ تک آباد تھے۔ ان کے پڑوس میں قبیلہ طے، اسد، ہوازن اور سلیم کی آبادیاں تھیں۔ زہیر اپنے اشعار میں انھیں قبائل کا نام لیتا ہے۔ اسی طرح جن مقامات کے نام اس کے اشعار میں آتے ہیں وہ وہی ہیں جو مذکورہ بالا قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حرثم، قنان، فدک، الدصار، الرس والرسیس وغیرہ

اس کے اشعار میں صرف ایک اہم تاریخی واقعہ کا حوالہ ملتا ہے یعنی حرب عبس وذبیان باقی یا تو ذاتی معاملات ہیں مثلاً ایک شخص الحارث بن ورقاء الاسدی کا اس کے اونٹوں اور یسار نامی غلام کو پکڑ لے جانا یا وہ واقعات ہیں جن کا قبیلہ غطفان کی زندگی سے تعلق ہے۔ مثلاً سلیم اور ہوازن کا غارت ڈالنے کا ارادہ کرنا اور زہیر کا ان کو دھمکیاں دینا۔ حیرہ کے دو بادشاہوں عمرو بن ہند اور النعمان بن المنذر کے نام بھی ملتے ہیں۔

قبیلہ بنو مرہ میں ابی حارثہ کا گھرانہ سرداری کا مالک تھا اور بڑی وقعت و شہرت رکھتا تھا۔ اس گھرانے سے زہیر کے تعلقات بہت گہرے اور خلوص کے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابو حارثہ کے گھرانے کا شاید ہی کوئی فرد ایسا بچا ہو جس کی مدح میں زہیر نے اشعار نہ کہے ہوں۔ ابتداءً زہیر نے سنان بن ابی حارثہ کی مدح میں قصیدے کہے۔ سنان بن ابی حارثہ کا ایک مرثیہ بھی محفوظ ہے البتہ اس کا اصلی ممدوح ہرم بن سنان ہے جس کی مدح اس نے حارث بن عوف بن حارثہ کے ساتھ اپنے معلقہ میں کی ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ہرم نے قسم کھائی تھی کہ جب کبھی بھی زہیر اس کو سلام کرے گا تو وہ اس کو کچھ نہ کچھ صلہ ضرور دے گا۔ چنانچہ اس تکلیف سے بچانے کے لئے زہیر نے سلام کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا " عموا صباحاً غیر ہرم وخیرکم استثنیت "

خارجہ بن سنان کی مدح میں بھی ایک قصیدہ پایا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ یزید بن سنان کا محفوظ ہے ان کے علاوہ ایک قصیدہ حصن بن حذیفہ بن بدر الفزاری کی مدح میں ہے۔

کلام پر اجمالی تبصرہ | اوپر بشامہ بن الغدیر کے اس دعوی کا ذکر گذر چکا ہے کہ زہیر کو شاعری کا ملکہ اس سے ملا۔ لیکن بشامہ بن الغدیر کے الفاظ خود یہ بتاتے ہیں کہ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ جہاں تک پیدائشی استعداد اور صلاحیت کا تعلق ہے۔ وہ زہیر کو اپنے (اور زہیر اپنے باپ کے) ننھال بنو مرہ سے ملی نہ کہ مزینہ سے) بشامہ ایک شاعر تھا۔ اس حیثیت سے اس کو فطرتاً شاعری کا قدرداں ہونا چاہئے۔ اپنے قریبی گھرانے میں ایک نوخیز شاعر کے متعلق اپنے جذبات مسرت اور قدردانی کا اظہار اس نے یوں کیا کہ فخر کے لہجہ میں یہ جتائے کہ یہ صلاحیت زہیر کو اس کی جانب سے ملی ہے۔ لیکن جہاں تک اکتساب اور متاثر ہونے کا تعلق ہے زہیر نے بشامہ سے اخذ نہیں کیا۔

بلکہ اس کا رنگ بہت کچھ اوس بن حجر سے ملتا ہے جس کا کہ وہ راوی تھا۔ اوس بن حجر تمیمی مضر کا ایک مشہور شاعر تھا اور بڑی قدر و منزلت رکھتا تھا اگرچہ بعد کو اس کی قدر و منزلت اس کے دونوں شاگردوں یعنی زہیر اور نابغہ کے سامنے ماند پڑ گئی۔ تاہم جیسا کہ طہٰ حسین کی

تحقیق ہے۔ اوس بن حجر، زہیر، نابغہ، کعب بن زہیر اور زہیر کے شاگرد الحطیئۃ کا ایک اچھا خاصا دبستان ہے جو چند نمایاں خصوصیات رکھتا ہے۔ ان خصوصیات کی ابتدا اوس بن حجر سے ہوئی، بعد والوں نے انھیں اختیار کیا اور ترقی دی۔

اول یہ کہ ان شعرار نے پہلی مرتبہ شاعری کو بحیثیت ایک فن اور صناعت کے سمجھا اور استعمال کیا۔ زہیر کے متعلق مشہور ہے کہ دوسرے شعرار کی طرح جیسے اشعار اس کے ذہن میں آتے تھے وہ ان کو ویسے ہی نہیں پیش کر دیا کرتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً ان پر غور کرتا ان کی تنقیح و اصلاح کرتا۔ اس کے بعد انھیں پیش کرتا۔ اس کے بڑے بڑے قصائد کو "حولیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس لئے کہ ان کی تیاری میں وہ ایک ایک سال صرف کیا کرتا تھا۔ یہ طریقہ اس زمانہ میں ندرت رکھتا تھا۔ اور ایک حد تک کمزوری پر بھی محمول کیا گیا۔

اصمعی کا قول ہے کہ زہیر، خطیئہ اور ان جیسے اور شاعر تو شعر کے غلام ہیں اس لئے کہ وہ شعر کی تنقیح کیا کرتے تھے اور مطبوع شاعروں کے طریقے پر نہیں چلتے تھے۔ لیکن درحقیقت شعر کی تہذیب و ترقی کی طرف یہ ایک بڑا مبارک قدم تھا۔ ابن قتیبہ جب زہیر کو "شاعر متکلف" کہتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ زہیر کو شاعری کا فطری ملکہ نہ تھا یا اس کے کلام میں موجودہ زمانے کے مفہوم میں تصنع اور آورد پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا لینا چاہئے کہ وہ شعر کو جیسا کہ پہلی مرتبہ ذہن میں آئے ایکدم پیش نہیں کر دیا کرتا تھا۔

اسی تنقیح اور اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ زہیر اور اس کے دبستان سے تعلق رکھنے والے دیگر شعرار کے یہاں تشبیہات اور استعارات بکثرت اور بہت اچھے اور اعلیٰ ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تشبیہات اور استعارات کی عمدگی غور اور تامل کی محتاج ہے اسی اعتبار سے زہیر کے طریقہ شعرگوئی کو تہذیب و ترقی کے لئے ایک مبارک قدم شمار کیا گیا ہے۔ طٰہٰ حسین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ عام طور سے یہ جو خیال کیا جاتا ہے غلط ہے کہ صنائع اور حسن بیان کی ابتدار بنو عباس کے دور میں ہوئی اور مسلم بن الولید نے اس کی بنا ڈالی بلکہ اس کی ابتدار تو زہیر اور اس کے ساتھی

ہی کر چکے تھے۔

تشبیہوں سے متعلق ایک بات یہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان میں تقریباً سب کی سب حِسّی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ زہیر کے یہاں تخیّل کی کمی ہے یا وہ صرف ایسی تصویریں پیش کرتا ہے جو حواس کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات اور معانی شعریہ کو مادی اور محسوس صورتوں میں پیش کرنے کا عادی ہے اور اس کی متخیلہ محسوس شکلوں میں کام کرتی ہے یہ بات اوس کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اور اس دبستاں کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ جہاں تک زہیر کا تعلق ہے آگے چل کر اس پر تفصیلی بحث آئے گی۔

زہیر کے مداحین میں سب سے پہلا درجہ حضرت عمر بن الخطابؓ کو حاصل ہے۔ انھوں نے جو وجوہ ترجیح بتلائے ہیں اور زہیر کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ درحقیقت ادبی تنقید کا بہترین معیار ہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ میں زہیر کو اشعر الشعراء اس وجہ سے کہتا ہوں کہ (۱) اس کے کلام میں تعقید اور الجھن نہیں ہوتی۔ (۲) غیر مانوس الفاظ نہیں ہوتے اور (۳) وہ مدح میں وہی کچھ کہتا ہے جس کا کہ ممدوح درحقیقت حامل ہو۔

پہلی دونوں خوبیاں الفاظ سے تعلق رکھتی ہیں اور تیسری معنی سے۔ یہ واقعہ ہے کہ زہیر کا کلام بہت ستھرا، سادہ اور ہر قسم کی پیچیدگیوں سے پاک اور قریب المآخذ ہے جو ایک حد تک شاعر کی غیر معمولی توجہ اور اہتمام کا نتیجہ ہے۔ غیر مانوس الفاظ کی کمی زہیر کے دور کے عام رجحان کا عکس ہے چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں بداوۃ گھٹتی جاتی تھی اور اس کی جگہ حضارۃ لے رہی تھی، سختی درشتی اور اجڈپن کی جگہ نرمی اور ملائمت آرہی تھی۔ زہیر کے دور کا یہ رجحان ضرور تھا لیکن زہیر نے خود بڑی حد تک اس رجحان کو تقویت دی اور عملی طور پر آگے بڑھایا۔ اس کے کلام میں غریب الفاظ بہت کم پائے جاتے ہیں۔

تیسری خوبی جو معنی سے متعلق ہے بڑی ندرت رکھتی ہے۔ زہیر کی شہرت کی اصل بنیاد اس کی مدح پر ہے اور اس کی مدح کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اس میں کہیں جھوٹ اور مبالغہ کو

دخل نہیں دیتا۔ باوجود اس کے مدح نہایت موثر اور کارگر ہوتی ہے اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔
البتہ اس وقت اجمالی طور پر اتنا اور کہنا ہے کہ یہ خصوصیت یعنی ایک قدم حقیقت نگاری اور واقعہ سے تجاوز نہ کرنا زہیر کے پورے کلام میں عام ہے حتیٰ کہ اس کی جھلک نسیب میں بھی نظر آتی ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ زہیر کے یہاں ایک بلند و بالا اخلاقی معیار کا لحاظ بھی پایا جاتا ہے، زہیر جتنا اپنی مدحیات کے لئے مشہور ہے اتنا ہی حکمیات کے لئے بھی۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ عربوں کے یہاں فلسفیانہ شاعری بہت کم پائی جاتی ہے۔ زہیر کے یہاں فلسفہ نہ سہی لیکن کم از کم اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنے تجربات پر غور و فکر کرتا ہے، عواقبِ امور کو سوچتا ہے اور ہر فعل کو اپنے انفرادی خود غرضانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عام مفاد کے نقطۂ نظر سے تولنے کی کوشش کرتا ہے اور یہیں سے ایک برتر اخلاقی معیار اور ایک مافوق الفطرت ہستی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات اوس بن حجر کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ کہ وہ مکارمِ اخلاق کا تذکرہ بہت کرتا ہے۔

نسیب

زہیر کی نسیب عموماً بہت مختصر ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے گذر کر بہت جلد اپنے اصلی مقصد یعنی مدح تک بڑھنا چاہتا ہے البتہ اس کی تشبیب کی چند خاص خاص باتیں قابل ذکر ہیں:۔ وہ عرب کے دستور کے مطابق ابتدا میں محبوب کے مٹتے ہوئے کھنڈرات کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ شعراء عرب کا عام موضوع ہے، ساتھ ہی ساتھ اس میں جدت طرازی کی بہت کم گنجائش ہے۔ چنانچہ زہیر کے یہاں بھی وہی طریقہ بیان اور وہی تشبیہیں پائی جاتی ہیں جو اس ذیل میں مخصوص ہیں، وہ کھنڈرات کی ویرانی کا نقشہ کھینچتا ہے، ان میں انسانوں کے بجائے وحشی جانوروں کی بود و باش کا تذکرہ کرتا ہے۔ مٹتے ہوئے نشانات کو کبھی گودنے کی لکیروں اور کبھی "رق محیل" (پرانے مکتوب کے کچھ مٹے ہوئے حروف) سے تشبیہ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ، نیز اپنے ان جذبات اور وجدانی کیفیات کا اظہار کرتا ہے جو ان کھنڈرات کو دیکھکر اس کے رنجور دل میں پیدا ہوتی ہیں۔

زہیر کے یہاں محبوب کی روانگی اور جدائی کے اوقات کی بہت موثر اور مکمل تصویریں ملتی ہیں، عربوں کی خانہ بدوش زندگی میں اکثر ایسے مواقع پیش آتے تھے کہ دو قبیلے کچھ عرصہ ایک چراگاہ کے

اردگرد رہنے کے بعد آب وگیاہ ختم ہونے پر مختلف سمتوں میں جدا ہو جاتے۔ جدائی کے وقت کا
سماں قدرتی طور پر دونوں قبیلوں کے ان نوجوانوں کے دلوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مرتسم ہو جاتا جن کے
درمیان اس عرصہ میں عشق ومحبت کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ چنانچہ ہر عربی شاعر کے ذہن میں
محبوب کے کھنڈرات پر آنسو بہانے کے بعد اس یوم مفارقت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جبکہ اس نے
اپنی محبوبہ کو رنگین ہودج میں سوار نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

زہیر اس میدان میں اپنے مقابل شعرا پر صاف سبقت لے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ
بڑی تفصیل اور تاثیر کے ساتھ محبوبہ کے قبیلہ میں کوچ کے مشوروں کا تذکرہ کرتا ہے پھر دکھاتا ہے کہ سردار
کے حکم پر چار وناچار کوچ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اونٹوں کے اوپر ہودج کسے ہوئے ہیں، ان پر رنگین
پردے پڑے ہوئے ہیں انھیں میں سے ایک ہودج میں اس کی محبوبہ رخصت ہوتی ہے۔ یہ ایک جگہ
کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ اور نظروں سے تعاقب کرتا جاتا ہے۔ جب قافلہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا
ہے تو بھی وہ اپنی دلچسپی قائم رکھتا ہے۔ قافلہ کے راستہ میں جو مقامات اور حالات پیش آتے ہیں
سب کی خبر رکھتا ہے اور آخر میں ایک مرتبہ پھر بے چارگی اور مجبوری کا اظہار کرتا ہے کہ محبوبہ
ایک دور دراز مقام پر پہنچ گئی ہے جس کے درمیان لق ودق صحرا اور بے آب وگیاہ ریگستان
حائل ہیں اور اس کے دیدار کے حصول کی کوئی تدبیر ممکن نہیں:۔

ردّ القیان جمال الحیّ فاحتملوا　　　الی الظہیرۃ امر بینہم لبکُ

لونڈیاں جاکر قبیلہ کے اونٹوں کو چراگاہ سے واپس لے آئیں اور وہ سب لوگ کوچ کر گئے بعد اسکے کہ دوپہر تک وہ اس مسئلہ میں الجھے رہے

ما ان یکاد یخلیہم لوجہتہم　　　تخالج الامر ان الامر مشترک

وہ ایک بات پر متفق ہی نہ ہوتے تھے اور ان کا اختلاف رائے ان کو چھوڑتا ہی نہ تھا کہ وہ منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوں

تبصر خلیلی ہل تری من ظعائن　　　تحملن بالعلیاء من فوق جرثم

اے دمساز! دیکھ تو کیا تجھ کو علیاء کی سرزمین میں وہ ہودج سوار نازنینیں دکھلائی دیتی ہیں جو جرثم کے
اوپر سے ہوتی ہوئی کوچ کر گئیں۔

علون بانماط عتاق وکلة　　ورادحواشیها مشاکهة الدم

انھوں نے اعلیٰ قسم کے نمدے ڈال رکھے تھے اور ایسے گلابی پردے لگا رکھے تھے جن کے کنارے خون کی طرح نظر آتے تھے

مازلت ارمقهم حتی اذا هبطت　　ایدی الرکاب بهم من راکس فلقا

میں برابر ان پر نظریں جمائے رہا، یہانتک کہ جب اونٹ ان کو لیکر راکس کی پست زمین میں اتر گئے۔

دانیة لشروری او قفا ادم　　تسعی الحداة علی آثارهم حزقا

اور شروری یا ادم کی پشت کے قریب پہنچے اس حال میں کہ حدی خواں ان کے پیچھے پیچھے ٹکڑیاں بنا کر چل رہے تھے

کان عینی فی غربی مقتلة　　من النواضح تسقی جنة سحقا

تو میری دونوں آنکھوں کا یہ حال ہوا کہ گویا دو بھرے ہوئے ڈول تھے جو ایک محنت کی ماری پانی کھینچنے والی اونٹنی پر

لدے ہوں اور وہ دور دور کے باغوں کو سیراب کرتی جاتی ہو۔

زہیر کی نسیب کے دو اہم جزو وہی تھے جو بیان ہوئے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ معشوق کے ظاہری حسن کا بہت کم بیان کرتا ہے حالانکہ دیگر شعرا اس موضوع پر خوب خوب اپنے کمال کا ثبوت دیتے ہیں۔ اکثر تو زہیر معشوق کے حسنِ ظاہری کو بالکل نظر انداز ہی کر جاتا ہے۔ اس کے مشہور معلقہ کی نسیب صرف کھنڈرات اور فراق کے ذکر پر مشتمل ہے۔ زہیر کے کل کلام میں معشوق کے ظاہری خدوخال کے بیان کی دو مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ معشوق کی تعریف کرتے وقت بھی زہیر اپنے کلام کو تصنع اور دور از کار مبالغہ سے پاک رکھتا ہے۔

قامت ترااای بذی ضالٍ لتحزننی　　ولا محالة ان یشتاق من عشقا

وہ جھاڑیوں کے درمیان کھڑی ہوئی اپنا جلوہ دکھاتی رہی تاکہ میرے حسرت و غم کو ابھارے اور عاشق کے جذباتِ شوق کا بھڑک اٹھنا تو ایک لازمی بات ہے

بجید مغزلة أدماء خاذلة　　من الظباء تراعی شادنا خرقا

اس کی گردن ایسی تھی جیسی کہ ایک سفید ہرنی کی جو اپنے گلہ سے پیچھے رہ گئی ہو اور (گردن اٹھا اٹھا کر) اپنے چھوٹے نو آموز بچہ کی نگہبانی کر رہی ہو

کان ریقتها بعد الکری اغتبقت　　من طیب الراح لما یعد ان عتقا

سو کر اٹھنے پر اس کا لعابِ دہن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بہت اعلیٰ قسم کی شراب نوش کر لی جو ہنوز کہنگی کے حدود سے متجاوز نہ ہوئی ہو (یعنی بگڑ گئی ہو)

مدیح | زہیر کی شہرت کا دار و مدار اس کی مدحیات پر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مدیح زہیر ہی کا حق ہے
اس کی مدیح کا سب سے اچھا وصف یہی ہے کہ وہ کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کے ممدوحین
کی جانب سے اس کو گرانقدر انعامات ملے تاہم اس کی مدح گوئی بے غرض اور بے لوث رہی اس
کی مدیح کو پڑھنے کے بعد مجموعی اثر یہی ہوتا ہے کہ وہ ممدوح کو خوش نہیں کرنا چاہتا بلکہ ایک زندہ
مثال پیش کر کے اس اچھی صفت کو جو اس میں پائی جاتی ہے دوسرے لوگوں کے نزدیک قابل قدر
اور محبوب بنانا چاہتا ہے۔ وہ جھوٹ اور دور از کار مبالغوں اور تشبیہوں سے مدد لئے بغیر اپنی
مدیح کو موثر بنا سکتا ہے۔ اس کی مدیح خوبی بیان اور جامعیت کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ صرف
دو تین اشعار میں تمام مکارم اخلاق کا استیعاب کر لیتا ہے نیز ہر وصف کو اجاگر کرنے کے لئے
جو حالات ضروری ہیں ان کا استقصار کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی الفاظ کا نظم اور اختصار بھی باقی
رہتا ہے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

وفیہم مقامات حسان وجوھہم وانديۃ ینتابھا القول والفعل

ان (ممدوحین) میں ایسے ارباب مجالس ہیں جن کے چہرے روشن ہیں اور ان کی محفلوں میں قول اور فعل دونوں باری باری آتے ہیں (یعنی نیک

علی مکثریھم رزق من یعتریھم وعند المقلین السماحۃ والبذل

ان میں سے صاحب ثروت لوگوں پر ہر آنے والے کی پرورش فرض ہے اور جو لوگ کم دولت ہیں ان میں بھی سخاوت اور بخشش کی صفت

وان جئتھم الفیت حول بیوتھم مجالس قد یشفی باحلامھا الجھل

اگر تم ان کے پاس جاؤ تو تمہیں ان کی فرودگاہوں کے ارد گرد ایسے جمگھٹے نظر آئیں گے جہاں کی عقل و دانائی سے اکثر جہالت کا علاج ہو جاتا

وان قام فیھم حامل قال قاعد رشدت فلا غرم علیک ولا خذل

اگر ان میں کوئی ایک شخص کھڑے ہو کر کوئی ذمہ داری لے لے تو سب کے سب بیٹھے ہوئے لوگ کہا اٹھتے ہیں کہ "بالکل ٹھیک ہے
تیرے اوپر کوئی تاوان نہیں اور تیرا ساتھ نہیں چھوڑا جائے گا"

اخی ثقۃ لا یتلف الخمر مالہ ولکنہ قد یھلک المال نائلہ

وہ ایک بھروسے والا انسان ہے شراب اس کے مال کو تلف نہیں کرتی بلکہ بخشش اس کے مال کو ہلاک کرتی ہے

تراه اذا ما جئته متهللا　　　کانك تعطيه الذى انت سائله

جب کبھی کہ تم اس کے پاس جاؤ تو تم اس کو ایسا ہشاش بشاش پاؤ گے گویا کہ تم اس سے مانگنے کے بجائے وہی چیز اس کو دے رہے ہو

وذی نسب ناء بعید وصلته　　　بمال وما یدری بانك واصله

اور اے ممدوح! بہت سے دور کے قرابت والے ہیں کہ جن کے ساتھ تو نے اپنے مال سے بھلائی کی ہے حالانکہ ان کو خبر تک نہیں کہ ان کے ساتھ بھلائی کرنے والا تو ہے (مطلب یہ ہے کہ ممدوح کی بخشش کا اثر واسطہ در واسطہ دور تک پہنچتا ہے یہاں تک کہ لوگ اس کے اصلی سرچشمہ کو بھول جاتے ہیں)

ومن مثل حصن فی الحروب ومثله　　　لانكار ضیم أو لأمر یحاوله

اور کون ہے جو لڑائیوں میں ظلم و زیادتی کا مقابلہ کرنے میں اور اپنے منصوبوں کی تکمیل میں حصن کا جیسا ہو؟

جیسا کہ ابو الفرج نے بتایا ہے موخر الذکر قطعہ میں زہیر نے اپنے ممدوح کے لئے عفت، سخاوت، شجاعت، عقل اور عدل کی تمام صفات جن میں کہ فضائل کو منحصر قرار دیا گیا ہے، ثابت کر دی ہیں۔ یہ در حقیقت بڑا کمال ہے۔ نیز اس نے کس ساتھ کے اشعار میں مختلف صفات کی مناسب توضیح بھی کی ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے۔

ان تلق یوما علی علاته هرما　　　تلق السماحة منه والندی خلقا

اگر تو کبھی برے دنوں میں بھی ہرم کے پاس جائے تو جود و سخا کا وصف تو اس میں برابر پائیگا

ولیس مانع ذی قربی وذی نسب　　　یوما ولا معدما من خابط ورقا

وہ قرابت والوں اور رشتہ داروں سے کبھی ہاتھ نہیں روکتا اور نہ وہ کبھی کسی مفلس بے وسیلہ کو رد کرتا ہے

لیث بعثر یصطاد الرجال اذا　　　ما کذب اللیث عن اقرانه صدقا

وہ عثر کا شیر ہے جو انسانوں کا شکار کرتا ہے اور ایسے موقع پر جبکہ شیر بھی اپنے حریف سے مات کھا جاتا ہے وہ برابر ثابت قدم رہتا ہے

یطعنهم ما ارتموا حتی اذا طعنوا　　　ضارب حتی اذا ما ضاربوا اعتنقا

جب دشمن تیر اندازی کرتے ہیں تو وہ آگے بڑھ کر نیزہ چلاتا ہے اور جب دشمن نیزہ بازی شروع کرتے ہیں تو وہ اور آگے بڑھ کر تلوار چلاتا ہے اور جب دشمن تلوار چلاتا ہے تو وہ ان سے لپٹ جاتا ہے

هذا ولیس کمن یعیی بخطته　　　وسط الندی اذا ما ناطق نطقا

یہ ہیں میرے ممدوح کی صفات۔ میرا ممدوح ایسا نہیں کہ جب بھری محفل میں بولنے والے بول رہے ہوں تو اس کو اپنا راستہ نظر نہ آئے

لو نال حی من الدنیا بمنزلة افق السماء لنالت کفه الأفقا

اگر دنیا میں کوئی انسان بلندی رتبہ سے افق آسمان تک پہنچ سکتا تو یقیناً ممدوح کا ہاتھ افق کو چھو لیتا۔

آخری شعر قابلِ غور ہے۔ اگر متاخرین میں سے کوئی شاعر ہوتا تو وہ ضرور یہ کہتا کہ ممدوح نے افق کو پا لیا ہے۔ متنبی نے تو چاند کو ممدوح کے جوتے کا تلا بنا دیا ہے۔

حکمیات مدحیات کے بعد زہیر اپنی حکمیات کے لئے ممتاز ہے۔ یہ ایک مقررہ بات ہے کہ فلسفیانہ شاعری اسی وقت ظہور میں آتی ہے جبکہ حضارۃ اور تمدن ترقی کرتے ہیں۔ غور و فکر کی عادت انسان میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ وہ اپنی طبعی ضروریات سے بے نیاز ہو کر کچھ وقتِ فرصت کا نکال سکے۔ دورِ جاہلیت میں عرب بالکل بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے تمام اوقات کسبِ معاش میں صرف ہوتے تھے۔ اس لئے طبعی اور معاشی حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے فلسفیانہ شاعری کا فقدان پایا جاتا ہے۔ زہیر کے یہاں بھی مابعد الطبیعاتی مسائل یا خالص فلسفی نظریات تو نہیں البتہ اس کی حیثیت ایک ایسے سن رسیدہ اور جہاں دیدہ بزرگ کی ہے جو روزمرہ کے تجربات پر غور و خوض کر کے کچھ اصولِ زندگی وضع کرتا ہے اور انہیں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ وہ ان سے مستفید ہوں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ومن لا یصانع فی امور کثیرۃ یضرّس بأنیاب و یُوطا بمنسم

جو شخص کہ بیشتر باتوں میں نرمی اور مدارات سے کام نہیں لیتا وہ دانتوں سے پیس دیا جاتا ہے اور پیروں سے کچل دیا جاتا ہے

ومن یجعل المعروف من دون عرضہ یفرہ ومن لا یتق الشتم یشتم

جو شخص کہ احسانات کے ذریعہ اپنی آبرو کو بچاتا ہے اس کی آبرو بڑھ جاتی ہے اور جو خود گالی گلوچ سے نہیں بچتا اس کو برا بھلا سننا پڑتا

ومن لا یذد عن حوضہ بسلاحہ یھدّم ومن لا یظلم الناس یظلم

جو ہتھیاروں سے اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کرتا اس کے حقوق پامال کر دیئے جاتے ہیں اور جو دوسروں پر ظلم کرنے کی تیاری نہیں رکھتا اسی پر ظلم کیا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

ادبیات

کلامِ بدر

ازجناب بدر جلالی بی۔اے سابق ایڈیٹر اخبار "مدینہ"

رنگ یہ موجیں ترے پیمانے کی — سرخیاں پیرِ مغاں ہیں مرے افسانے کی

ن اپنی خود آرائی سے فرصت پاکر — دیکھ لو آکے تباہی مرے کاشانے کی

بالذات تھا پروانے کا مقصودِ حیات — اس نے فرصت بھی اگر پائی تو جل جانے کی

مجھکو بھلادے یہ بھلاوا دے کر — یاد اب تک ہے ادا آپ کے آجانے کی

بدرؔ بیچارہ نے نیکی کا بھی پایا نہ بدل
لوگ کہتے ہیں بدی کا بھی ہے بدلہ نیکی
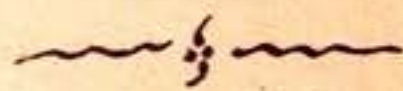
ل کچھ بھی رہتے جو اُن کے قدم کے — ضرور آتے پھر کر مسافر عدم کے

نے کے چکر یہ قسمت کی گردش — اشارے کسی زلفِ پُرپیچ و خم کے

یا میری مجبوریوں کے فسانے — نہ تیرے کرم کے نہ تیرے ستم کے

کشتیٔ عمر کے بادباں ہیں — تھپیڑے نہیں ہیں یہ موجِ الم کے

خود مختصر نامۂ شوق کرتا — نہیں رُکتے لیکن یہ آنسو قلم کے

یہ کیا جانیں شمع محبت کی لاگیں
یہ ہیں بدرؔ پروانے شمعِ حرم کے

Writings and Speeches of Moulana Mohd Ali

مرتبہ جناب افضل اقبال صاحب ایم۔ ا
تقطیع متوسط ضخامت ۴۸۵ صفحات ٹائپ

قیمت عللہ روپیہ پتہ:۔ شیخ محمد اشرف صاحب پبلشر کشمیری بازار لاہور۔

مولانا محمد علی مرحوم اُن خوش نصیب انسانوں میں سے تھے جنھیں قدرت دل اور دماغ
کی بھلائیوں اور خوبیوں سے حصۂ وافر عطا فرماتی ہے وہ ایک طرف میدانِ حریت و آزادی ـ
ایک نہایت بہادر اور جری شہسوار تھے تو دوسری جانب انگریزی زبان کے پرجوش و پرزور مقرر
انشا پرداز بھی تھے۔ اگرچہ سیاسی جدوجہد اور عملی مصروفیتوں کی وجہ سے مرحوم کو کوئی مستقل
لکھنے کا موقع نہیں ملا، تاہم "کامریڈ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہزاروں صفحات کی تحریریں جو انگ
ادب و انشا میں مختلف حیثیتوں سے اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں ان کے قلم سے نکلیں
افسوس ہے کہ یہ اب تک اخبارات کے صفحات میں منتشر پڑی ہوئی تھیں۔ شیخ محمد اشرف صاحب
جنھوں نے چند سالوں میں انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر کا ایک بڑا عمدہ اور مفید ذخیرہ جمع کر
لائق مبارکباد ہیں کہ موصوف نے فاضل مرتب کی مدد سے مولانا مرحوم کی چند منتخب تحریروں ا
تقریروں کو دیدہ زیب کتاب کی شکل میں شائع کرکے محفوظ کر دیا۔ ان تحریروں اور تقریروں کا مو
اگرچہ ہنگامی اور وقتی مباحث ہیں اور پھر ان کو لکھا بھی گیا ایک اڈیٹر یا لیڈر کی حیثیت سے
اس بنا پر کسی محققانہ تصنیف کی نظر سے اس کو جانچنا اور پرکھنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ یہ مجموعہ ا
حیثیت سے بہت زیادہ لائقِ قدر ہے کہ یہ اس عظیم و جلیل شخصیت کے افکار و خیالات پر مشتمل ہے
جس کا نام بیش از بیش قربانیوں اور مختلف قسم کے ذہنی اور علمی کمالات کی وجہ سے ہندوستا
کی موجودہ بیداری کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے اور جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ علاوہ بریں زور بیا

ب کلام، وسعتِ معلومات، اسلوبِ نگارش کی جدت ورنگارنگی کے باعث یہ مجموعہ انگریزی
، وادب کے طلبار کے لئے بہت کام کی چیز ہے۔

جنابِ ناشر سے یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے بقیہ مضامین ومقالات جو
ی کامریڈ کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں اسی طرح شائع کریں گے۔

Iqbal as a Thinke | تقطیع متوسط ضخامت ۳۰۰ صفحات ٹائپ جلی اور روشن
ت پانچ روپیہ پتہ:۔ شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار لاہور

یہ کتاب چند مقالات کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کے متعدد اربابِ علم وادب نے ڈاکٹر اقبال
کی شاعری اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی میں لکھے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
"اقبال کا تصورِ زمان ومکان"، خواجہ غلام السیدین نے "اقبال کے فکر میں ترقی پسندانہ رجحانات"
ریف صاحب ایم۔ اے (کینٹب) نے "اقبال کا تصورِ خدا" ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے
ی، نٹشے اور اقبال"، پروفیسر فضل الرحمٰن نے "اقبال اور تصوف" ڈاکٹر عزیز احمد نے
بال کا سیاسی نظریہ"، پروفیسر کلیم الدین احمد نے "فنونِ لطیفہ کے متعلق اقبال کا تصور" پر
یق دی ہے۔

یہ تمام مقالات نہایت سنجیدہ، محققانہ، پراز معلومات اور مفید وبصیرت افروز ہیں،
ہر مقالہ بجائے خود ایک کتاب ہے۔ البتہ سب سے آخر میں فیاض محمود صاحب کا مقالہ
بال کا رویہ خدا کے متعلق" تشنہ ونا تمام ہے۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اقبال کا فکر اگرچہ مربوط ومسلسل اور مرتب ومہذب تھا
ن اس کے باوجود بعض اشعار ان کے قلم سے ایسے بھی نکل گئے ہیں جن کو ہم محض ایک "شاعرانہ
" یا اسی مناسبت سے "رندانہ جرأت" کہہ سکتے ہیں۔ اس کو اقبال کے مربوط افکار کا جزر
ر دینا صحیح نہ ہوگا۔

لمات افلاطون | مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب تقطیع متوسط ضخامت ۷۵۴ صفحات

کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد پانچ روپیہ وغیر مجلد چار روپیہ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) د

سقراط یونان کا مشہور بلند پایہ فلسفی ہے۔ افلاطون اسی کا شاگرد تھا۔ سقراط کا

تعلیم یہ تھا کہ وہ یونان کی ورزش گاہوں، تفریح خانوں اور اسی قسم کی لوگوں کے جمع ہو

جگہوں پر پہنچ جاتا اور وہاں لوگوں سے بات چیت شروع کر دیتا۔ مختلف چیزوں کی نس

پہلے خود سوال کرتا تھا اور جو جواب ملتا تھا اس پر منطقی اصطلاح میں معارضہ یا نقض وارد کر

اس طرح جب مجیب لاجواب ہو جاتا تو اب سقراط خود اپنے فلسفیانہ افکار و نظریات کی روشن

اس چیز کی حقیقت پر مدلل بحث کرتا تھا۔ سقراط نے اپنے فلسفہ اور خیالات کو اسی طرح عوام

پہنچانے کی کوشش کی اور دوسرے فلاسفہ کی طرح کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ سقراط کی حیر

و عبرت آموز موت کے بعد اس کے تلمیذ رشید افلاطون نے جہاں اور کتابیں لکھیں، مکالم

افلاطون کے نام سے بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کتاب کے آٹھ مکا

کا اس کے انگریزی ترجمہ کے واسطہ سے اردو ترجمہ ہے۔

ان مکالمات میں افلاطون نے دراصل محبت، نیکی اور علم وغیرہ کے متعلق اپ

سقراط کے ہی خیالات و افکار کی اسی کے انداز میں ترجمانی کی ہے۔ ترجمہ کی خوبی اور عمدگی

فاضل مترجم کا نام کافی ضمانت ہے۔ ان مکالمات کا خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ فلسفیانہ مطالب

آسان اور دلچسپ پیرایۂ بیان میں ادا کئے گئے ہیں۔ جس سے اس زمانہ کے یونانی ادب پر بھی

پڑتی ہے۔ اس بنا پر یہ کتاب گویا فلسفہ کا فلسفہ ہے اور ادب کا ادب۔ اربابِ ذوق کے لئے

مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اسلام اور سود | از ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن

صفحات ۲۴۰۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ معاشیات فاطمہ منزل، حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن

ڈاکٹر انور اقبال علم المعیشت کے ماہر، جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات کے صدر اور م

مسائل پر چند دوسری کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی جدید تصنیف "اسلام اور سود" ہے۔

پر مشتمل ہے۔ سود کے مغربی نظریے، سود کا اسلامی نظریہ، سود اور ربا، اسلام اور بنک کاری، معاشرت پر ربا کے اثرات، معین شرح کے قرضوں کے برے اثرات۔

کتاب اپنی افادیت کے لحاظ سے لائق تحسین اور قابلِ مطالعہ ہے۔ اور سب سے اہم اور نمایاں پہلو جو دراصل کتاب کی روح ہے یہ ہے کہ آج تک قدیم وجدید تعلیم یافتہ حضرات یہ سمجھ رہے تھے کہ موجودہ معاشی مسائل میں سود کے لئے ایک خاص جگہ ہے اور وہ لین دین میں اس کی افادیت ظاہر ہے لہٰذا اسلام اگر سود کو حرام قرار دیتا ہے تو ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اسلام کی جانب سے ایسا دفاع پیش کریں جس سے اس کی مضرت اس کی افادیت سے زیادہ نمایاں نظر آنے لگے۔

علمی حلقہ میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر قریشی نے سود کے جدید نظریات کے علمی اور عملی پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے ماہرینِ معاشیاتِ جدید کی آرا اور ان کے فیصلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ نظامِ معاشی کے ابتدائی دور سے لے کر موجودہ دور تک خود جدید علم المعیشت میں سود کا مفید ہونا غیر طے شدہ امر ہے بلکہ اکثر ماہرین کا رجحان یہ ہے کہ معاشی نظام میں "سود" کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور وہ یقین کرتے ہیں کہ معاشی ترقیات کا آخری ارتقائی پہلو شرح سود کو صفر تک لے آنے میں کامیاب ہو کر رہے گا۔ بلاشبہ مصنف کی یہ کاوش مستحق تحسین و تبریک ہے اور اس بحث نے کتاب کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔

البتہ "سود کا اسلامی نظریہ" اور "سود اور ربا" کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اپنی افادیت کے باوجود تشنہ ہے۔ سود کے متعلق اسلامی نظریہ کی وضاحت کے لئے ازبس ضروری ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ متعلقہ حرمتِ سود کے تمام اطراف وجوانب کو روشنی میں لایا جائے اور پھر یہ ثابت کیا جائے کہ سود سے متعلق اسلام کا دور رس فیصلہ نظامِ معاشیات کی بہتری کے لئے کس درجہ صحیح اور مبنی بر حقیقت ہے۔

گاؤں سدھار گیت | تقطیع خورد ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت درج نہیں

پتہ:۔ آزاد بکڈپو۔ کوچہ چیلاں دہلی۔

جناب شفیع الدین صاحب نیر بچوں اور بچیوں کے شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ موصوف نے اب گاؤں سدھار کی طرف بھی توجہ کی ہے چنانچہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آپ کی یہ کتاب ان گیتوں کا مجموعہ ہے جو آپ نے گاؤں والوں کی اصلاح وفلاح کے لئے لکھے ہیں۔ ان گیتوں میں بھی نیر صاحب کے طرزِ تصنیف کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ زبان نہایت سہل اور آسان جسے ہر اجڈ گنوار بھی سمجھ جائے۔ اندازِ بیان ایسا دلچسپ اور دلنشین کہ تین چار مرتبہ کے پڑھنے سے ہی پورا گیت یاد ہوجائے۔ پھر مضمون کے اعتبار سے ان گیتوں میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو گاؤں والوں کو صحت وتندرستی، صفائی وستھرا پا۔ اور اخلاق ومذہب کا سبق پڑھانے کے لئے ضروری ہیں۔ اس کا تعارف جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ نے لکھا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ لائق مصنف نے یہ گیت لکھے ہی موصوف کی فرمائش پر ہیں ہمیں امید ہے گرام سدھار انجمنیں ان گیتوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر گاؤں گاؤں پھیلانے کی کوشش کرینگی۔

موت العالم موت العالم

متوسلین سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کو یہ معلوم کرکے بڑا افسوس ہوگا کہ حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب نقشبندی مجددی نے جو حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور خلیفہ مجاز اور اس سلسلہ کے اکابر مشائخ میں سے تھے ۔ ۵ر جولائی ۱۹۴۵ء کو نماز ظہر کے وقت میرٹھ لال کرتی میں رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون حضرتِ مرحوم کے متوسلین سے توقع ہے کہ وہ حضرتِ مرحوم کی روح پرفتوح کو ایصالِ ثواب کرکے داخلِ حسنات ہوں گے۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے

سنہ ۱۹۳۹ء :- اسلام میں غلامی کی حقیقت، مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب ۔ قیمت ۲ ؎ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام، اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲ ؎ مجلد للعہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ قیمت تین روپے مجلد چار روپے۔

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۱۲

سنہ ۱۹۴۰ء :- نبی عربی صلعم ۔ تاریخ ملت کا حصہ اول، جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے ۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن :- جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے اپنے رنگ کی بے مثل کتاب عہ مجلد ہے

غلامانِ اسلام :- پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان ۔ قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق :- علم الاخلاق پر ایک محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے، قیمت صہ مجلد ہے

سنہ ۱۹۴۱ء :- قصص القرآن حصہ اول جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع ۔ قیمت صہ مجلد ہے

وحی الٰہی ۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب ۔ قیمت دو روپے مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات ۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ۔ قیمت عہ

تاریخ انقلاب روس، ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ ۔ قیمت عہ

سنہ ۱۹۴۲ء :- قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام :- وقت کی اہم ترین کتاب ۔ جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے ۔

تیسرا ایڈیشن زیر طبع قیمت غیر مجلد للعہ مجلد پانچ روپیہ

خلافتِ راشدہ :- تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر مجلد ۲/۱۲

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن زیر طبع۔ قیمت عہ مجلد ۱۲/۴

۱۹۴۳ء :- مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب۔ قیمت ۶ر مجلد للعہ

سرمایہ :- کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ۔ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت :- صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ قیمت للعہ مجلد مئعہ

خلافتِ بنی امیہ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ۔ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۳ر مجلد ۲/۱۲

۱۹۴۴ء :- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت۔ جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب۔ انداز بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ جلد ثانی۔ قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم :- کتاب کے اس حصہ میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کی مکمل تشریح و تفسیر کی گئی ہے۔ قیمت للعہ مجلد ۵ر

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی قیمت ۶ر مجلد للعہ

۱۹۴۵ء کی کتابوں میں "قرآن اور تصوف" مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی طبع ہو چکی ہے۔ عنقریب حضرات محسنین و معاونین کی خدمت میں روانہ کی جائیگی۔

قصص القرآن جلد چہارم پریس کو جا رہی ہے باقی دو کتابوں کا اعلان بعد کو کیا جائے گا۔

کتابوں کے تفصیلی تعارف کے لئے فہرستِ کتب مفت طلب فرمایئے۔ اس سے آپ کو ادارے کے حلقہائے محسنین و معاونین و احبار میں شامل ہونے کے قوانین بھی معلوم ہوں گے۔

فیس حلقۂ محسنین ۲۵ صہ، حلقۂ معاونین ۱۸ صہ حلقہ احبار للعہ محسنین و معاونین کو تمام مطبوعات ادارہ مع رسالہ برہان بغیر قیمت دی جاتی ہیں اور احبار کو نصف قیمت پر۔

مینیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

سنہ ۴۲ء: قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں

قیمت ہے مجلد ہے

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

سنہ ۴۳ء: مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت عہ روپے مجلد سات روپے۔

خلافتِ بنی امیہ: تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات۔ عہ مجلد

سنہ ۴۴ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

سنہ ۴۵ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دلنشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الاولیاء مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد ہے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء کے حالات مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ہے

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) محسنِ خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱/ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل
دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے مح
معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ؎ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ؎ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۳۹ء نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد ہے

غلامانِ اسلام:۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اس[لام] کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں [کا] تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفہ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک بس[یط] اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انو[اعِ] اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی قیمت صہ مجلد ہے

۱۹۴۰ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتا[ب] زیر طبع قیمت صہ مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ؎

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستن[د] اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

بُرہان

جلد پنجدہم شمارہ (۲)

شعبان المعظم ۱۳۶۴ھ مطابق اگست ۱۹۴۵ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اکبر! قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی کس قدر عجیب وغریب اور حیرت انگیز ہیں کہ جس طرح عقلِ انسانی ان کی گرہ کشائی سے آج سے صدیوں پہلے عہدِ جاہلیت میں عاجز و درماندہ تھی۔ آج جبکہ اس نے فطرت کے اسرار ورموز کو اپنے پنجۂ تدبیر سے بڑی حد تک برافگندۂ نقاب کردیا ہے۔ ایسی ہی عاجز وبے بس ہے۔

غور کیجئے تو تاریخ نے گذشتہ چند دنوں کی ایک کروٹ میں ہی انقلاب وتغیر کی ایسی دور دراز منزلیں طے کرلی ہیں جو صدیوں میں بھی طے نہیں ہوئیں۔ اور اس مختصر مدت میں دنیا کے پردۂ وجود پر ان واقعات وحوادث نے ظہور کیا ہے جو قرنوں میں بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ سوچنے اور سمجھنے والوں کے لئے ان واقعات وحوادث کی کتاب کا ایک ایک صفحہ۔ اور اس صفحہ کی ایک ایک سطر عبرت وبصیرت کی ہزاروں داستانیں سنا رہی ہے۔ اور انسانی قلب ودماغ کو ایک مسلسل مگر پائیدار درسِ نصیحت وموعظت دے رہی ہے۔ فھل من مدکر۔

کون نہیں جانتا چند ہی مہینوں کی بات ہے۔ موجودہ دنیا کی وہ عظیم ترین شخصیت جس کو لوگ پریسیڈنٹ روزولٹ کے نام سے جانتے تھے اور جس کے دبدبۂ وشوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کی چشمِ کرم والتفات کی ایک جنبش نے برطانیہ عظمیٰ کی بدنصیبی کو خوش نصیبی سے اور مایوسی وناکامی کو فتحمندی وکامرانی سے بدل دیا تھا۔ بالآخر جب قدرت کے محکمۂ قضا سے خود اس کے لئے فرمانِ اجل صادر ہوا تو ذرا بھی دیر نہ لگی اور وہ دم کے دم میں موت کا شکار ہوگیا۔ فیشسٹ نظامِ حکومت کا وہ عفریت قہر سامان (مسولینی) جس کے کام ودہن سے نکلا ہوا

ایک ایک سانس عالم کے کارخانۂ امن وامان میں ہلچل پیدا کر دیتا تھا۔ آخر کار اس کا حشر یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہی ملک کی سرزمین پر خود اپنی ہی فوج کے سپاہیوں کے ہاتھوں انتہائی بے بسی وبے کسی کے عالم میں اپنی داشتہ کے ساتھ بندوق کی گولیوں کی مسلسل بوچھار کا نشانہ بنا اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے خاکِ مذلت ورسوائی کا پیوند ہو کر رہ گیا۔

عصرِ حاضر کا وہ مجموعۂ طلسمات وعجائبات انسان (ہٹلر) جس کا قدم قدم مادرِ گیتی کے بدن پر خوف وہراس کی لہریں پیدا کر دیتا تھا اور جس کے کالبدِ عزم وہمت کی ایک ایک کروٹ سے ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے نقشے بدل جاتے تھے۔ انجام کار دنیا نے دیکھا کہ وہ خود اپنے کاشانۂ امارت وعشرت کی ہی دیوار کے سایہ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ اس دردانگیز طریقہ پر نذرِ اجل ہوا کہ آج اس کا کہیں ایسا نام ونشان بھی نہیں ہے جہاں کوئی نوحہ وماتم کے دو آنسو بھی گرا سکے۔"

~~~

یہ تو جو کچھ ہوا شخصی عروج وزوال کا ایک عبرت انگیز مرقع تھا۔ اس سے قطع نظر قومی اعتبار سے دیکھئے تو نظر آئے گا کہ جو قوم کل تک اپنے ہر منصوبہ میں کامیاب اور اپنے ہر ارادہ میں فتحمند وکامران تھی۔ اور جس کے جلو میں اقبال ونصرت کی فوجیں جوق درجوق چلتی تھیں۔ گردشِ ایام کی ایک جنبش نے ہی اب اسے "نوائے سوختہ در گلو" کا ایک حیرت افزا پیکر بنا کر رکھدیا ہے۔ اور ابھی کچھ دن ہوئے ان کی بدقسمتی پر دنیا کے تین بڑے انسانوں نے اپنے متفقہ فیصلہ سے ایک حتمی مہرِ تصدیق بھی ثبت کردی ہے۔

اور اس کے برعکس جو قومیں میدان پر میدان چھوڑتی چلی جارہی تھیں اور دنیا کی انگشت قیافہ شناسی جن کے نبضِ حیات کی مدہم رفتار کا بے چینی سے شمار کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے پوری جنگ کا نقشہ یکسر منقلب کرکے رکھدیا۔ چنانچہ آج فتح کا جھنڈا انھیں کے ہاتھ [illegible] ظفرمندی کا تاجِ زرفشاں ان کے سروں کی زینت بنا ہوا ہے
~~~

تاریخ کے صفحات قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں سے تہی مایہ نہیں۔ لیکن آپ کو جستجو کے بعد بھی ان میں کسی ایک ایسی قوم کا حال نہیں ملیگا کہ جس نے کل بارہ سال کی مدت میں انتہائی عروج اور پھر اسی طرح انتہائی زوال دونوں کی منزلوں کو اس سرعت کے ساتھ طے کر لیا ہو۔ اور وہ چند ہی دنوں میں سب کچھ بن جانے کے بعد یکایک پھر کچھ بھی نہ رہی ہو۔

یہ قوموں کی شکست وریخت اور ان کا یہ عروج وزوال خواہ کتنا ہی درس آموز و عبرت انگیز ہو۔ لیکن ایک سنجیدہ مفکر کے لئے سب سے زیادہ لائق توجہ وہ خاموش انقلاب ہے جو ابھی حال میں انگلستان کے جدید انتخاب سے بطور نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ غور کیجئے انگلستان کا سابق وزیر اعظم جس نے درحقیقت اپنی قوم کے حق میں مسیحائی کا کام کیا۔ آج وہ خود اپنی اسی قوم کے ہاتھوں گمنامی اور بے چارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور اس طرح جہاں اہلِ برطانیہ نے اپنی آزاد خیالی۔ روشن ضمیری اور عالی دماغی کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے قطعی طور پر یہ حقیقت بھی ثابت کر دی ہے کہ اب، معاشی اور سیاسی رجحانات کے اعتبار سے دنیا کا رُخ کیا ہے؟ اور خارجی و داخلی عوامل و موثرات نے اسے کس طرف چلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جنگِ یورپ کے اختتام پر جارج برنارڈ شا نے کہا تھا کہ "یہ فتح دراصل انگلینڈ والوں کی نہیں بلکہ سوویٹ روس کی فتح ہے۔ اس بنا پر ہمیں اس پر خوشی منانے کا کوئی حق نہیں ہے۔" یورپ کے اس جہاندیدہ بوڑھے نے ڈھائی مہینہ پہلے جو بات کہی تھی انگلستان کے گذشتہ انتخابات نے اسکی حرفاً حرفاً تصدیق کر دی ہے۔ اور برنارڈ شا غریب نے تو جنگ کا سارا کھیل دیکھ لینے کے بعد یہ کہا مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم جنگ کے آغاز ہی میں اس نتیجہ کی پیش گوئی کر چکے تھے۔ جس کی شہادت آج بھی بڑے بڑے علمائے کرام دے سکتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس عظیم و جلیل انقلاب کا اثر صرف انسان کی سیاسی اور معاشی

ندگی تک ہی محدود نہ رہیگا۔ بلکہ مذہب اور اخلاق کا بھی اس سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اس وقت
یا ایک بالکل نئے سانچہ میں ڈھل رہی ہے۔ پرانے افکار و خیالات کی جگہ نئے رجحانات و میلانات
بھر رہے ہیں۔ زندگی کی نسبت ایک بالکل جدید نقطہ نظر بڑی تیزی سے پرورش پا رہا ہے۔ روحانی اور
خلاقی و مذہبی اقدار روز بروز بے وزن و بے قیمت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ انسان
اشرف المخلوقات ہونے کے باوصف قطعی طور پر ایک معاشی حیوان بن رہا ہے اور وہ ان تمام
چیزوں کو یکسر نظر انداز کرتا جا رہا ہے جن کا تعلق انسانی روح کے ارتقا اور اس کے باطن کی
وز و فلاح سے ہے، پھر چونکہ اس نقطۂ نظر کی پشت پر بے پناہ فوجیں اور حکومت و سلطنت
نہایت مستحکم طاقت و قوت ہے۔ اس بنا پر اس معاشی اور مادی نقطۂ نظر کے تمام دنیا پر چھا
جانے کے جو قوی امکانات ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

حکومت کی ساحری کس طرح محکوم کے احساس اور اس کی قوتِ امتیاز کو ماؤف و معطل
کر دیتی ہے۔ اس کی ایک تازہ مگر دلچسپ مثال یہ ہے کہ انگلینڈ میں لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آتے
ہی ہماری ایک مشہور قومی درس گاہ کے وائس چانسلر نے جس کا بند بند سرمایہ داری کی زنجیروں میں
جکڑا ہوا ہے۔ پارٹی کے لیڈر کو مبارکباد کا تار بھیجا ہے اور اس میں بڑے فخر سے اس کا اظہار کیا
ہے کہ "سوشلزم اسلام سے بہت قریب ہے" گویا اسلام موم کا ایک ایسا مجسمہ ہے کہ اسے جو شکل
آپ چاہیں بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں۔

ان حالات میں لامحالہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نئے نظامِ عالم کے نقشہ میں مذہب کی
کیا حیثیت ہوگی اور اس کے خانہ کو کس طرح پُر کیا جا سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام واقعی دنیا کا
آخری اور سچا مذہب ہے تو اس سوال کا جواب سب سے پہلے مسلمانوں کو دینا چاہئے اور انھیں غور کرنا
چاہئے کہ وہ اس سیلاب کا مقابلہ کیونکر اور کس طرح کر سکتے ہیں۔ ورنہ اگر اس نازک وقت پر بھی

انھوں نے اپنی غفلت اور بے حسی کو نہیں چھوڑا تو نہیں کہا جا سکتا کہ خدا کی اس وسیع سرزمین
انھیں کہیں کوئی ایسا گوشۂ عافیت مل بھی سکے گا یا نہیں جہاں وہ اطمینان سے زندگی کا سانس لے

انسانی تہذیب و تمدن میں جب کبھی کوئی عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے تو عموماً اس کی
پر دو چیزوں کی طاقت و قوت ہوتی ہے ایک قلم اور دوسری تلوار۔ مفکرین اپنی تحریروں سے
شاعر اپنی شعلہ نوائیوں سے۔ اور آتش بیان مقرر اپنی تقریروں سے لوگوں کے افکار و خیالا
میں ایک بحران و تموج پیدا کر کے انھیں کسی ایک خاص فکر سے اس طرح وابستہ کر دیتے ہیں ک
فکر ان کی روح میں تحلیل ہو کر ان کا ایمان اور عقیدہ بن جاتا ہے۔ پھر جب ان میں یہ جذبہ پیدا ہ
ہے کہ وہ اس عقیدہ کی صداقت کو دوسروں پر ظاہر کریں اور ان سے اس کی عظمت و برتر
کا اقرار کرائیں تو اب اس قوم کے سپاہی میدانِ عمل میں آتے ہیں اور جو کام قلم سے تشنۂ تکم
رہ گیا تھا وہ اسے مکمل کر دکھاتے ہیں۔ آج کی دنیا میں بھی دیکھئے تو یہی دو طاقتیں کام کر رہی ہیں
اور انھیں کی موافقت اور عدم موافقت سے قومیں گر رہی اور ابھر رہی ہیں، یہ ایک ایسی کھلی حقیق
ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

پس مسلمانوں کے لئے دین کی حفاظت کا صرف یہی ایک موثر طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک
طرف قلم کے زور سے موجودہ مذہب کش رجحانات و مزعومات کا رخ پلٹنے کی کوشش کریں
اور دوسری جانب وہ اس کی سعی کریں کہ دنیا میں طاقت و قوت کے جو چند دائرے بن رہے ہیں
ان میں سے کسی ایک دائرہ میں ان کو بھی کوئی وقیع مقام حاصل ہو۔ قلم اور تلوار کی طاقت دونوں
ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ کسی ایک کو دوسرے پر تقدم نہیں دیا جا سکتا۔ تلوار کی طاقت کا حصول
بغیر کسی فکرِ صحیح کے سراسر گمراہی ہے اور فکرِ صحیح بغیر تلوار کی طاقت کے محض ایک فلسفہ ہے
مذہب نہیں ہے۔ لسان العصر مرحوم نے خوب کہا ہے۔

نہ ہو مذہب میں گر زورِ حکومت تو وہ مذہب نہیں ایک فلسفہ ہے

مرحوم کے شاعر حکیم نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ایں نکتہ کشائندہ اسرارِ نہانست ملکست تنِ خاکی و دیں روح روانست

تن زندہ و جاں زندہ زربطِ تن و جانست با سبحۂ و سجادۂ و شمشیر و سناں خیز

از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہدِ عروج و ترقی میں سبحۂ و سجادہ اور شمشیر و سنان دونوں کا تعاون اور اشتراک ہی اس بات کا ضامن رہا ہے کہ انہوں نے جب کبھی کسی ملک کو فتح کیا تو۔۔۔ نے مملکت کے ساتھ ساتھ اہلِ ملک کے دل اور دماغ اور ان کی روح کو بھی فتح کرلیا۔

آج مسلمانوں کی اپنی تبلیغیں اور اصلاحی انجمنیں بھی ہیں اور قومی تعلیمی درسگاہیں بھی، ان میں بھی ہیں اور انشاپرداز بھی۔ سیاسی رہنما بھی ہیں اور دینی پیشوا بھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مجموعی طور پر ان تمام کوششوں کا رخ ایسا نہیں ہے جس سے ہم دنیا کے بین الاقوامی حالات کا مقابلہ کرسکیں اس طوفان سے بچ سکیں جس کے یکایک امنڈ پڑنے کا امکان اب قوی سے قوی تر ہوگیا ہے۔

ہماری ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اب تک ہم نے جتنے کام کیے ہیں وہ صرف اپنی حدود اور بالکل قریب کی دنیا کو پیشِ نظر رکھکر کیے ہیں۔ حالانکہ ہمیں سمجھنا چاہیے تھا کہ اب دنیا اپنی وسعتوں کے باوجود ایک خاندان یا ایک قبیلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس بنا پر یورپ میں جو انقلاب پیدا ہو اس سے ایشیا، اور افریقہ کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح چین و جاپان اور ہندوستان کی صورتِ حال کا اثر ضروری ہے کہ یورپ اور امریکہ پر پڑے۔ جس انقلاب کا اندیشہ تھا اب بظاہر اس کے پھیل پڑنے کا وقت قریب آگیا ہے اور ہم اب تک اس قابل بھی نہیں کہ چند لمحے اس سیلاب کی

موجوں سے برسرِ آویزش ہی رہ سکیں۔ جو انقلاب اب آرہا ہے خود ہمارے ملک میں برسوں سے اس
زمین ہموار کی جاتی رہی ہے اور شدید ترین پروپیگنڈہ کے ذریعہ نوجوانوں کے دماغوں کو اس طرح
کرلیا گیا ہے کہ یہ انقلاب ہندوستان میں پہنچکر غالباً کوئی اجنبیت محسوس نہ کرے گا۔ بلکہ یہاں
درودیوار سے اس کے خیر مقدم کی آوازیں بلند ہوں گی۔ اس کے علاوہ اگر یہ صورت نہ بھی ہوتی تو ہند
غریب تو یوں بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس بنا پر ہر وہ نظام، ہر وہ فکر، اور ہر وہ تہذ
جو یورپ کی طرف سے آئیگی وہ لامحالہ اسے قبول کرے گا اور ضرور قبول کریگا۔ آپ زبان سے لاکھ چیخیں
چلائیں، شور مچائیں اور واویلا کریں وقت کا کارواں جس رفتار سے چل رہا ہے اور اسے فطرت کی جو
آگے بڑھا رہی ہیں ان کے زور شور اور ذوقِ تیز گامی و سبک پائی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ کچھ
بہت توقع ان حکومتوں سے ہو سکتی تھی جو مسلمان کہلاتی ہیں لیکن وہ تو ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ
ہیں۔ اور انقلاب پذیری کی استعداد میں ہم تیرہ بختانِ ہند سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں
یہ ہی وہ دنیا کا جدید رخ تھا جسے حکیمِ شرق کی چشمِ غیب آشنا نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور اس
بڑے درد اور سوز و گداز سے کہا تھا۔

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی — آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

اب آپ پوچھیں گے کہ اچھا! جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ ہمارے نزدیک
موجودہ حالات میں اس کی تدبیر کے تین اجزا ہیں اور ان میں سے ہر ایک چیز بجائے خود ایک مستقل اہم
رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے تعلیمی نظام پر زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی
یعنی سعی اس بات کی ہونی چاہئے کہ کم از کم مسلمانوں کا نظامِ تعلیم بالکل الگ ہو اور وہ ایسے اجزا
مرکب ہو کہ اس تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد ہماری قوم کے نونہال جہاں بہترین انجنیر، صناع، ارباب
اور علومِ جدیدہ کے ماہر ہوں۔ ساتھ ہی وہ سچے اور پکے مسلمان ہوں اسلامی تہذیب کے دلدادہ ہوں
دینی حمیت کے پیکر ہوں اور اس طرح وہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی سعادتوں اور بھلائیوں سے

جامع ہوں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم میں ایسے ارباب قلم اور ایسے ذی اثر مقرر ہونے چاہئیں جو یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں تحریر اور تقریر کی پوری استعداد و صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور ساتھ ہی اسلامی علوم و فنون کے فاضل و مبصر ہوں۔ اس قسم کے حضرات کافی تعداد میں ہندوستان سے باہر جاکر یورپ اور ایشیا میں پھیل جائیں اور مختلف ملکوں میں اپنے ادارے قائم کر کے اسلام کی تبلیغ کا کام کریں، اُن زبانوں میں اسلام پر کتابیں لکھیں اخبارات اور رسالے شائع کریں، پبلک اجتماعات کے موقعوں پر تقریریں کریں۔ غرض یہ ہے کہ تبلیغ و اشاعت کے جتنے طریقے ہیں انھیں کام میں لائیں۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اگر اس طرح آپ نے کسی ایک آزاد ملک کے سمجھدار اور با اثر غیر مسلم کو مسلمان کر لیا تو وہ یہاں ہندوستان کے پچاس اچھوتوں کے مسلمان کر لینے سے زیادہ نافع اور مفید ہے پھر ان غیر ملکی مبلغوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہونا چاہئے جو ٹرکی، مصر، ایران، افغانستان اور عراق و فلسطین اور روس کی مسلمان جمہوریتوں میں اسلامی احکام و مسائل کی نشر و اشاعت کرے، اُن کو حقیقی اسلام کی لذت کا متوالا اور والہ و شیدا بنائے۔

غور کیجئے۔ اگر آپ کی ان کوششوں سے کچھ اور نہیں فقط ٹرکی کی پارلیمنٹ کے ارکان اور مصر کے کابینہ وزارت کے عمائد ہی سچے اور پکے مسلمان بنجاتے ہیں تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے اور ان سے اسلام کو کیسی کچھ تقویت نہیں پہنچ سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بحمداللہ تبلیغ کے ولولہ و جوش کی کمی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی کوششوں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ تبلیغ اولاً کس قوم میں اور کن لوگوں میں کرنی چاہئے۔ کس طرح کرنی چاہئے۔ اور کن لوگوں کو اس کے لئے کس طرح تیار کرنا چاہئے۔ اگر مسلمان اس ضرورت کو پیش نظر رکھکر کام کر رہے ہوتے تو آج یہ ناممکن تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف سیاسی پارٹیاں قائم ہوتیں اور اسلامی دستور و آئین کی حامی کوئی ایک پارٹی بھی نہ ہوتی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کو ملک کے سیاسی اقتدار میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونے کے لئے جد و جہد کرنی چاہئے۔ اور جتنا حصہ بھی ملے اور جب بھی ملے اس سے بہر حال انھیں فائدہ

اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں اگر ایک وزیر تعلیم کام کا آجاتا ہے تو وہ محکمۂ تعلیمات
کیا کر دیتا ہے۔ کسی یونیورسٹی کا ایک وائس چانسلر اگر صحیح الخیال اور علمی آدمی ہو تو وہ یونیورسٹی کی
اصلاح کر کے اسے کس قدر مفید اور سود مند بنا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ پالیسی کہ "یا کھائیں گے
ورنہ جائیں گے جی سے" انھیں سخت نقصان پہنچا رہی ہے اور وہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت
کی سیاسی طاقت میں ان کی صحیح نمائندگی کے نہ ہونے سے انھیں قومی اور جماعتی طور پر کس
نقصانات پہنچ رہے ہیں اور آئندہ اور کس قدر زیادہ نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مقصد صرف اس طرف توجہ دلانا
یہ عرض کرنا ہے کہ اگر واقعی آپ اسلام کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعتی اور قو
کو باعزت طریقہ پر قائم و باقی رکھنے کے آرزو مند ہیں تو خدا کے لئے وسعتِ نظر، بیدار مغزی
سے کام لیجئے اور جو کام کرنے کے ہیں انھیں اس طرح کیجئے جس طرح کہ انھیں کرنا چاہیے۔ و
امام مہدیؑ کی آمد کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کوئی کام نہ ہو سکیگا اور
کے سامنے مسئولیت سے نہ بچ سکیں گے۔

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی　　　دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

گذشتہ مہینہ کے برہان میں حضرت مولانا شاہ قاری محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
وفات حسرت آیات کی خبر شائع کی جاچکی ہے۔ لیکن چونکہ پرچہ کی پوری کتابت ہو چکی تھی اس
شذرہ نہیں لکھا جاسکا۔ حضرت مرحوم دہلی کے باشندہ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولانا قاری ر
مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کے خلیفہ تھے اور فنِ تجوید و قرأت میں بڑا کمال

قاری محمد اسحاق صاحب نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی اور قرأت وتجوید کا فن بھی انھیں
سے سیکھا۔ اس کے بعد علوم دینیہ کی تحصیل کے لئے میرٹھ تشریف لے گئے۔ یہاں اُن دنوں مدرسہ اسلامیہ
بہت خاص شہرت رکھتا تھا۔ مولانا ناظر حسن صاحب اس کے صدر مدرس تھے اور حضرت مولانا
عزیزالرحمن صاحب عثمانی بھی اسی مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ حضرت قاری صاحبؒ نے تمام
کتابیں اسی مدرسہ میں پڑھیں اور یہیں درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ آپ کی استعداد نہایت پختہ اور مضبوط
تھی خصوصاً فقہ میں بڑی دسترس اور وسیع نظر رکھتے تھے اور تفقہ کی دولت سے جو محض ایک عطیۂ
ایزدی ہے پورے طور پر بہرہ اندوز تھے۔

حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمن صاحب کا اس وقت عالم شباب تھا۔ آپ جتنے بڑے
عالم اور فقیہ تھے اتنے ہی بڑے سالک راہِ طریقت اور صاحبِ معرفت بھی تھے۔ قاری صاحب حضرت
مفتی صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے تو آپ کا یہ تعلق صرف علوم ظاہرہ و رسمیہ تک ہی
محدود نہیں رہا بلکہ آپ نے استاد سے علوم باطنیہ کی تحصیل بھی کی۔ اور اس ذوق وشوق اور محنت
و ریاضت سے کی کہ شاگرد ہو بہو استاد کا آئینہ بن گیا۔ حضرت مفتی صاحب دیکھنے میں بہت سیدھے
سادے۔ بڑے بھولے بھالے اور بے تکلف تھے۔ اپنے گھر کے کاموں کے علاوہ پڑوسیوں کا سودا سلف
بھی بازار سے لے آتے تھے۔ کم گو تھے، حد درجہ کے مہمان نواز اور غربا پرور تھے۔ چہرہ پر ہر وقت بشاشت
اور تبسم کھیلتا رہتا تھا جس سے ملتے تھے تواضع اور غایت انکسار سے ملتے تھے۔ تصنع اور بناوٹ کا کہیں
آپ کی بات میں ذرا دخل نہ تھا۔ نہایت صابر اور قانع تھے۔ ہزاروں مریدوں کا وسیع حلقہ رکھنے کے باوجود
کسی سے کبھی کسی چیز کی توقع نہیں رکھتے تھے بلکہ جب کبھی موقع ہوتا تھا خود اپنے بعض غریب مریدوں
کی امداد کر دیتے تھے۔ ظاہراً اس طرح بے تکلف رہتے تھے لیکن دل درحقیقت اسرارِ معرفت
کا گنجینہ تھا اور روح جمالِ احدیت کی مسلسل ضیا باریوں سے سرچشمۂ تجلیات و انوارِ ایزدی۔
ہو بہو بالکل یہی اوصاف حضرت قاری صاحب کے بھی تھے۔ ان کا دسترخوان وسیع تھا
اور کو بھی کھانا کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ مزاج میں بیحد فروتنی اور خاکساری تھی۔ بڑے ہنس مکھ

اور خوش طبع تھے۔ کم بولتے تھے۔ مگر جب زبان کھلتی تھی تو سوائے قال اللہ اور قال الرسول کے کسی اور چیز کا ذکر بہت کم ہوتا تھا۔ جس سے جو تعلق ہوتا تھا اسے خواہ کچھ ہو پورے طور پر نباہتے تھے۔ نہایت پابند وضع اور بزرگانہ اخلاق و مکارم کے پیکر اتم تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہو کر ایک عرصہ تک میرٹھ میں ہی درس دیتے رہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ اور مولانا محمد علی نامی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی۔ ہندوستان کے مشہور قاری مولانا ابو محی الاسلام صاحب پانی پتی ایسے حضرات نے آپ سے علومِ دینیہ اور تجوید کا فیض حاصل کیا۔ لیکن آپ کے روحانی کمالات کا سوائے خاص لوگوں کے کسی کو علم نہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد لوگوں کو حضرت قاری صاحبؒ کے خلیفہ مجاز ہونے کا علم ہوا تو حضرت مفتی صاحب کے متعدد مریدوں نے جن میں بعض مشہور علمار شامل ہیں حضرت قاری صاحب سے رجوع کیا اور اب آپ دہلی میں مستقلاً قیام فرما ہو کر فیوض باطنی و روحانی سے مستفید فرمانے لگے۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ سے وابستہ ہونے کے باعث ہر سال حضرت مجدد صاحبؒ کے مزار پر مع ایک جماعتِ کثیر کے سرہند تشریف لیجاتے تھے اور کئی دن وہاں قیام کرتے تھے چنانچہ اس سال بھی عرصۂ دراز کی علالت اور ضعف و نقاہت کے باوجود آپ ۱۹ر جولائی کو سرہند تشریف لے گئے۔ واپسی میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ یہاں تک کہ میرٹھ میں ہی آپ اتر گئے اور وہیں چند گھنٹوں کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ واعلیٰ مقامہ فی الجنان۔ عمر تقریباً ۸۴ سال کی پائی۔ دو صاحبزادے جناب قاری محمد یوسف صاحب (دہلی آل انڈیا ریڈیو کے مستقل قاری) اور قاری محمد یعقوب صاحب بطور اپنی یادگار کے چھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو صبر جمیل عطا فرمائے کہ ان کے اس غمِ جانکاہ میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور بھی سینکڑوں مرید، شاگرد اور عقیدتمند شریک ہیں۔

تدوینِ فقہ

(۸)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

آپ تو خدا جانے مذہبِ اسلام کے اختلافی قصوں کا کتنی بھیانک اور مہیب شکلوں میں تصور جمائے بیٹھے ہیں، اور یہاں حال یہ ہے کہ ایسی بات جس پر منطق بہ ظاہر "ناممکن" اور "محال" کا فتویٰ لگائے بغیر نہیں رہ سکتی، علمائے اسلام اس کے بھی صرف امکان ہی نہیں بلکہ وقوع پذیر ہونے کے قائل ہو گئے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ "البینات" کے سوا، جن کی تفصیل گذر چکی اور بتایا جا چکا ہے کہ شروع ہی سے ان کی تبلیغ واشاعت میں پیغمبر اور پیغمبر کے جانشینوں نے ایک ایسا طریقہ کار اختیار فرمایا کہ مذہبِ اسلام کے عناصر واجزا میں ان کا ہونا، اتنی بدیہی اور بین حقیقت بن چکی ہے کہ اسلام کے ساتھ جزئیت کا جو تعلق اُن کا ہے اس کے ماننے پر وہ بھی مجبور ہیں جو سرے سے اسلام کو بھی نہیں مانتے، اسی لئے اسلام کے اس حصہ میں اختلاف ڈالنے والوں کا حال تو اور ہے، جس کا کچھ حال آگے بیان ہوگا، لیکن اس مذہب کے جن اختلافات کا تذکرہ اس وقت کر رہا ہوں، ان کے متعلق یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ان اختلافات کے متعلق ایک دو نہیں، اسلام کے ائمہ وعلماء کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کے مسائل میں اختلاف کرنے والوں میں سے کسی کو بر سرِ غلطی نہیں قرار دیا جا سکتا، صرف یہی نہیں بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ان میں ہر ایک حق پر اور "رندِ جادہ راہِ ثواب" پر ہے، جس کا دوسرا مطلب یہی ہوا کہ منطق نفی و اثبات کو جو تناقض کو محال قرار دیتی ہے، اختلاف کے مسئلہ میں ہمارے علماء وائمہ کی رواداری گویا

یوں سمجھنا چاہئے کہ اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ منطق کے اس قاعدہ کی پروا بھی گویا ان کے نزدیک ضروری نہیں قرار دی گئی، اور یہ رائے کچھ آج غیروں کی تالیوں اور اپنوں کی گالیوں سے متاثر ہو کر نہیں قائم کی گئی ہے، بلکہ اس رائے کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جتنی قدیم خود اسلام کے ان مذہبی اختلافات کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب عقد الجید میں یہ ارقام فرمانے کے بعد

اختلفوا فی تصویب المجتہدین فی المسائل الفرعیۃ التی لا قاطع فیہا أھل کل مجتہد فیہا مصیب او المصیب واحد۔	ان دینی مسائل کے متعلق جن کی کوئی قطعی دلیل نہیں پائی جاتی، ائمہ مجتہدین میں جو اختلاف ہے، خود اس اختلاف کے متعلق بھی یہ اختلاف ہے کہ جتنے مجتہدین ہیں، آیا سب حق پر ہیں یا حق پر ان میں سے کوئی ایک ہی ہو سکتا ہے۔

یہ جواب دیتے ہیں۔

قال بالاول الشیخ ابو الحسن الاشعری والقاضی ابوبکر الباقلانی وابو یوسف ومحمد بن الحسن وابن شریح۔	پہلی بات یعنی ان میں سے ہر ایک حق پر ہے یہی قول ابو الحسن الاشعری قاضی ابوبکر باقلانی ابو یوسف اور محمد بن حسن و قاضی شریح کا ہے

اور یہ تو چند اشخاص کے نام ہوئے اگرچہ ہر نام کسی امام ہی کا نام ہے، آگے فرماتے ہیں۔

ونقل عن جمہور المتکلمین من الاشاعرۃ والمعتزلۃ[1]	اور یہی بات جمہور متکلمین سے بھی نقل کی گئی ہے خواہ یہ متکلمین اشاعرہ سے ہوں یا معتزلہ سے ہوں۔

رہ گئی یہ بات کہ نفی و اثبات کے قانون کی خلاف ورزی جو لازم آتی ہے، شاہ صاحبؒ نے تفصیل کے ساتھ اسی کتاب میں اس کا جواب دیا ہے، خواہ یہ بات بہ ظاہر کتنی ہی دشوار معلوم ہوتی ہو لیکن بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے اختلاف پر نفی و اثبات والا منطقی قاعدہ چپاں

---

[1] عقد الجید ص ۔

ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے اختلافات یا تو ان حدیثوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں جو پیغمبر سے براہ خبر الخاصہ مروی ہیں، اور اس میں کوئی دشواری نہیں ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ پیغمبر یہ بھی کرتے تھے اور وہ بھی کرتے تھے، مثلاً رفع الیدین (رکوع میں جانے اور اٹھنے کے وقت ہاتھ اٹھانے کا جو مسئلہ ہے) اس میں کیا خرابی ہے اگر مانا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ہاتھ اٹھاتے تھے کبھی نہیں، اختلاف ان مسائل کے متعلق یہی نہ تھا کہ سنت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کیا تھا، جب دونوں ہو سکتے ہیں، تو سنت ہونے میں دونوں برابر ہوئے۔ پس نفی بھی واقع کے مطابق ہے اور اثبات بھی۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ باوجود سنت ہونے کے افضل کیا ہے، مگر نفسِ سنت ہونے کا جو دعویٰ تھا، اس کی حد تک تو دونوں باتیں صحیح ہیں، اور اختلافات کا دوسرا قصہ ان اجتہادی مسائل میں پیدا ہوتا ہے جن کی صراحت نصوص میں نہیں پائی جاتی، اور نصوص کو دیکھکر اربابِ فکر و نظر و علم و بصیرت نے بطور استنباطی نتائج کے ان کو پیدا کیا ہے، پھر اس کی مثال کیا ہوئی؟ قانون کی ایک کتاب دو ضلعوں کے دو مختلف حاکموں کے سپرد کی جاتی ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ایسے واقعات جن کے متعلق احکام کی تصریح قانون کی اس کتاب میں نہ ملے تو کتاب کے قوانین مذکورہ کو پیشِ نظر رکھکر ان ہی کی روشنی میں چاہیے کہ ہر حاکم حکم لگائے اور فیصلہ دے، ایک ہی قسم کی فرض کیجیے کہ دونوں حاکموں کے سامنے کوئی ایسی صورت پیش ہوئی جن کا صراحۃً حکم قانون کی اس کتاب میں موجود نہ تھا۔ دونوں نے کامل غور و خوض اور انتہائی نظر و فکر سے کام لیکر دیانت داری کے تمام احساسات کو بیدار رکھتے ہوئے فیصلہ کیا، اتفاقاً ایک کا فیصلہ دوسرے سے اگر مختلف ہو جائے اور ایسا ہو جانا نہ صرف ممکن بلکہ ہوتا ہی رہتا ہے تو سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کو بر سرِ غلطی قرار دینا، کیا خود غلطی نہیں ہے؟ غیر شرعی قوانین میں حکومت کے منشا کے مطابق ہونا ہی کسی فیصلہ کی صحت کا جیسے معیار ہے اسی طرح شرعی قوانین میں حق تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے مطابق اجتہادی احکام کا ہونا ہی ان کا صدق و صواب ہے، امر و حکم کی جنھیں اجازت شریعت

عطا کر چکی ہے۔ انھوں نے اجتہاد کے فرائض کی پابندی کرتے ہوئے اگر اجتہاد کیا ہے تو جو نتیجہ وہ پیدا
کریں گے وہی شریعت کا منشا قرار پائے گا، اور اجتہادی احکام کے حق و صواب ہونے کے یہی معنی
ہیں، باقی حدیثوں میں حاکموں کے فیصلوں کے متعلق جو یہ آیا ہے کہ وہ کبھی صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی
غلط بھی، اس کا تعلق اجتہادی احکام سے نہیں تھا بلکہ واقعات پر شرعی احکام کو منطبق کرنے کا کام
حاکم جو کرتا ہے اس حدیث کا اسی سے تعلق ہے۔ مثلاً چوری کے الزام کے ساتھ ایک شخص حاکم اور
قاضی کے پاس پیش ہوا، چور کو کیا سزا دی جائے اس کا حکم صراحۃً قرآن میں موجود ہے اس لئے سزا کی
تجویز کے لئے اجتہاد کی ضرورت نہیں، البتہ وہ چور ہے یا نہیں یہ واقعہ کی تحقیق کا کام ہے اور اس میں
دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتیں یعنی وہ چور بھی ہو، اور نہ بھی ہو، مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی نہیں، اس
حکم کا تعلق اجتہاد کی اسی قسم سے ہے، ورنہ مسائل اجتہادیہ میں واقعہ کی مطابقت صرف اس قدر ہے کہ
مجتہد نے یعنی اس شخص نے یہ فیصلہ کیا ہے، جس کا فیصلہ ہی شریعت کا منشا ہے۔

بہر حال مجھے تو اس وقت صرف یہ بتانا تھا کہ مذہب کے جس اختلاف پر آج ہر جگہ واویلا مچا
ہوا ہے، جن لوگوں میں یہ اختلاف تھا وہ اس کے متعلق اتنا ائتلافی و اتفاقی نقطۂ نظر رکھتے تھے، آخر
اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ ائمہ مجتہدین اپنے سوا دوسروں کے خیال کو غلط سمجھتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ امام ابو حنیفہؒ
کی قبر کے خیال سے امام شافعیؒ دین کے ایک صحیح مسئلہ کو چھوڑ کر اس طریقۂ عمل کو اختیار کرتے جو ان کے
نزدیک غلط یعنی دین نہ تھا، یا امام مالکؒ دو دو دفعہ موقعہ ملنے کے باوجود ان مسلمانوں کو جو ان کے فقہی
نتائج سے مختلف تھے، ان کو غیر شرعی اور دینا ان کے نزدیک جو غلط زندگی تھی اس پر باقی رہنے کی اجازت
ہی نہیں، بلکہ خلیفۂ وقت کو غلطی کی اصلاح سے روک سکتے تھے، مالکم کیف تحکمون۔

کوئی توجیہ ان بزرگوں کے اس طرز عمل کی اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ سب ہی کو حق و
صواب سمجھتے تھے، شاید یہی بنیاد ہے ؛ غالباً مشہور امام سفیان ثوریؒ کے اس قول کی کہ وہ مذہب کے
ان اختلافات کو اختلافات کے لفظ سے تعبیر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

شعرانی نے نقل کیا ہے۔

قال سفیان الثوری لاتقولوا اختلف العلماء فی کذا وقولوا قد وسع العلماء علی الامۃ بکذا (میزان ص ۲۱)

سفیان ثوریؒ کہتے تھے کہ علماء نے فلاں مسئلہ میں اختلاف کیا، یہ نہ کہا کرو، بلکہ یوں اس کو ادا کرو کہ امت کے لئے علماء نے یہ گنجایش پیدا کی۔

کاش ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پاکیزہ اصلاحی مشورہ مان لیا جاتا اور بجائے اختلفوا، اختلفوا کے توسعوا، یا اس کے ہم معنی الفاظ کے استعمال کا امت میں رواج ہو جاتا، تو اختلاف کے لفظ اور صرف لفظ سے دنیا اور دنیا کیا حد یہ ہے کہ خود مسلمان جس مغالطہ میں آج مبتلا ہیں، یا مبتلا کر دیئے گئے ہیں وہ شاید پیدا ہی نہ ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات اور ان اختلافات سے پیدا ہونے والی فرقہ بندیوں کے شور سے آج آسمانوں کو جو سر پر اٹھا لیا گیا ہے، باور کرایا گیا اور کر بھی لیا گیا کہ اسلام کی تاریخ میں شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گذرا ہو جس میں ہفتاد و دو ملت والی جنگ میں ملت اسلامیہ مبتلا نہ رہی ہو۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے ایسا واقعہ جس کی تصدیق ہمیشہ مشاہدہ سے ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے اب میں لوگوں سے کیا کہوں، جس چیز کو وہ واقعہ کہہ رہے ہیں، دعوی کر رہے ہیں کہ مشاہدہ اس کا علم ان کے اندر پیدا کر رہا ہے، میرا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ایک مدت تک، اس وقت تک جب تک کہ مسلمانوں میں یونانی اور اسکندرانی[1]، ہندی و ایرانی زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کی راہ سے منتقل ہو کر نہیں پہنچے تھے، ان کے عوام ہوں یا خواص، مذہب کے "البنیاتی" عناصر و اجزاء کے متعلق کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے، اس زمانہ تک ان میں جو کچھ بھی اختلاف تھا وہ ان ہی امور کی حد تک تھا، جن کے اختلاف کا، اختلاف نام رکھنا بھی شاید صحیح نہیں بلکہ سب حق پر ہیں، سب راہ صواب ہی پر چل رہے ہیں یہی سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ رفع الیدین کرتے تھے، کسی حنفی کے دل میں قطعاً کسی زمانہ میں ایک

---

[1] اسکندریہ کے مدرسہ میں جن علوم و فنون کا رواج تھا ان ہی کی یہ اصطلاحی تعبیر ہے۔

لمحہ کے لئے بھی اس کا وسوسہ نہیں آیا کہ ان کے دین میں کسی قسم کی کوئی کمی تو کیا پیدا ہوگی، وہ اس تص
سے بھی عاجز ہیں کہ امام شافعیؒ کی ولایت اور ان کے مدارج میں شک کریں، جن کے مستحق امت۔
اولیا اور صلحاء سمجھے جاتے ہیں، اور جہاں تک میں جانتا ہوں یہی نسبت شوافع کو امام ابوحنیفہؒ اور ان
تلامذۂ راشدین سے ہے، قبرابی حنیفہؒ پہ امام شافعیؒ کے اس طرزِ عمل کے سوا، امام ابوحنیفہؒ کے
شوافع کی عقیدت کی یہ انتہا ہے کہ امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ جو مسلکاً ایک شافعی عالم ہیں
اپنی کتاب میزان الکبری میں یہ ارقام فرمانے کے بعد

انھم کلھم علی ھدی من ربھم	تمام ائمہ سیدھی راہ پر ہیں اپنے رب کی طرف سے
وما یھینہ احد فی قول من	اور ان بزرگوں میں سے کسی کی اہانت وہی کر سکتا ہے
اقوالھم الا لجھلہ دلیلہ	جو ان کے مسلک کی دلیل سے ناواقف ہے یا جہاں
اما من حیث دقتہ مدارکہ	سے بات ائمہ کی سمجھ میں آئی ہے وہ بہت نازک
علیہ۔	اور دقیق ہو۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں۔

لاسیما الامام الاعظم ابوحنیفۃ	خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ
النعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ	تعالیٰ عنہ، جن کے علم کی کثرت اور پارسائی و
الذی اجمع السلف والخلف علی کثرۃ	عبادت اور ان کے علمی مدارک کی نزاکت اور
علمہ وورعہ وعبادتہ ودقۃ مدارکہ و	استنباط پر اگلوں اور پچھلوں کا اتفاق ہے، امام
استنباطاتہ وحاشاہ رضی اللہ تعالیٰ	ابوحنیفہؒ کی ذات اس الزام سے قطعاً بری ہے
عنہ من ان یقول فی دین اللہ بالرای	کہ اللہ کے دین میں انھوں نے کوئی ایسی بات
لایشھد لہ ظاھر الکتاب	کبھی کہی ہو جس کی شہادت قرآن اور سنت کے
ولا سنۃ (ج ۱ ص ۵۲)	ظاہر نصوص میں نہ ملتی ہو۔

آخر میں اپنے شیخ علی الخواص کی شہادت جو میرے خیال میں واقعہ کی شہادت ہے، ان الف

ال کرتے ہیں۔

مدارك الامام ابي حنيفة لا يكاد يطلع عليها الا اهل الكشف من اكابر اولياء الله (ج ۱ ص ۵۳)

امام ابوحنیفہؒ جہاں سے اپنے مسائل و مجتہدات کو استنباط کرتے ہیں وہ اتنے تاریک و دقیق ہیں کہ ان سے بجز بڑے بڑے اولیاء اللہ صاحب کشف کے دوسرا مشکل ہی سے مطلع ہو سکتا ہے۔

اور غالباً یہی بنیاد ہے جو شعرانی نے چند سطروں کے بعد یہ بھی لکھا ہے۔

ومذهب الامام ابي حنيفة اول المذاهب تدوينا وآخرها انقراضا كما قال بعض اهل الكشف قد اختاره الله تعالى اماما لدينه وعباده ولم يزل اتباعه في زيادة في كل عصر الى يوم القيامة۔

مدون ہونے کے لحاظ سے تمام مذاہب اور فقہی مکاتب خیال میں پہلا مذہب امام ابوحنیفہؒ ہی کا ہے اور ختم ہونے کے لحاظ سے بھی آخری مذہب امام ابوحنیفہؒ ہی کا ہے جیسا کہ بعض اربابِ کشف نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہؒ کو اپنے دین کی پیشوائی کے لئے چن لیا اور اپنے بندوں کا انھیں امام بنایا، ان کے ماننے والے ہر زمانہ میں بڑھتے چلے جائیں گے قیامت کے دن تک۔

شیخ نے اپنے آخری فقرہ میں جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے، ان میں بعض اجزاء کی تفصیل ے آرہی ہے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کا سب سے پہلے مدون ہونا، ان کے اتباع کا دن بدن بڑھتے لے جانا، انشاء اللہ اپنے تمام اسباب و وجوہ کے ساتھ ان پر سیر حاصل بحث کی جائے گی، لیکن ایک فی عالم کا اس کشف کو بغیر کسی تنقید کے نقل کرنا کہ امام ہی کا مذہب سب سے آخر میں رہ جائے گا اور ا اسی پر ختم ہوگی، جو ان کے کلام کا حاصل ہے۔ اس وسعتِ دلی کا کتنا بڑا ثبوت ہے جو مذہبی اختلافات ، باوجود علماءِ اسلام میں پائی جاتی تھی۔

جو نہ دیکھنا چاہتے ہوں انھیں تو کوئی دکھا نہیں سکتا، لیکن مسلمانوں میں سارے جہان کے لمانوں میں عظمت و احترام کا جو مقام عالی حضرت سیدنا شیخ جیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہے

اس سے کون واقف نہیں؟ حنفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی، غوث اعظم کا لفظ کس کی زبا
پر جاری نہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ حضرت والا مسلکاً حنبلی تھے اور ایک وہی کیا، شافعی المسلک
غزالی، اگر حجۃ الاسلام ہیں تو سب کے حجۃ الاسلام ہیں۔ رازی شافعی اگر امام ہیں تو سب کے امام
"نیست پیغمبر ولے دارد کتاب" والے رومی کو چونکہ وہ حنفی تھے اس لیے اس خطاب کا مستحق کیا، صر
حنفی مسلمان ہی سمجھتے ہیں مجدد فاروقی کو اسلامی دنیا کے جس جس حصہ میں مجدد تسلیم کرلیا گیا
کیا ان کے متعلق یہ بات صرف حنفی مسلمانوں ہی تک اس لیے محدود ہے کہ نسبتاً اپنی حنفیت
انھیں زیادہ اصرار تھا۔

پھر دنیا کا جو اختلاف پیدا ہونے کے ساتھ ہی، ائتلاف کے اس رنگ میں رنگین ا
اتفاق و اتحاد کی ان صورتوں میں بدل جاتا ہو، مشاہدہ کرنے والوں نے مشاہدہ کیا، اگر اس کو
اختلاف اور وہی اختلاف سمجھتے رہے جس نے قوموں کو بانٹا اور کاٹا ہے اور آج بھی خیالات
کا اختلاف تو ہے جو زمین کے کرہ پر ادھم مچائے ہوئے ہے، انسانیت کے لئے لعنت بنا ہوا
ہمارے ان مذہبی اختلافات کے تل کو مسہ بلکہ رسولی اور خدا جانے کیا کیا بنا کر دکھایا گیا۔ لیکن
قوموں کے آباو اجداد نے مذہبی اختلافات میں اور ان کے پوتے پڑپوتوں نے لامذہبی[1] اختلافات میں

---

[1] مطلب یہ ہے کہ کلیسائی عہد میں جو کچھ یورپ نے خون بہایا سب مذہب کے نام سے بہایا۔ مذہب کے
خون سے تنگ آکر جب مذہبیت میں پناہ لی گئی اور بت پرست یونانیوں رومانیوں کو پیشوا بنایا گیا، تو ان قوموں کے
اوہام وطنیت و قومیت کے زندہ ہوئے، اب عقائد و خیالات کے اختلاف پر نہیں بلکہ اضطراری صفات مثلاً چہرہ و
یا نسلوں کے اختلاف پر جنگ کی بنیاد رکھی گئی یا ان وہمی اور فرضی حدود پر جن کے ذریعہ سے خاک کے اس تودہ زمین کو
ناموں سے موسوم کر دیا گیا ہے کسی کا نام یورپ اور کسی کا ایشیا رکھدیا گیا اور جو صرف وہم تھا، واقعہ سے اس کا کوئی تعلق
اسی کو واقعہ سمجھا گیا، پھر سوا جو کچھ ہوا، تقریباً یہی حال زبانوں کے اختلاف کا بھی ہو کہ معانی سے الفاظ کا ظاہر ہے کہ کوئی
اور قدرتی تعلق نہیں ہوتا بلکہ جس شے کی تعبیر کے لیے جس لفظ کو فرض کرلیا گیا وہی شے اب اس لفظ کا معنی بن گئی
بولیوں کے بولنے والوں میں جب زبانوں کی اسی اختلاف پر لڑائی کی گئی تو کیا یہ بھی صرف ایک فرضی مسئلہ کے
نہ ہوئی، لیکن یورپ اب تو ان حدود سے بھی آگے نکل گیا ہے، خیالات کا اختلاف جس پر بنایا گیا تھا، اب اسی پر دو

کچھ کیا کرتے رہے، کر رہے ہیں، اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک کرتے رہیں گے۔ ان سب کو بھلا دیا گیا ناقابلِ برداشت بنا دیا گیا، اس اختلاف کو کہ مسلمانوں میں کسی کو زور سے آمین کہنے پر اصرار ہے اور کسی کو آہستہ کہنے پر، اپنے محبوب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جیسی باطنی نسبت ہے یہ اصرار مبنی ہے، اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی میں پوچھتا ہوں، توپوں کی گرج اور بموں کی کڑک کے درمیان زندگی گذارنے والوں نے کیا یہ انصاف کیا جب

غنچہ چٹخا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے

کہنے والے نے سچ کہا تھا؛

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلام میں اختلاف جو کچھ بھی تھا صرف مذہب کے اسی حصہ سے اس کا تعلق تھا جس کا اختلاف مردود نہیں، بلکہ گذر چکا کہ ایک حد تک مطلوب و مقصود تھا، اس عہد کے بعد یہ صحیح ہے کہ باہر سے درآمد کئے ہوئے جراثیم نے کچھ دن کے لئے ان اختلافات کو ضرور پیدا کیا، جن کی لہریں غیر بنیاتی حصہ سے گذر گذر کر اسلام کے "بنیاتی" عناصر سے بھی ٹکرا ٹکرا جاتی تھیں، اور اس لئے چاہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فرقہ بندیوں والے اختلاف میں کچھ دن کے لئے اسلام ضرور الجھ گیا، لیکن اسی کے ساتھ جس طنطنہ اور دبدبہ کے ساتھ اختلافات کے ان قصوں کی داستان سرائی اپنوں یا غیروں نے کی ہے یا کر رہے ہیں، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں بجائے مشاہدے کے زیادہ تر ان کا تعلق بھی مغالطوں ہی سے ہے بلاشبہ کتابوں میں خصوصاً "فرق" کے "فروق" کو بیان کرنے والی کتابوں میں "ہفتاد و دو ملت" کی جو لمبی لمبی فہرستیں اسلامی فرقوں کی لوگ درج کرتے ہیں ان کے دیکھنے سے تو دماغ بوکھلا جاتا ہے، اور اسی بوکھلاہٹ میں لوگ یہ سوچنا بھول جاتے ہیں کہ جن گوناگوں، بوقلموں فرقہائے اسلام کا ان کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیا کے کس خطہ میں کہیں آباد بھی ہیں یا نہیں،

بحمد اللہ آج دنیا میں چالیس سے لیکر ستر کروڑ تک کی تعداد ان انسانوں کی بتائی جاتی ہے

کہ ... قائم کر کے ان کو ایک ایسی امت کی شکل میں اسلام نے

بدل دیا ہے، جس کا خدا ایک ہے، نبی ایک ہے، کتاب ایک ہے، قبلہ ایک ہے، اور آپ غور نہیں کرتے ورنہ نظر آتا کہ فرقہ بندیوں کے لحاظ سے بھی ان کی اکثریتِ غالبہ شدیدہ صرف ایک ہی فرقہ کی شکل میں پائی جاتی ہے، یعنی اسلام کے "بیناتی" حصہ کے متعلق ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور گذر چکا کہ فرقہ بندی کے لئے جس اختلاف کی ضرورت ہے وہ بینات ہی کا اختلاف ہے، میری مراد اہل السنت والجماعت سے ہے، کون نہیں جانتا کہ بینات کی حد تک ان میں سب ایک ہی نقطۂ نظر پر متفق ہیں، اسی کی تعبیر "ما انا علیہ واصحابی" سے کرتے ہیں یعنی متفقہ طور پر پیغمبر اور پیغمبر کے ساتھیوں سے جو دین منتقل ہو کر مسلمانوں تک پہنچا ہے اہل السنت اسی کو اپنا دین بناتے ہیں۔

اہل السنت کے بعد آپ ہی بتائیے کہ آج مسلمان کہلانے والی قوموں میں ایسے کتنے فرقے ہیں جنھیں "بینات" میں اہلِ سنت سے اختلاف ہو، وہی جس کا نام اصولی اختلاف ہے، دماغ پر زور دیجئے، ڈھونڈھ لیجئے، دنیائے اسلام کے کونے کونے گوشے گوشے میں ٹٹولئے، شیعہ نام بتانے والے ایک فرقے کے سوا اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر کم از کم اس زمانہ تک جس زمانہ تک مسلمان ملنے میں ہو یا جدا ہونے میں غیروں کے نہیں بلکہ خود اپنے ارادے[۱] کے پابند تھے، کتابوں میں دیکھکر نہیں مشاہدہ کی رو سے بتائیے کہ اور بھی کوئی ہے؟ میں نہیں جانتا کہ "کوئی نہیں" کے سوا اس کا مشاہداتی جواب اور کیا ہو سکتا ہے، بمشکل جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر انتہائی تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو عرب کے بعض ساحلی علاقوں مثلاً مسقط وغیرہ میں جیسا کہ سنتے ہیں، دس بیس ہزار نفوس خارجیوں کے بھی شائد مل سکتے ہیں، لیکن جہاں سوال کروڑہا کروڑ کا ہے، نصف ارب سے بھی جس قوم کی مردم شماری

---

[۱] میرا اشارہ مسلمانوں کے ان جدید عصری رجحانات کی طرف ہے جو محکومیت کے اس عہد میں آزادیٔ خیال کے نام نہاد نام سے پیدا ہو رہے ہیں اور آئے دن مختلف گوشوں سے اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق نت نئی راہوں کا اظہار ہو رہا ہے گو ان جدید رجحانات نے اب تک مسلمانوں میں (بجز ایک خاص تحریک کے جس میں ختم نبوت کے متفقہ متواتر اجماعی مسئلہ کو مشتبہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے) اور کسی خیال نے کوئی ایسی پختہ صورت نہیں اختیار کی جس سے کسی خاص فرقہ کی بنیاد پڑتی ہو۔

کی رپورٹ قریب ہے کہ آگے نکل جائے، بلکہ اعداد و شمار کے بعض اچھے ماہرین[1] سے تو سننے میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد نصف ارب سے آگے بڑھکر پون ارب کے قریب پہنچ چکی ہے، بھلا زمین کی اتنی بڑی آبادی کے مقابلہ میں یہ چند ہزار نفوس بھی کیا قابل شمار ہوسکتے ہیں۔

کیا تماشا ہے اس ہفتاد و ملت کے لطیفہ کا، جس سے ہفتاد کا لفظ ساقط ہوکر صرف "دو" (سنی اور شیعہ) تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ان دو فرقوں میں بھی چند ایسے ذیلی فرقے کہیں کہیں جو پائے جاتے ہیں، جن کے اختلاف کو "بینات" کا اختلاف قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ میکڈانل نے بھی لکھا ہے کل کے کل وہ شیعوں ہی کے ذیلی فرقے ہیں، مثلاً یمن کے زیدیہ ہرزیہ یا ہندوستان کے سلیمانیہ، داؤدیہ، آغاخانیہ، باقی اہل سنت میں جو اختلافات ہیں اور ان اختلافات کی بنیاد پر بطور نام نہاد کے لوگ مختلف ائمہ کی طرف منسوب ہیں۔

بتا چکا ہوں کہ عملاً ہو یا علماً ان کے اختلافات کی وہ نوعیت ہی نہیں ہے جس سے فرقے بنتے اور ٹولیاں تیار ہوتی ہیں، حتیٰ کہ آپ یہ بھی سن چکے کہ ان کے اختلاف کو اختلاف کہنا بھی صحیح نہیں ہے، یہی واقعہ بھی ہے، اہل سنت کے عوام ہوں یا خواص یہی وہ جانتے بھی ہیں؛ اسی پر ان کا عمل بھی ہے۔ اسی لئے باہم ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک والوں سے شادی بیاہ کے عام معاشرتی ہی نہیں بلکہ پیری مریدی تک کے تعلقات قائم کرنے سے نہیں جھجکتے شروع سے لے کر اس وقت تک ان کا عام حال یہی رہا ہے، کہیں کہیں شخصی طور پر اگر کسی کے قلم سے یا زبان سے اور وہ بھی علمی مباحثوں یا مناظروں کے وقت کچھ بے احتیاطیاں عمل میں آئی ہیں تو اس کی ذمہ داری ان اختلافات پر عائد نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کی بے احتیاطیاں تو ان لوگوں کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جن میں یہ اختلافات نہیں ہیں، علمی ترنگ اور مناظراتی جوش میں بھر کر کیا حنفی عالموں نے

---

[1] مجھے حوالہ یاد نہیں رہا کسی معتبر مجلہ میں جنیوا والی مرحوم لیگ آف نیشن (مجلس اقوام) کے شعبہ اعداد و شمار کی رپورٹ درج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد ستر کروڑ کے قریب پہنچ چکی ہے اور کچھ یوں بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے صحرائی دور دراز علاقوں (مثلاً صحرا لیبیا وادی قبچاق ترکستان وغیرہ) میں پھیلی ہوئی ہے جن تک شمار کرنے والوں کی رسائی آسان نہیں ہے۔ ۱۲

اپنے ہی جیسے حنفی عالم پر چوٹیں نہیں کی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ زیادہ تر اس کا تعلق ان کے شخصی افت
طبع اور فطری خصوصیات سے ہوتا ہے، ان کے مباحثے مباحثوں کی حدود سے نکل کر جھگڑوں ک
شکل اگر اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہبی مباحثہ کرنے والے جھگڑتے ہیں، بلکہ
جھگڑنے والے اتفاقاً جب مذہبی مباحثہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی طبیعت کا
اقتضاء ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن بیسبے احتیاطیاں بھی، کیا زبان وقلم سے آگے بڑھ کر کبھی تلوار کے قبضوں تک پہنچ گئی ہ
اسلام تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے اور اس کی آبادیوں کا دائرہ ایشیا
افریقہ بلکہ یورپ کے بعض خطوں کو محیط ہے، کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ حنفیوں کی فوج شافعیوں سے
مقابلہ میں یا مالکیوں کا رسالہ حنبلیوں کے مقابلہ میں اس لئے صف آرا کبھی کہیں، کسی زمانہ میں ہو
تھا کہ ان میں ایک دوسرے سے مذہبی اختلاف تھا۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں جو کچھ ہوا وہ تو خیر ایک بڑی بات ہے، میں نہیں جا
کہ اہل السنت کے ان مختلف اماموں کے متبعین میں کبھی کوئی معمولی جھڑپ بھی ہوئی ہے اور تیرہ
سال کی اس طویل مدت میں ایک دو واقعے اگر کہیں شاذ و نادر پیش آئے بھی ہوں تو تحقیق سے معلوم
کہ جھڑپ کی بنیاد میں درحقیقت کوئی دوسری چیز پوشیدہ تھی، یعنی فائدہ، ناجائز فائدہ اٹھانے والوں
اپنے ہم خیالوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ممکن ہے کہ اس معصوم وحلال اختلاف سے غی
معصوم وحرام نفع کمایا ہو، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ "بینات" میں اختلاف رکھنے والے فرقوں میں بھی
اس وقت جب دنیا میں کبھی کسی علاقہ میں وہ بیچارے پائے جاتے تھے، خونی مقابلوں اور مجادلو
کے واقعات بھی بمشکل ہی پیش آئے ہیں۔ صرف فرقہ باطنیہ جس کا حال اب تو جو کچھ بھی ہو لیکن جس
زمانے میں وہ واقعی باطنیہ تھا، اور باطنیوں کے سے کام کرتا تھا، اس وقت ہر شخص جانتا ہے کہ ان
صرف ظاہر اسلام تھا اور باطن ان کا وہی تھا جو ایک مدت تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے عظیم
خطرہ بنا رہا، اور جس کا حال یہ ہو اسے اسلامی فرقوں میں شمار ہی کرنا خود بھی مغالطہ میں مبتلا ہونا ہے

دوسروں کو بھی غلطی میں پھنساتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور جسے بلاشبہ
یت حاصل ہے وہ سنیوں اور شیعوں کے اختلافات ہیں، لیکن ان اختلافات کا جو حال اب ہی
ین اختلافات پر اس کی ابتدائی بنیاد قائم ہوئی، چونکہ دونوں میں بڑا عظیم فرق ہے اس لئے اس کا
ین کرنا کہ شیعوں اور سنیوں میں جو مقابلے ہوئے ان میں کن مقابلوں کی بنیاد صرف سیاسی اختلافات
ائم تھی اور کن مقابلوں میں واقعی مذہبی اختلافات مؤثر تھے یہ آسان کام نہیں ہے۔

تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شیعیت پر اب سیاسی اختلافات جو وقتی تھے ان سے زیادہ
بی اختلافات ہی کا رنگ غالب ہے، اس رنگ کے غلبہ کے بعد ان میں اور سنیوں میں کوئی
ابطہ مذہبی جنگ مذہبی اختلافات کی بنیاد پر ہوئی ہے؟ میں نہیں جانتا کہ اس کے ثابت کرنے
کوئی کامیاب ہوسکتا ہے، کچھ بھی ہو وہ "ہفتاد و دو ملت" والی جنگ کا افسانہ آپ دیکھ رہے ہیں
جائے واقعہ کے کس حد تک افسانہ ہی افسانہ ہے، اسی کے ساتھ کاش اگر لوگ اس پر بھی غور کرتے
ب نہیں جس زمانہ میں بھی ہو اسی زمانہ میں جب کتابوں والے یہ اسلامی فرقے دنیا میں موجود تھے
وقت بھی ان کے ماننے والوں کی تعداد کیا تھی؟ میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے مصنفین
زیادہ تر اس سلسلے میں ایسے ایسے فرقوں کے نام بھی درج کردیئے ہیں، جن میں شریک ہونے
ں میں بانی فرقہ اور اس کے بھائی بھتیجوں اعزہ و اقربا کے سوا شاید ہی کوئی اور ہوتا ہو، حتیٰ کہ
یں بعض تو ایسے ہیں کہ خود ان کے ایک شخصی وجود کے سوا اس فرقہ میں کسی دوسرے آدمی کو
داخل ہونے کی نوبت نہ آئی، دراصل وہ شخصی خیالات تھے، چونکہ عموماً ان خیالات کے پیدا
نے والے ارباب تالیف و تصنیف سے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے مسلک کی تائید میں کتابیں
ں، مصنفین نے یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس مصنف کے سوا دنیا میں اور بھی کوئی ان خیالات کا ماننے
ھا یا نہیں، فرقوں کی فہرست میں اس کے نام کا اضافہ کردیا[1] انشاء اللہ ان اسلامی فرقوں کے

---

[1] سلامی فرقوں کی اس کتابی فہرست سے شاید یہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ وہ مشہور حدیث یعنی آنحضرت صلی اللہ
لم نے فرمایا میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوکر رہے گی، جس کی نہ صرف سندہی (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

متعلق کسی مستقل مقالہ میں ان لطیفوں کا اظہار کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہوئی ہے کہ ان عقائد و خیالات پر بھی ان کے پیدا کرنے والوں کی موت کے ساتھ عموماً موت طاری ہوتی چلی گئی۔ عام مسلمانوں پر ان کا چونکہ کوئی اثر نہیں پڑا تھا اس لئے اپنے قدیم مسلک "ما انا علیہ و اصحابی" پر وہ اسی طرح قائم رہے بلکہ اب تک قائم ہیں جس طرح ان کی گذشتہ نسلیں طبقۃً بعد طبقۃٍ اسی پر قائم چلی آرہی تھیں اور جو بدلے تھے ان کی آئندہ نسلیں بھی بالآخر سمٹ سمٹا کر مسلمانوں کی اکثریت میں جذب ہو گئیں۔

اس سلسلہ میں انتہا یہ ہے کہ فرقۂ معتزلہ جن کا اثر عوام پر تو کم ہی پڑا تھا، لیکن اعیانِ دولت و حکومت کی اچھی خاصی تعداد مختلف زمانوں سے ان کے خیالات و عقائد سے متاثر رہی ہے، مگر باوجود اس کے معتزلہ کی عمر کی مدت بھی باعتبار زور و شور کے دو سو سال سے زیادہ نہیں رہی ہے۔ طاش کبری زادہ لکھتے ہیں۔

وکان علم الکلام بایدی المعتزلۃ مائتی سنۃ ما بین المائۃ والثلاث مائۃ (مفتاح ج ۲ ص ۳۷)	معتزلہ کے ہاتھ میں علم کلام کی باگ دو سو سال رہی یعنی پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری تک۔

اور پھر تو ان کا بتدریج یہ حال ہوا کہ جن کی کتابوں سے کتابخانے بھرے ہوئے تھے، ان کی کسی کتاب کا تو خیر کیا ذکر ہے کتاب کے کسی ورق کا ملنا بھی اب مشکل ہے، جو کچھ ان کے عقائد و خیالات کا سرمایہ پایا جاتا ہے وہ اہل سنت ہی کی کتابوں میں ہے تردید کرنے کے لئے جو کچھ

(بقیہ حاشیہ ص ۸۹) محدثانہ حیثیت سے قابل تنقید ہے "بلکہ میری امت" کے الفاظ کی تشریح میں بھی علماء کا اختلاف ہے بعض لوگ "میری امت" کے نیچے صرف مسلمانوں کو درج کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جنھوں نے آنحضرتؐ کے دعوی نبوت کو قبول کر لیا ہے جن کا اصطلاحی نام امت اجابت ہے لیکن بعض ارباب تحقیق "امتی" کے لفظ کو ان قوموں پر بھی مشتمل سمجھتے ہیں جن کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہیں۔ اصطلاحاً جن کا نام امت دعوت ہے یعنی جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی، خواہ انھوں نے آپ کی بات مانی ہو یا نہ مانی ہو، ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے ساری نسل انسانی کے ساتھ پیغمبر کی یہ پیشینگوئی متعلق ہو جاتی ہے اور نسلِ انسانی کا تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جانا محل تعجب نہیں۔ بہر حال اگر امتی سے مسلمان ہی یعنی امتِ اجابت ہی مراد ہو، تو پھر ان کتابی فرقوں سے اس حدیث کی تصحیح ہو سکتی ہے اور اس فہرست کا بھی ایک فائدہ ہو سکتا ہے۔ ۱۲۔

انھوں نے نقل کرلیا تھا، یا اسی طرح کسی اور ضرورت سے کتابوں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے، لے دے کر اعتزالی عقائد کے سراغ لگانے کا عام ذریعہ یہی ہے (صرف علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف اس کلیہ سے مستثنی ہے یا زیادہ کنج دکاوے سے کام لیا جائے، تو علم کلام کے سوا کسی دوسرے فن میں معتزلی علماء کی ایک دو کتابیں اور بھی مل سکتی ہیں)۔

یہ تھی داستان ہمارے ان مذہبی اختلافات کی جس کے بھروسہ پر چاہا جا رہا ہے کہ کلیسا اور کلیسا کے اختلافات کے خوں ریز، جہاں سوز، روح فرسا، نتائج نے جن قرونِ متوسطہ کو یورپ کے عیسائیوں میں پیدا کیا تھا، کسی نہ کسی طرح اسلام کی تاریخ میں بھی اسی قسم کے قرونِ متوسطہ کا کوئی گھناونا مرقع تیار کرلیا جائے۔ وَاَنّٰی لَھُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ۔ خدا کا دین ظاہر پکار رہا ہے۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ — کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

جس نے اب تک اسلام کے مبنیات کی حفاظت کرکے اختلافی مسائل کو مسلمانوں کے حق میں مفید ہی بنا دیا ہے، امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اس حال کو باقی رکھنے کا سامان کرتا ہی رہے گا۔

واللہ علی کل شئ قدیر — اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ اسلام کے غیر بنیاتی حصہ میں ہر اس شخص کا حق یہ ہو نا جسے واقعۃً "الامر" کا شرعی استحقاق ہو اور منصوصات معلومہ کو پیشِ نظر رکھکر غیر منصوصہ احکام کے استنباط کا جس میں واقعی ملکہ اور حقیقی سلیقہ ہو، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق بعض ظاہر بینوں نے یہ بھی مشہور کیا ہے کہ سب نہیں بلکہ ان میں کسی ایک کا حق پر ہونا ائمہ اربعہ کا مذہب ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ ان بزرگوں کی طرف اس کا انتساب ادعائی انتساب سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

والحق ان ما نسب الی الائمۃ	حق یہی ہے کہ ائمہ اربعہ کی طرف جو یہ بات منسوب کی گئی ہے
الاربعۃ مخرج من بعض	(یعنی سب کا نہیں بلکہ کسی ایک کا حق پر ہونا) اس کی کوئی
تصریحاتھم ولیس نصا	تصریح ان بزرگوں نے نہیں فرمائی ہے بلکہ جن باتوں کی انھوں نے

منہم [۱] تصریح کی ہے ان سے دوسروں نے یہ نتیجہ خود نکال لیا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

وانہ لاخلاف للامۃ فی تصویب المجتہدین فی ما خیر فیہ نصاً واجماعاً [۲] — دراصل امتِ اسلامیہ کے اندر اس مسئلہ میں کوئی اختلاف ہی نہیں یعنی نصاً واجماعاً طے شدہ فیصلہ ہے کہ جن مسائل میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے ان میں تمام مجتہدین حق پر ہیں،

پھر شاہ صاحبؒ نے ایک طویل گفتگو فرمائی ہے جس کا حاصل وہی ہے کہ غیر بیناتی مسائل میں تمام مجتہدین کا حق پر ہونا ایک اتفاقی مسئلہ ہے اور میں تفصیل سے اس پر گفتگو کر چکا ہوں، الات الامام خاتم الفقہا والمحدثین حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ علانیہ حدیث کے اسباق میں اس کا اعلان فرماتے تھے، ایک دفعہ نہیں، براہِ راست اس فقیر نے ان سے بیسیوں دفعہ یہی سنا کہ غیر منصوصہ مسائل میں سب حق پر ہیں، میرا حال تو یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل ہیں جن کا نام میں نے غیر بیناتی مسائل رکھا ہے، ان کے اختلافی پہلوؤں کے متعلق ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کا حق پر ہونا ایک ایسی بات ہے جس کی کوئی معقول ہو، یا غیر معقول توجیہ ہی سمجھ میں نہیں آتی بلکہ ان مسائل کے اختلافات کی نوعیت وہی معلوم ہوتی ہے جو قرآنی الفاظ کے تلفظ اور قراءۃ کے اختلاف کی ہے شاہ ولی اللہؒ نے بھی "کالقرات السبع" سے ان فقہی اختلافات کو تشبیہ دی ہے یعنی بالاتفاق سلفاً عن خلفٍ مسلمان یہی مانتے چلے آئے ہیں کہ ان قرأتوں میں سے جس قراءۃ کے ساتھ بھی قرآن پڑھا جائے سب صحیح اور درست ہے، گویا حدیث

انزل القرآن علی سبعۃ احرف — قرآن سات (یعنی بہت) حروف پر نازل ہوا ہے

کو مسلمانوں نے اپنے اجماع سے قطعی بنا دیا ہے، حالانکہ ان قراءتوں میں سے ہر ہر قراءت کا انتساب اسی طرح فنِ قراءت کے مختلف ائمہ کی طرف کیا جاتا ہے جیسے فقہ کے مختلف مکاتب خیال، اجتہاد کے مختلف ائمہ کی طرف منسوب ہیں، قراۃ میں بھی ہر ہر امام کی جماعت میں مختلف ذیلی ائمہ ہیں جیسے

---

[۱] عقد الجید ص ۱۵ [۲] ایضاً ۔ ۵۳ صحاح۔

فقہ میں ہیں، پس باوجود ان باتوں کے قرارۃ کے ان تمام اختلافی اشکال کو جن وجوہ سے حق سمجھا جاتا ہے، بجنسہٖ یہی بات اسلام کے غیر بیناتی مسائل کے ان اختلافات کے متعلق بھی یقین کرنی چاہیے۔

ان سطروں کے اضافہ کی ضرورت آخر میں اس لئے ہوئی کہ جب سے حالات بدلے ہیں اور مسلمانوں کا عمومی مزاج اعتدال کے اس نقطۂ ثقل سے منحرف ہو گیا ہے، جسے اپنی جگہ سے اسلام کی سیاسی طاقت ہلنے نہیں دیتی تھی، لیکن دباؤ ہٹ گیا، اور ہر جانے والے نے اپنی راہ پر جانے کا نام بجائے راہروی کے آزادی رکھ چھوڑا ہے۔ اس اتفاقی حادثہ کے جہاں بیسیوں تلخ نتائج ہیں، ان میں ایک نتیجہ وہ غلو بھی ہے جو بعضوں میں فقہ کے اجتہادی مسائل کے متعلق پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اسی کے ساتھ غالباً اس پر تنبیہ بھی نامناسب نہ ہوگی کہ قرارۃ کے اختلافات ہوں یا فقہیات کے، ہر ایک کے حق و صواب ہونے میں جو حال ان کا ہے یقین کرنا چاہیے کہ بجنسہٖ یہی کیفیت ان اختلافات کی بھی ہے جو باہم ان متکلمین میں پائے جاتے ہیں جو "بینات" پر متفق ہونے کے بعد بعض جزئی مسائل کی تشریح میں نقاطِ نظر کا اختلاف رکھتے ہیں مثلاً اشعریہ اور ماتریدیہ کے اختلافات کا جو حال ہے، اور یہی قاعدہ ان اختلافات پر بھی منطبق ہے جو ہمارے اربابِ قلوب و معرفت یعنی صوفیہ صافیہ میں قدرتی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید اپنی کتاب عبقات میں لکھتے ہیں۔

تفرق اهل الحق کالتفرق بین	اہل حق کا مختلف ہونا جیسے ائمہ اربعہ کا
الائمۃ الاربعۃ او بین الاشعریۃ	اختلاف یا اشعریہ و ماتریدیہ کا اختلاف یا صوفیہ
والماتریدیۃ او بین الوجودیۃ	میں وجودیہ (ورائیہ) اور شہودیہ ظلیہ کا اختلاف
الورائیۃ والشہودیۃ الظلیۃ او بین	یا مختلف سلاسل وطرق میں جو اختلافات
اهل الطرق فالحکم فیہ ان کل	پائے جاتے ہیں تو ان اختلافات کے متعلق فیصلہ
واحد منھم فی اکثر المسائل	یہی ہے کہ ہر ایک ان میں سے اکثر مسائل میں برسرِ حق
علی طریق حق ولکل وجھۃ	ہے اور ہر ایک اپنے سامنے ایک "رخ" رکھتا ہے

هو مولیها فاستبقوا الخیرات۔ (ص ۱۳۴) | جس کی طرف وہ توجہ کئے ہوئے ہے پس (مسلمانو) نیکیوں میں باہم ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرو۔

اسی بنیاد پر فرماتے ہیں۔

فمن اتبع واحدا منهم فاز بالمقصود۔ | پس ان میں جس کسی کی کوئی پیروی کرے گا مقصود کو پالے گا۔

سچ پوچھئے تو مولانا نے وہی بات کہی ہے جسے ابتدا میں عمر بن عبد العزیز خلیفہ رضی تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں۔

لو اختلفوا فاخذ رجل بقول احد اخذ بالسنة | جب صحابہ مختلف ہوئے تو ان میں سے کسی ایک کے قول کو جو اختیار کر لیگا سنت کو پالیگا۔

یا جیسا کہ تلمیذ الصدیقہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت قاسم بن محمد فرمایا کرتے تھے

ای ذلک اخذت به لم یکن فی نفسك منه شئ۔ | (صحابہ کے مختلف اقوال) میں سے جس قول کو بھی تم اختیار کرلوگے چاہئے کہ پھر جی میں کوئی کھٹک باقی نہ رہے۔

اور جیسا کہ میں بہ تفصیل عرض کر چکا ہوں کہ مسلمان اپنے دین کے ان تمام شعبوں میں سلفاً عن خلف اسی خیال پر قائم اور اسی بنیاد پر ان کا عمل دائم تھا۔ بلکہ حضرات صوفیہ صافیہ کے متعلق "الموافقات" میں علامہ شاطبی نے جو ایک خاص نقطۂ نظر پیش کیا ہے، چونکہ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کے متعلق اس سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے، چاہتا ہوں کہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں جو کچھ کہنا ہے اس پر "اختلاف" کی اس بحث کو ختم کردوں۔

(باقی آئندہ)

علم نقل الکلمہ[۱]

Metathesis

از جناب میجر خواجہ عبدالرشید صاحب، آئی۔ ایم۔ ایس

قدیم تہذیب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا کہ متعدد نام اور اصطلاحات مختلف زبانوں میں مختلف زبانوں کے اندر کچھ تھوڑے اختلاف کے بعد اختیار کرلئے جاتے ہیں، ان اصطلاحات کی ترکیب کے وقت ان کی شکل شباہت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے ان کو جذب کر لیا جاتا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑے سے ردوبدل کے بعد وہ اصطلاحات دوسری زبان میں بالکل منتقل کرلئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کافی سے زیادہ تبدیلی بھی واقع ہو جاتی ہے۔ نقل کی یہ صورت دو طرح کی ہوتی ہے۔

ایک یہ کہ جب ایک قوم تہذیب و تمدن کا پرچم لیکر ابھرتی ہے تو وہ اپنے زمانے کے علوم کو نہ صرف ترقی ہی دیتی ہے بلکہ گذشتہ علوم میں اپنی طرف سے اضافہ کرکے انھیں اپنے علوم میں شامل کر لیتی ہے۔ اسی سلسلہ میں جو معلومات اس قوم کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ان کے نام یہ خود تجویز کرکے انھیں اپنے ذخیرۂ لغات میں جمع کر لیتی ہے، لیکن جب یہ تہذیب ختم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد آنیوالی تہذیب ان تمام علوم کو جذب کرنا شروع کر دیتی ہے۔ زمانہ قدیم سے یہی چلا آیا ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے۔ پھر جو ہم عصر تہذیبیں ہوتی ہیں، وہ بھی ایک دوسرے کے علمی شاہکاروں سے مستفید ہوتی رہتی ہیں۔ اور اگر ان دونوں قوموں کی زبانیں مختلف ہوں تو ایک دوسرے

---

[۱] یہ اصطلاح میری اپنی بنائی ہوئی ہے۔ مجھے میٹاتھیسس (Metathesis) کے لئے مناسب لفظ نہ ملا تو میں نے (Transpition of words.) کا ہی ترجمہ کیا۔

کی اصطلاحات جو مناسب حال ہوں، ان کو منتقل کرکے اخذ کرلیا جاتا ہے۔

جب عرب قوم عروج پر تھی تو انھوں نے تمام گزشتہ علوم کو جذب کرلیا تھا، اور ایک نئی ریسرچ کی روح پیدا کردی تھی۔ ان سے پہلے مصری، ایرانی، بابلی، کلدانی اور آشوری تہذیبیں اپنے اپنے وقت میں کمال حاصل کرچکی تھیں، لیکن ان کا بھی یہی حال تھا کہ ایک قوم دوسری قوم سے علم حاصل کرتی اور اس کو ترقی دیتی تھی۔ ان تمام تہذیبوں کا باہم اثر و تاثیر بہت نمایاں ہے، اور علمی لحاظ سے ان میں بہت کچھ یگانگت پائی جاتی ہے۔ یونانیوں سے عربوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ان کی بہت سی علمی اصطلاحات کا ترجمہ کرکے انھیں اپنے تراجم میں شامل کیا۔

عربوں کے بعد جب موجودہ یورپین تہذیب کا دور دورہ ہوا۔ تو انھوں نے عربوں ہی سے علم حاصل کیا۔ تمام علوم انھوں نے عربی زبان ہی سے سیکھے، چنانچہ عربی زبان کے پُر معنی الفاظ کا انھوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور بہت سی اصطلاحات کو منتقل کرکے اپنی زبان میں اختیار کرلیا۔ اس طرح فلسفۂ لغات کی رو سے جو یہ نقل ہوئی تو یہ تراجم اصطلاحات پر منحصر تھی نہ کہ نقل الحروف پر، یہ بھی دراصل نقل کلمہ کی ایک قسم ہے۔ مثال کے طور پر چند اشارات کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ صاحب ذوق کے لئے ناکافی ہوں تو انھیں اس موضوع پر کسی کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

عربی زبان میں فندق ہوٹل کے لئے مستعمل ہے، یہی لفظ ہسپانوی زبان میں فونڈا Fonda بن گیا ہے۔ اب ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ ان دونوں الفاظ میں کس قدر تطبیق ہے، اگرچہ دو مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ پھر "تعریفۃ" کا لفظ لیجئے جس کے معانی عربی زبان میں نوٹس کے ہیں، انگریزی زبان میں یہ لفظ Tariff کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی بہتیری مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے احتراز کیا جاتا ہے۔

بعض زبانوں میں الفاظ کا تلفظ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک زبان سے کوئی لفظ اخذ کیا جاتا ہے تو اس کی آواز قائم رکھنے کے لئے دوسری زبان کے کسی مشابہ حرف کا تلفظ ویسا ہی بنالیا جاتا ہے، جو اصل لفظ کے تلفظ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ مثلاً ہسپانوی زبان میں

Legacy of Islam Oxford 1943 ۳۲

ف "ایکس" (x) کا تلفظ سترہویں صدی عیسوی تک حرف "ش" (SH) کی طرح تھا۔

نقل کلمہ کی دوسری قسم میں الفاظ کے اندر حروف کی ترکیب بالکل بدل جاتی ہے، مگر اکثر
ف وہی رہتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں جاتا ہے
ن ہے کہ یہ دوسری زبان بولنے والی قوم اس کا تلفظ بہ آسانی اسی طرح نہ کرسکتی ہو، لہذا وہ اس کو اس طرح
ل کرتی ہے کہ اس کے حروف تو وہی رہتے ہیں مگر ان کی ترکیب یا پوزیشن بدل کر اس کے تلفظ میں
لت پیدا کر دیتی ہے۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حروف اڑا دیئے جاتے ہیں اور اس طرح
نے کے لئے آسانی پیدا کرلی جاتی ہے۔

آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی اقوام کا ورود ہمارے ملک میں بوجہ جنگ ہو رہا ہے جن
ے اکثریت انگریزی بولنے والوں کی ہے، ان میں سے بہت لوگوں کو ہمارے کچھ الفاظ پسند ہیں
ر اس لئے کہ ان میں وضاحت زیادہ ہے مثلاً "بندوبست" کا لفظ بہت استعمال ہوتا ہے اور
ید ہی کوئی امریکیائی یا انگریز ایسا ہو جس کو یہ لفظ پسند نہ ہو مگر وہ اس کو پورا استعمال نہیں کرتے فقط
It was a
ندو" ہی کہہ لیتے ہیں اور اپنا مطلب پورا کر لیتے ہیں۔ جس طرح "بندو"
Good band

اسی طرح "ٹھیک" کا لفظ بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے، اور چونکہ اس کا تلفظ آسان
ن ہے یہ اس کو "ٹیک" یعنی (TEEK) کہتے ہیں! یہ ہمارا آج کل کا ذاتی مشاہدہ جو ہم اپنے
ا کو دوسری زبان میں منتقل ہوتا دیکھ رہے ہیں گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد بہت سے اردو کے الفاظ
یزی لغات میں شامل کرلئے گئے تھے۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی نظر آتا ہے جن حالتوں میں الفاظ و حروف
ا دیئے جاتے ہیں تو ان کی یہی وجہ ہوتی ہے کہ یا تو جذب کرنیوالی زبان میں وہ حروف ہی
ں ہوتے اور یا اس قوم کا تلفظ ہی اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ ان الفاظ کو ادا نہیں کرسکتی۔ اور
س میں اپنی زبان کے مناسب حروف کا استعمال کرتی ہے۔

اس نقل میں ایک بات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے وہ یہ کہ جن علامات یعنی (Syllables)

پر زیادہ زور رہتا ہے ان کو تبدیل نہیں کیا جاتا، یعنی لفظ کا ڈھانچہ بعینہ وہی رہا جو اصلی زبان میں تھ
اب کچھ اس نقل کی تاریخ بھی بیان کر دینا ضروری ہے۔ تاکہ آئندہ مثالوں کے لئے سہولت پیدا ہو ج
کسی ایک زبان کو لیجئے، یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب ایک زبان بولنے والے مختلف گروہوں
میں تقسیم ہو کر مختلف سمتوں میں بکھر جاتے ہیں، تو کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ان کے لب و لہجہ میں اختلاف
واقع ہو جاتا ہے۔ جب کچھ اور عرصہ گذرتا ہے تو یہ زبان بالکل ہی مختلف نظر آنے لگتی ہے ماہرین
فن ضرور اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ اختلاف محض زمان و مکان ہی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہو
بلکہ اس میں آب و ہوا اور زمین کا بھی دخل ہے۔ جس وقت ایک مقام سے ہجرت کی وجہ سے نقل و
حرکت شروع ہوتی ہے تو نہ صرف زبان بلکہ تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور نشست و برخاست
ہر ایک چیز میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی مہینوں یا برسوں کا معاملہ نہیں
اس کو صدیاں لگ جاتی ہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود اس قوم کے بنیادی اصول میں
حقیقتاً کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔

اصل قوم کی روایات وہی رہتی ہیں اگرچہ اکثر نام بدل جاتے ہیں، البتہ اتنا ضرور ہوتا ہ
کہ مکان اور ماحول کے مطابق واقعات کی اہمیت یا شخصیتوں کے خواص بدل جاتے ہیں یا ان کی
صفات میں ترمیم ہو جاتی ہے۔ نام ہر حالت میں وہی رہتے ہیں فقط ہجے بدل جاتے ہیں۔ پھر یہ دقت
بھی پیش آتی ہے کہ اگر ایک قوم کا رسم الخط دوسری قوم کے رسم الخط سے بالکل ہی مختلف ہوتا ہے
اور اس میں نہ تو اتنے حروف ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی ترکیبیں، تو پھر ایسی تحریروں کا حل یعنی
(Deciphernent) مشکل ہو جاتا ہے۔ خطِ میخی کے جس قدر کتبے Cuneiform Writings
بھی آج کل حل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں، ان تمام میں ہمیں ایک چیز بہت نمایاں نظر پڑتی ہے اور وہ
یہ کہ ایک بادشاہ کا نام مختلف مقاموں سے حاصل شدہ کتبوں میں مختلف ہے، در اصل ان میں اختلاف
نہیں ہوتا۔ اور بات یہ ہے کہ جس زبان سے یہ نام حاصل کیا جاتا ہے تو اس کو خطِ میخی میں نقل کرتے وقت
حروف میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے پھر جب ہم اس کو حل کرتے ہیں

یعنی اس کو (Decipher.) کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کا بادشاہ جس کی یہ خصلتیں تھیں اور جس نے یہ کام کئے تھے، ایک اور قوم میں بھی ہو چکا تھا، حالانکہ بادشاہ ایک ہی ہوتا ہے جو مختلف مقاموں پر حکمراں ہوتا ہے۔ تمام روایات اور قصے مل جاتے ہیں۔

لیکن ماہرین فن نے بعض اوقات ان واقعات و روایات کا باہم تعلق ثابت کرتے کرتے بہت پیچیدگیاں حائل کردی ہیں۔ حالانکہ اگر حل کرتے وقت یہ چیز معلوم ہو جائے تو اس کو وہیں درست کر دینا چاہئے، نہ کہ بعد میں بال کی کھال نکالی جائے۔ اس چیز کا ہم کو ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانے کی جو تحقیق قدیم تاریخ کے متعلق ہے ہمارے سامنے موجود ہے اس میں مختلف جگہوں سے برآمد شدہ بادشاہوں کی فہرستیں بہت حد تک ایک ہیں مگر حقیقی مطابقت کا ثابت کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارے پاس اس چیز کا ثبوت موجود ہے کہ ایک راجہ دشرتھ عراق کے شمال میں حکمراں تھا مگر اس کے لڑکے رام چندر کے نام میں اس قدر نقل واقع ہو چکی ہے کہ وہ کسی طرح بھی رام چندر کا والد ثابت نہیں ہو سکتا۔ اکشواکو جو (Ikshwaku.) آرین نسل کا سب سے پہلا بادشاہ تھا اور جس کا نام مہا بھارت اور گیتا میں بھی ملتا ہے اس کا نام بھی اکثر کتبوں میں ملا ہے نہ صرف یہ بلکہ سارگونِ اعظم یا ساگر (Sargon the Great or Sagar) کے متعلق ہمارے پاس متعدد اسناد موجود ہیں کہ یہ دونوں عراق کی سرزمین پر حکمراں تھے۔ خیر وہ تو تاریخی پہلو ہے ہمیں غرض صرف ان کے ناموں سے ہے۔ ذیل میں ابھی ہم ذکر کریں گے کہ سارگون اعظم کے نام میں کس کس قسم کا اختلاف پیدا ہوا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس کا ذکر کریں۔ ہمیں لفظ فرعون کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔

لفظ فرعون سے متعلق تحقیق

اس لفظ کے متعلق حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور مولانا حفظ الرحمٰن نے قصص القرآن میں نہایت مدلل بحث کی ہے۔ ہم تمہید کے طور پر مولانا حفظ الرحمٰن ہی کا بیان لیتے ہیں جو کہ زیادہ تر ترجمان القرآن ہی کی تفصیل پر مبنی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر اس کا لقب فاراع (فرعون) تھا۔ اس لئے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا۔ اور بادشاہِ وقت اس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا۔ یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا[1]۔

سطور بالا سے ہمیں کچھ اطلاع لفظ فرعون سے متعلق ملی، مگر اتنا تو کافی نہیں ہمیں اور غور کرنے سے قدیم تاریخ کے اندر ایک شخصیت جس کا ابھی اوپر ذکر کیا ہے، موسوم بہ سا... اعظم ملتی ہے۔ جو اپنے وقت میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر حکمراں تھا۔ اور مسٹر ایل۔ ویڈل صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مصر پر بھی حکمراں تھا اور وادئ سندھ میں بھی اسی کی راجدھانی تھی۔ اس ایک لڑکا جس کا نام مینز (Menes) تھا۔ سندھ کا گورنر مقرر تھا۔ اس نے بغاوت کردی اور کچھ ف... لیکر مصر بھاگ گیا۔ اس پر قابض ہوا اور اپنے آپ کو اس نے پارو (Pharooh.) کہلانا شروع... اس کی کچھ مہریں جو مصر سے برآمد ہوئی ہیں ان پر اس نے اپنے آپ کو پارو یا فرعون لکھا ہے... زمانہ تقریباً ۳۰۵۰ قبل مسیح ہے۔ چونکہ ہمیں اس وقت الفاظ و اصطلاحات کی ساخت و ترکیب ... سے تعلق ہے۔ ہم اس تاریخی تشخیص کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے۔ یہ سند ہمیں اور بھی متعدد کتابو... میں ملتی ہے۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ عربی و عبرانی زبانوں کے رسم الخط میں حرف "پ" (P) نہ ہونے کی وجہ سے اس کو "ف" (F) کے ساتھ بدل دیا گیا ہو جس طرح "پارسی" کو "فارسی" ... گیا تھا۔ اسی طرح یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ یہ لفظ کسی وقت میں پارو ہی ہو اور عربوں نے اس ... ساتھ "ف" لگا کر اس کو فارو، یا فاراع یا فرعون بنا دیا ہو۔ مسٹر ... لکھتے ہیں کہ فرا (Phra.

---

1. The Makers of Civilization in Race of History by ... A. waddell. L L D; C.B. CIE Liolae 1929.

2. A Brief History of Eastern Asia. London 1900

سیامی (Siamese) زبان میں ایک لفظ ہے جو دراصل خدا کے معنی دیتا ہے، مگر بعد میں
اس سے مراد بادشاہ ہونے لگا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ فرا اسی فرعون کی ایک ابتدائی شکل ہے۔ اس لفظ
کے ارتقار کے سلسلے کی کڑی ایک اور ابھی باقی ہے اور وہ لفظ پربھو (Pra-Bhu) ہے۔ یہ
سنسکرت کا لفظ ہے، اس کے معنی بادشاہ یا حاکم کے ہوتے ہیں یعنی Lord of The Land
ہماری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ یہ لفظ بھی سمیری سے اخذ کیا گیا تھا۔ اور اس کا اصل بر (Bar) اور برو
(Baru) ہے جس کے معنی بھی بادشاہ اور حکمراں کے ہیں۔ اس سمیری لفظ کو جب آرین ہندوستان
میں آئے تو برہمنوں نے منتقل کیا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب سارگون اعظم یعنی سارگن مصر پر قابض
ہو چکا تھا اور اس کو اس طرح منتقل کرنے سے مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اب مصر کی سرزمین پر حکمراں ہو کر
فرعون یعنی Pharooh کہلایا۔ چنانچہ Paru Baru کا بن گیا اور اسی سے Fara
اور پھر Farón فرعون بن گیا! واللہ اعلم بالصواب

یہ اشارات جو ابھی کیے گئے ہیں ان کو مکمل کرنے سے پیشتر میں ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں
جو اس وقت میرے ذہن میں آ گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں متعدد نسلیں موجود ہیں اور ان کی متعدد
ہی زبانیں ہیں۔ انسانیت کا آغاز ایک ہی آدم علیہ السلام سے ہوا۔ لہذا سب کی زبان شروع
شروع میں ایک ہی تھی، یہ جو نظریے میکس مولر وغیرہ نے Max Mullor نے بنا دیئے ہیں
سامی اور غیر سامی اقوام کے متعلق تو یہ محض عارضی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سامیوں کا باوا آدم
ہی اور تھا اور غیر سامیوں کا اور۔ لیکن جب آہستہ آہستہ آبادی میں اضافہ ہوا تو وہ گرد و نواح میں پھیل گئی
انسانیت کا اولین فرد خواہ آپ سائنس کی رو سے دیکھیں یا مذہب کی رو سے ایک ہی تھا، اور یہ
ایک ہی مقام پر تھا، اور اسی ایک مقام سے انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے سیلاب مختلف
اطراف میں امنڈ پڑے۔ زمانے کے حوادث اور موسموں کا تغیر و تبدل، ان گروہوں کو جگہ جگہ لیے پھرا
اور ہر موافق مقام میں یہ صدیوں تک جاگزیں رہتے۔ تا وقتیکہ موسموں کی ناموافقت نے ان کو
کسی بہتر جگہ کی تلاش میں سرگرداں کر دیا ہو۔ اور چونکہ کرہ ارضی کا موسم تبدیل ہوتا رہتا ہے اور کئی

بدل چکا ہے، یہ گروہ اول اول خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ اور پھر جب ان کا ذہنی ار
اس قدر بلند ہوگیا کہ یہ ایک تمدن کی بنیاد رکھ سکتے۔ حکومتیں قائم کرسکتے اور بہت سی ترقی بھی
تھے۔ مگر ایک وقت پھر آتا جب ان میں دوبارہ حرکت پیدا ہو جاتی، تو یا تو یہ تلاش معاش کی وج
ہوتا۔ یا یہ اس قدر اقتدار میں بڑھ جاتے کہ دوسرے ملکوں پر حملہ کر دیتے تاکہ اپنی راجدھانی کو پھ
جن ملکوں پر یہ حملے کرتے اور انہی کے ملک ہوتے تھے۔ جہاں ان کے بھائی وغیرہ رہا کرتے
غرضیکہ ہزارہا سال تک یہ سلسلۂ دوران اقوام جاری رہا، اور یہ اقوام بار بار اپنے اصلی مرکز
طرف رجوع کرتی رہیں۔ اب یہ کہنا کہ ایک خاص قوم دنیا کے کسی خاص خطہ سے وابستہ ہے
یہ بالکل غلط ہے۔ مثلاً مستشرقین ہمیشہ یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ آرین اقوام وسط ایشیا سے آئیں
بال گنگا دھر تلک اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ وہ قطب شمالی سے آئیں، ہمارے نزدی
یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ ان کا اصل مقام وہی مرکز ہے جہاں انسان اول حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائ
ہوئی۔ خواہ وہ مقام کہیں بھی ہو۔ اگر یہ اقوام آرین وسط ایشیا یا قطب شمالی سے آئیں تو یہ کچھ
عرصہ پیشتر وہاں نہ تھیں۔ بلکہ اپنے اصلی مرکز سے حرکت کر کے وسط ایشیا میں پہنچی تھیں یا مشرق
میں لوٹنے سے پیشتر وسط ایشیا سے قطب شمالی کی طرف جا چکی ہیں جہاں سے دوبارہ لوٹیں
حضرت آدم علیہ السلام کا اصلی مقام معین کرنے کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت بس کرتی
تمام نظریوں سے بہتر نظریہ اقوام یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اِنَّ اَوَّلَ
بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ اسی آیت سے صاف
ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی بنیاد جو رکھی گئی تو وہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کے ہاتھوں
رکھی گئی۔ اور یہ جگہ مکہ تھی جو کئی ہزار سال کے بعد تباہ ہوگیا تھا۔ مگر پھر ایکبار حضرت ابراہیم علیہ السلا
کے زمانے میں یہ آباد ہوا۔ اور اس کی تعمیر انھیں اولین بنیادوں پر ہوئی جن کے آثار قائم تھے۔ ایک جگ
کا بیت اللہ کہلانا اس کی مرکزیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں ہر طرف سے تمام لوگ بہ آسا

...l Artic Home in the Vedas. 1902.

رسائی حاصل کر سکیں۔

ثابت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بھی اسی کے گرد و نواح میں اول اول پھلی پھولی اور یہاں ہی سے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئی۔ تاریخ کا ایک بہت طویل زمانہ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، اور اگر کبھی کچھ نظر بھی پڑتا ہے تو اس کے بعد ہزارہا سال تک ہماری نظروں سے سب کچھ اوجھل ہو جاتا ہے۔

قدیم تاریخ کے ماہرین جدید تحقیق کو مد نظر رکھکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہ دجلہ و فرات کی جو تہذیبیں تھیں، وہ دنیا کی تاریخ میں قدیم ترین تہذیبیں تھیں۔ چنانچہ حال ہی میں بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ مصر و چین کی جو تہذیبیں تھیں وہ دجلہ و فرات کی تہذیبوں سے بہت بعد کی ہیں۔

حالانکہ جو ثبوت اب تک فراہم ہو چکے ہیں وہ صرف اتنی ہی بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ جو جو تہذیبیں اس وقت تک معلوم ہو چکی ہیں، ان میں سب سے قدیم بابلی، کلدانی، اور حتی تہذیبیں ہیں، مگر ان اقوام کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جن کے حالات ابھی ظاہر ہی نہیں ہوئے۔ اور جن کا زمانہ ابھی تک ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہوا۔ والقصہ بطولہا۔ ہمارا کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو تہذیبیں ہمیں مختلف دفتوں میں نظر آتی ہیں ان سب کا سلسلہ ایک ہی تہذیب اور تمدن سے شروع ہوا۔ اور جہاں جہاں یہ گروہ بستے چلے گئے وہاں وہاں ان کے آثار اب ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ اصل حقیقت کے لئے ابھی پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!!

ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آرین اقوام دجلہ و فرات کی وادی ہی سے وسط ایشیا کی طرف بڑھیں اور یہ دجلہ و فرات کی تہذیب کو اپنے ساتھ لے گئیں اور جب انھوں نے وہاں قیام کیا تو اس تہذیب میں اور بہت سا اضافہ کیا۔ کئی صدیوں کے بعد وہ ہمیں پھر دوبارہ ایران میں لوٹتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مختلف گروہ جن کا نقشہ مندرجہ ذیل ہے ایران میں آتے آتے مختلف ناموں سے موسوم ہو گئے جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں چنانچہ دجلہ و فرات

کی تہذیب کو اب آرین تہذیب کہا جانے لگا۔ یہ کہاں تک درست ہے مستقبل کا مورخ اس کی تصدیق کریگا

آرین اقوام کا نقشہ

سنہ [illegible] قبل مسیح سے مختلف گروہ قطب شمالی سے ایران آنے شروع ہوئے اور

سنہ [illegible] ق م تک یہ آتے گئے ان کے نام یہ ہیں۔

عیلامی		سمیری	بابل کی طرف ہجرت	میتانی	حتی
ELAMITES	KASSITES	SUMERIANS		MITANIS	HITTITES
ان کی سلطنت بابل میں سنہ [illegible] ق م کے قریب ختم ہو گئی۔	ہندوستان میں سنہ [illegible] ق م کے اغلب داخل ہوئے اور کھتری کہلائے۔	سارگون اعظم کے عہد میں ہندوستان کے اندر داخل ہوئے اس کے لڑکے MENES نے مصر پر قبضہ کرکے اپنا نام پارو یا فرعون رکھا۔	مادہ لوگ MEDES ہندوستان کو سنہ [illegible] ق م	(ایشیائے کوچک)	(اناطولیا سے) ہندوستان کو سنہ ۱۷۰۰ ق م

اسی طرح جب یہ اقوام اپنے مرکز سے شمال کی طرف بڑھیں تو کچھ کچھ گروہ جنوب کی طرف بھی چلتے رہے، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں سورہ طٰہٰ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"نسلِ انسانی کے اقوام انشعاب کا ایک مرکزی سرچشمہ جزیرہ نمائے عرب بھی رہ چکا ہے یہاں کے صحراؤں میں یکے بعد دیگرے نسل انسانی کا مواد بنتا رہا اور پھر اُبل اُبل کر دور دور تک پھیلتا گیا۔ فلسطین، شام، عراق، آرمینیا، اور خلیج فارس کی ساحلی آبادیاں سب اسی مرکزی نسل کا انشعاب تھیں اور سب کا تمدن اسی عربی نسل کا تمدن تھا"

مولانا نے نہایت مختصر اور دلچسپ الفاظ میں وہی چیز پیش کردی ہے جس کی تفصیل کی طرف میں ابھی آرہا تھا۔ جو اقوام شمال کی طرف بڑھیں اور اسی راہ سے واپس لوٹیں ان کا نام مستشرقین نے آرین اقوام رکھ دیا۔ اور جو جنوب کی طرف پھیل گئیں ان کو سامی اقوام کہا گیا اگرچہ اس تقسیم کے

اور بھی لوازم ہیں تاہم یہی سب سے ضروری ہیں۔ شمال کی طرف جانے والے گروہ، تو ہم کہہ چکے ہیں کہ قطب شمالی تک پہنچے اور تبت سے ہوتے ہوئے چین اور جاپان چلے گئے۔ ایک طرف قفقاز اور ترکستان سے ہوتے ہوئے روس اور یورپ بھی پہنچے۔ اب جو اقوام جنوب کی طرف بڑھیں وہ زیادہ تر سمندر کے راستوں یا ساحلوں کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں تک پہنچیں۔ ہندوستان وارد ہوئیں تو وہاں سے برما اور آسام اور دیگر جزائر میں گئیں۔ جزائر سے آسٹریلیا بھی جا پہنچیں۔ افریقہ اور امریکہ بھی ان کا گذر ہوا۔ پھر جو قومیں اسی طرح دور دراز ملکوں میں جا بسیں وہ تو واپس نہ لوٹیں۔ ایک تو سفر کی تکالیف اور پھر فاصلہ اسقدر، انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ

"حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے"

مگر یہ زیادہ ترقی نہ کر سکے کیونکہ اصل مرکز سے دور نکل چکے تھے۔ اور نہ ہی ان کا تصادم ترقی یافتہ گروہوں کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ یہ انھیں اولین مہاجر گروہوں کے آثار ہیں جو اب بھی امریکہ میں مندروں کی شکل میں مل رہے ہیں۔ یہ ان کے عبادت خانے ہیں۔ مگر چونکہ یہ گروہ باقیوں سے بالکل کٹ چکے تھے اس لئے بالکل وحشی کے وحشی ہی رہے اور انھوں نے کوئی ترقی نہ کی جو ترقی پسند تھے انھوں نے حکومتوں کی بنیادیں رکھیں۔ بعض گروہوں کو حالات کے مطابق ایجادات کرنا پڑیں تاکہ زندگی بسر کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے اسی طرح انھوں نے سائنس کی بنیاد رکھی اور بہت سے گروہ ایسے بھی تھے جو موسموں کی ناموافقت کے زیر اثر معدوم بھی ہو گئے۔ ان کے ڈھانچے ... (FossiLs) ہم کو آج کل مل رہے ہیں۔

موہنجو دارو (Mohinjo daro) اور ہڑپا (Harappa) کی تہذیبوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آرین تہذیبیں نہ تھیں بلکہ جو قومیں کہ آرین کی آمد سے پہلے ہندوستان میں پہنچ چکی تھیں یہ ان کی تہذیب کے آثار تھے۔ چنانچہ وہ اقوام دراوڑ (Dravi Dians) کے نام سے مشہور ہیں۔ اور یہ وہی اقوام ہیں جو اول ہندوستان میں آئیں۔

غرضیکہ جہاں جہاں یہ گروہ گئے یہ وہاں کچھ عرصہ کے لئے آباد ہوتے چلے گئے اور ساتھ ساتھ

ایک عارضی تہذیب قائم کرتے چلے گئے۔ ان کے روابط دوسری قوموں سے بھی رہے اور راہ و رسم بھی جاری رہی۔ چنانچہ یہ بات کہ وادیٔ سندھ کے قدیم لوگ بابل کے لوگوں سے راہ و رسم رکھتے تھے کتبات سے ثابت ہو چکی ہے۔

آرین اقوام کی آمد اور دوسرے گروہوں کا مدوجزر اس بات کا مسلم ثبوت ہے کہ تمام اقوام مختلف وقتوں میں اپنے اصلی مقام سے ہجرت کرتی ہوئی آئی تھیں اور ان کا تصادم وقتاً فوقتاً دوسری اقوام سے ہوتا رہتا تھا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو جاتی۔ ایک نئی زبان بن جاتی اور مذہب میں ایک نیا رنگ آجاتا۔ جو الفاظ فوراً ہی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے تھے وہ عموماً صفات اور اسماء پر مشتمل ہوتے تھے ان میں حروف اور ضمائر بہت کم ہوتے تھے یہ ان الفاظ کا ذکر ہے جو فوری تصادم کا نتیجہ ہوتے۔ ورنہ جو تبدیلی الفاظ میں دقت پیدا کرتا تھا اس کا معاملہ بالکل برعکس رہتا۔ مذاہب کی اصل بنیادیں قائم رہتیں اور ہر زمانے میں کچھ اشخاص ایسے ضرور ہوتے تھے جو حقیقت سے آشنا ہوتے تھے۔ ہمیں قدیم تاریخ کی جدید تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی روایات مختلف اقوام کی تاریخ میں مشترکہ ہیں، نہ صرف یہ بلکہ متعدد دیوتاؤں کے نام بھی ایک ہی ہیں۔

تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ قارئین کرام کے سامنے اس وقت آرین اور میتانی (Mitani) دیوتاؤں کے نام پیش کیے جاتے۔ نیز اور بہت سی روایات ہیں جن میں نہ صرف ناموں ہی کی یگانگت پائی جاتی ہے بلکہ قصوں کے موضوع بھی یکساں ہی نظر آتے ہیں اور بیشتر قدیم مذہبی عقائد بھی مشترکہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بابلیوں اور آشوریوں نے اپنا مذہب آرین سے لیا۔ مذہب دراصل ایک ہی تھا اور وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو نبوت سے سرفراز کر کے ان کو مختلف ممالک میں بھیجتا اور وہ اِن کو ان کی بھولی ہوئی تعلیم یاد دلا دیتے۔ چونکہ اس اصل تعلیم کا مبنیٰ حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی تھا اس لئے ان مذاہب میں ایک قسم کی یگانگت پائی جاتی

نا جو مدتیں گزرنے کے بعد محرف ہو جاتی اور بار دیگر انبیاء کی ضرورت محسوس ہوتی۔ دراصل اکثر اس
ریف کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ زمانے کے حوادث اور زبان کا اختلاف اس میں خلل انداز ہوتا اور کچھ
درتی مناظر انسانی ذہن میں اس قدر پیچیدگیاں پیدا کر دیتے کہ جو تھوڑا بہت مذہبی تخیل کا احساس موجود
ہتا اس کا استدلال ایسے حالات کے اندر بذریعہ استخراج محض اساطیر کی شکل بن کر رہ جاتا۔
تباری لحاظ سے ان کی تحلیل اغراض پر مبنی ہوتی اور جب وقتی ضروریات الوہیت کا مقصد پورا
ردیتی تو اقوام ان کا تتبع کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی ترقی کے لئے اصل مذہب
سے اس کی تطبیق بھی کر لیتی۔ چنانچہ قدیم وجدید تثلیث بھی اصل مذہب کی تحلیل ہی ہے!۔
حول کی کیفیت انسانی ذہن پر اس قدر جلد اثر کرتی ہے کہ اس میں نہ صرف مذہبی تحریف و انتشار
پیدا ہوتا ہے بلکہ اس میں طرح طرح کی رسومات اور بدعات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے
ختلف حصوں میں مختلف قدرتی مناظر اس قدر پر اثر ہوتے ہیں کہ انسانی ذہن ان کو قبول کرنے
یں بہت عجلت سے کام لیتا ہے مگر جوں جوں عقل کا ارتقار تکمیل تک پہنچتا ہے۔ وحی بھی ترقی
رتی جاتی ہے۔ اور وحی پے در پے، مختلف ممالک میں جہاں کہیں بھی اولاد آدم ہوئی، ان کو
متنبہ کرنے کے لئے نازل ہوتی رہتی اصل تعلیم ایک تھی لیکن زبان میں اختلاف ہو جانے کی وجہ
سے وحی کی زبان بھی بدل جاتی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

یہ سلسلہ مدتوں تک جاری رہا۔ دنیا کا کوئی گوشہ نہ تھا جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف
سے پیغامبر نہ بھیجے ہوں۔ قدیم مذہبی کتب اور قرآنِ کریم بھی اسی کے شاہد ہیں۔ اور جب
فرداً فرداً ہر ایک قوم کو تعلیم دے دی گئی تو پھر اس وقت ایک ایسے رسول کی ضرورت تھی جو تمام
دنیا کے لئے ایک بین الاقوامی قانون لیکر آئے اور اسی منصبِ علیٰ پر خداوند کریم نے رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کو سرفراز کیا۔ اس شریعت کا پہلا مقصد یہی تھا کہ دنیا کے سامنے یہ چیز پیش کرے کہ اللہ تعالیٰ
نے دنیا کے ہر گوشہ میں اپنا پیغام بھیجا جو لوگوں کو متنبہ کرتا رہا۔ مگر اب ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جو
اقوام کے لئے ایک بین الاقوامی پروگرام پیش کرے۔ اور ان کو ان کی بھولی ہوئی تعلیم از سر نو یاد دلائے

چنانچہ قرآنِ کریم نے نازل ہوتے ہی یہ اعلان کیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ تمام قدیم مذاہب نے اپنی مقدس کتابوں کی چھان بین شروع کردی۔ اور اصل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے یہ قرآنِ کریم ہی کا معجزہ ہے کہ اس وقت تمام مذاہب اپنی اپنی تعلیم کو درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بت پرستی فقط معدودے چند میں رہ گئی ہے۔ محمود غزنوی بیچارے کو خواہ مخواہ کوسا جاتا تھا اب وہی کوسنے والے، ذرا ملاحظہ کیجئے کیا فرماتے ہیں۔

سر رادھا کرشن کا ارشاد ہے۔

"روحانی اقدار میں پائدار اور مستقل اصلاح ہماری زندگیوں کی سب سے زیادہ گہری ضرورت ہے۔ لوگوں میں ایک نیا دل وہی مذہب پیدا کر سکتا ہے جو فرد میں تبدیلی پیدا کرنے کو اپنا ایک اصول بنا لیتا ہو اور جو انسان کی روح میں تاریک نقش کی جگہ الٰہی روشنی پیدا کرتا ہو۔"[1]

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار اب اگر علانیہ نہیں تو عوام دبے لفظوں میں ضرور کرتے ہیں۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

ہاں تو گذشتہ سطور میں ہم نے لفظِ فرعون کا ذکر کیا تھا۔ اب ہم ایک اور مثال لیتے ہیں جس میں الفاظ کی ظاہری شکل بدل جاتی ہے مگر حروف تقریباً وہی رہتے ہیں۔

Sargon the Great سارگونِ اعظم جس کا ذکر کچھ دیر ہوئی اوپر کیا ہے۔ اس کا نام مختلف شکلیں اختیار کر گیا ہے۔ یہ اکشواکو Ikshwaku جو سب سے پہلا آرین بادشاہ تھا، اس کے لڑکوں میں سے تھا۔ اس کے نام کی ہم کچھ تفصیل ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] Eastern Religion and Western Thought London 1937.

مختلف تہذیبوں کے کتبوں میں اس کا نام اس طرح مندرج ہے

کتبات کش Kish	آرین بادشاہوں کی ہندوستانی فہرست	سمیری خط میخی	آرق خاندان Erech	خاندان کش Kish
Sharru Kin	Shakuni = sagara = Pracin-wat = Bardwaja.	Urudugina = Bar-gin Sharp-Ganni = Barduibuz	gunni = ganni	Shakin = Sha-gin = Shagur =

مندرجہ بالا چارٹ کو سامنے رکھئے اور ذیل کی عبارت پر ایک لمحہ کے لئے غور فرمائیے :-

ویڈل (L.A. Waddell) صاحب فرماتے ہیں :-

"The equation of the Sumerian Bargin Baragin and Barduibuz with the Indian Pracin-wat and Bardwaja are noteworthy

یہ جو نام بارگین (Bargin) اوپر بیان کیا ہے دراصل خط میخی کے کتبوں میں اسی بادشاہ کا نام اردو گینا (Urudu Gina) لیا گیا ہے موصوف مصنف فرماتے ہیں۔

"The Second syllable of that name reds Du as well as ka and Du seews to be the Correct from in view of one of the Indus Versions gining his name as B'Ardowaja"

چنانچہ ویڈل صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سارگون اعظم کا اصل نام سارگون نہ تھا بلکہ

"Gir or gani, Guni or Shar or Shar-guni"

اور جو فہرست ہمیں ہندوستان سے ملی ہے اس میں سارگون کا نام کونی یا گنی (Kuni) یا شرگنی (SharKuni) آیا ہے جس کے ساتھ ساگارا کا لقب چپاں ہے اور اسی ساگارا سے سارگون پیدا ہوگیا ہے۔

اب ایک اور مختصری مثال لیجئے۔ اہلِ یہود کی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لئے Iloha کا لفظ ہے۔ مگر جس ہستی کی اہلِ یہود عبادت کرتے ہیں اس کا نام تورات میں Jehovah ہے یورپین علمار نے یہ چیز ثابت کردی ہے کہ لفظ Jehovah دراصل یہودی لفظ ہی نہیں ہے بلکہ کلدانی لفظ ہے جو yavhe پکارا جاتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہی لفظ سنسکرت میں yavha کی شکل میں ملتا ہے اور ان تمام کے معنی بھی وہی ہیں جو اللہ کے ہیں۔ اس لفظ میں بھی جو اصل بنیاد ہے لفظ کی وہ تمام ساختوں میں قائم نظر آتی ہے صرف حروف کی پوزیشن بعض جگہ بدل گئی ہے۔ یا محض آواز یا تلفظ میں فرق آگیا ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ لفظ ایک ہی ہے! اور اس کا مفہوم بھی ایک ہی!! تو پھر جب قرآنِ کریم کی اس تحقیق نے قدیم مذاہب کو اپنے تئیں نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کیا تو سب نے دبے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا

زبان کا مسئلہ ایک نہایت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے، جس کو ابھی تک وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکا۔ جب ہم بحیثیت مجموعی قدیم تاریخ اور تمدن پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ایک بات نہایت صاف نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ قدیم اور جدید عربی تمام قدیم اور جدید زبانوں میں جذب ہو چکی ہے۔ چنانچہ مستشرقین کے بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ جس قدر بھی قدیم کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر ملاوٹ عربی الفاظ کی ہے۔ یہاں تک کہ حمورابی (ایک سمیری بادشاہ تھا جو کہ بابلی سلطنت کے پہلے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۲۱۳۰ ق م ہے) کی مشہور شریعت بھی عربی زبان میں تھی۔ اگرچہ رسم الخط میخی تھا۔ اسی طرح بہت سے خطِ میخی کے کتبے برآمد ہوئے ہیں جن کو ترجمہ کے بعد جب پڑھا جاتا ہے تو بہت سے عربی الفاظ ملتے ہیں۔ اس تحقیق کے متعلق

a. Gita Rhasya By B.G. Tilak vol II

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن کی جلد دوئم میں صفحہ ۴۸۷ پر لکھتے ہیں "یہ زبان جس پر زندگی وخلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی، دراصل مدنی نشوونما کے اتنے مرحلوں سے گذر چکی تھی کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف میں اس کی شریک نہیں۔ سمیری اور اکادی اقوام کا تمدن، نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج واحاطہ، کلدانی اور سریانی کا ادبی تمول، دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل وتکمیل کے مختلف مرحلے تھے اور اسی نے آگے چل کر چوتھی صدی قبل مسیح کی عربی کا بھیس اختیار کیا۔"

ماہرین علم الآثار قدیمہ نے زمینوں کے پیٹ چاک کر دیئے تاکہ اس تحقیق کی سندیں حاصل کر سکیں نے بھی کچھ کھیل اس قسم کے دجلہ وفرات کی وادی میں ہوتے دیکھے مگر نتیجہ یہ نکلا کہ طرح طرح کے کتبے تھ لگتے رہے، بعض تو حل ہوگئے اور بعض انسانی عقل وفہم کو دنگ کر گئے۔ اتنا ضرور ہوا کہ طرح طرح کے نام اور اصطلاحات حل ہوئے جن سے کچھ کھوج ضرور چلا۔ مگر ماہرین فن بجائے اس تطبیق کو آمد ثابت کرنے کے انھوں نے مختلف مذاہب پر حملے شروع کر دیئے۔ چنانچہ بتایا گیا کہ یہودیوں کا ب کلدانیوں سے لیا گیا ہے اور بعض یورپین علمائے تو یہ بھی کہدیا کہ گیتا کی تعلیم انجیل ہی کی تعلیم ہے نکہ ان کو یہ اس وقت معلوم نہ تھا کہ گیتا کا زمانہ انجیل سے بہت پہلے کا زمانہ ہے (اس بیان تفصیل کے لئے دیکھئے بال گنگا دھر تلک کی گیتا راسیا جلد دوئم باب گیتا اور عیسائیت) اور پھر یہ بھی یا کہ قرآن کریم کی تعلیم انجیل اور توراۃ سے لی ہوئی ہے۔" ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

ے بیشتر کہ یہ مضمون ختم کیا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمن کی تصنیف لطیف سے کچھ اس دیا جائے اور کچھ انبیاء کے نام میں جو نقل واقع ہوئی ہے اس کو بھی قلمبند کر دیا جائے۔ مولانا فرماتے بہ نظر تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ناموں کے متعلق اسی قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف ایں منتقل ہونے کی وجہ سے کتابت کی تصحیف وتبدیل کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے یعنی توراۃ کا عوض اور عرب کا موص اور اسی طرح توراۃ کا زارح اور مورخین کا زراح دونوں ایک ہی ہیں۔" یہ اقتباس ہم نے حضرت یہ السلام کے بیان سے لیا ہے جہاں مولانا یوباب اور ایوب کے ناموں میں یگانگت ثابت کرتے ہیں

زہیر بن ابی سُلمیٰ

سوانح حیات اور کلام پر تبصرہ

(۲)

از ڈاکٹر محمد یوسف صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی اُستاذ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ومن ھاب اسباب المنیۃ یلقھا ولورام اسباب السماء بسُلّم

جو موت کے اسباب بھاگتا ہے اس کو بالآخر اُن سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے اگرچہ وہ سیڑھی لگاکر آسمان تک ہی کیوں نہ چڑھ جائے۔

ومن یعص اطراف الزجاج فانہ یطیع العوالی رکبت کل لھذم

جو شخص کہ نیزوں کے نیچے کے سرے سے نہیں مانتا اس کو نیزوں کے اوپر کے سرے کے آگے جس میں نوکِ سنان ہوتی ہے بے بس ہونا پڑتا ہے

ومن یوف لا یذمم ومن یفض قلبہ الیٰ مطمئن البر لا یتجمجم

جو وفا کرتا ہے اس کو برا نہیں کہا جاتا اور جس کے دل میں نیکی بیٹھ جاتی ہے اس کو تردد اور خلجان نہیں رہتا۔

ولیس لمن لم یرکب الھول بغیۃٌ ولیس لرحل حطہ اللہ حامل

جو خطرہ پر نہ سوار ہو وہ کوئی مراد نہیں پا سکتا۔ اور جس پالان کو اللہ گرادے اس کا کوئی اٹھانیوالا نہیں مل سکتا

اذا انت لم تقصر عن الجھل والخنی أصبت حلیما او اصابک جاھل

اگر تو جہالت اور بیہودگی سے باز نہ آئیگا تو تیرا پالا تو کسی مدبر انسان سے سابقہ ہوگا ورنہ کسی جاہل آدمی سے پالا پڑیگا۔

حکمیات کے ذیل میں ایک قصیدہ زہیر کی جانب منسوب کیا جاتا ہے جس میں نعمان بن منذر کا ذکر ہے لیکن اصمعی کا کہنا ہے کہ یہ قصیدہ زہیر کا نہیں بلکہ ایک اور شاعر صرمۃ الانصا کا ہے۔

نوٹ کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ زھیر ایک مافوق الفطرۃ ہستی کا تصور رکھتا ہے جس کو اللہ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ اللہ سے کوئی بات مخفی نہیں وہ انسانوں کے اعمال کی خبر رکھتا ہے اور "یوم الحساب" میں ان کا بدلہ دے گا۔ وہ کہتا ہے:۔

فلا تکتمن اللہ ما فی نفوسکم　　لیخفی ومہما یکتم اللہ یعلم

تمہارے دلوں میں جو کچھ ہوا سے اللہ سے مت چھپاؤ اس خیال میں کہ وہ چھپا رہیگا۔ اللہ سے جو کچھ چھپایا جاتا ہے وہ اسے جان لیتا ہے

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر　　لیوم الحساب او یعجل فینقم

تو اس کے بارے میں تاخیر ہوتی ہے پس وہ ایک کتاب میں درج کرکے یوم حساب کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے اور اگر جلدی کی گئی تو اس کا بدلہ لیا جاتا ہے

ایک اور جگہ کہتا ہے۔

تزوّد الی یوم الممات فانہ　　ولو کرھتہ النفس آخر موعد

موت کے دن کے لئے زادراہ مہیا کرو اس لئے کہ وہ دن خواہ نفس اس سے کتنا ہی بھاگے آخری وعدہ کا دن ہے۔

وہ ہر فعل انسانی کی اخلاقی قدروقیمت پہچانتا ہے:۔

والاثم من شر ما یصال بہ　　والبر کالغیث نبتہ أمِرُ

گناہ بدترین چیز ہے کہ جس کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا جاتا ہے اور نیکی ایک ابر کے مانند ہے جس سے بکثرت سرسبزی ہوتی ہے

مستشرقین عموماً اس قسم کے خیالات کو عیسائیت کا مرہون بتاتے ہیں اور بظاہر اس میں کلام کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اسلام سے پہلے ان عقائد کے حامل عیسائی اور یہودی ہی تھے جن کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں عرصۂ دراز سے عرب میں قائم تھیں۔ عربوں میں جو لوگ راستباز اور صداقت پسند ہوتے تھے وہ ان عقائد کی طرف فطرۃً مائل ہوتے تھے۔

زہیر فطرتاً اس قدر انصاف پسند واقع ہوا تھا کہ اس نے اپنی عقل سے رفع خصومت کا وہ اصول وضع کیا جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ بلا کم وکاست حضرت عمرؓ کی ان مشہور ہدایتوں میں سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے قاضی ابوموسیٰ اشعری کو دی تھیں۔ زھیر نے اس اصول کو کس خوبصورتی سے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

وان الحق مقطعه ثلاث یمین او نفار او جلاء

حق کو فیصل کرنے کی یقیناً تین ہی صورتیں ہیں، ایک قسم، دوسرے کسی کو حَکَم بنانا اور یا پھر یہ کہ معاملہ کی حقیقت واضح ہو
(اتنی کہ جھگڑے کا امکان ہی نہ رہے)

فذلکم مقاطع کل حق ثلاث کلهن لکم شفاء

حق کو فیصل کرنے کی یہی صورتیں ہیں اور ان تینوں میں تمہارے لئے اطمینان اور سکون کا سامان ہے

رہے زہیر کے اس قسم کے اقوال کہ "ومن لا یظلم الناس یظلم" اور "ومن لا یذد بالظلم یظلم" (جو خود ظلم نہ کرے اس پر ظلم کیا جاتا ہے) تو ان سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ ظلم و غارت گری اور لوٹ مار کی تلقین کرتا ہے۔ نہیں بلکہ زہیر سوسائٹی میں نظام اور امن کا سب سے بڑا حامی ہے۔ ان اقوال میں دراصل خود اعتمادی کی تعلیم ہے جو اس دور کے حالات کی آئینہ دار ہے، اس دور میں جبکہ کوئی قانون اور کوئی حکومت قانون کی پابندی کرانے والی نہ تھی اپنے تحفظ اور جائز حقوق کی حفاظت کا دار و مدار ہمیشہ اپنی ذاتی قوت و شوکت پر تھا۔ اگر انسان دوسروں کے مقابلہ میں زبردست نہ ہوتا تو وہ بہت جلد کسی ظالم کے ظلم کا شکار ہو جاتا اس لئے زہیر اپنے دور کے حالات میں عزت کی زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتا ہے اور وہ یہی ہے کہ اس کو اتنی طاقت ہو کہ ظالم ہو مظلوم نہ ہو۔ زہیر کے دیگر اشعار اور اس کے عام رجحانات اس کی حق پرستی و انصاف پسندی کی دلیل ہیں۔

حیوانات اور صید و شکار کی تصویریں

شعرائے عرب کے یہاں اکثر تشبیب کے ذیل میں حیوانات اور صید و شکار کی تصویریں ملتی ہیں۔ زہیر کا کلام بھی ان سے عاری نہیں۔ اس میدان میں زہیر اگرچہ لبید وغیرہ کے پایہ کو نہیں پہنچتا تاہم متوسط درجہ ضرور رکھتا ہے۔ ایک جگہ اپنی اونٹنی کو وحشی گدھے (عیر) سے تشبیہ دیتا ہے۔

أذلك ام شتیم الوجه جأبٌ علیه من عقیقته عفاء

اس کے مابعد تیرہ [۱۳] اشعار میں عیر کی زندگی کے مختلف حالات اور تفصیلات کا بیان ہے جو

بہت اعلیٰ درجہ کا نہ سہی لیکن اچھا خاصا ہے۔ ایک جگہ قطا کی تصویر کھینچتا ہے:۔

وردواُفرعنها اختها الشرك ١٢ شعر | کانها من قطا الأجباب حلأها

یہ تصویر ندرت رکھتی ہے۔ ایک جگہ شکار کا بھی ذکر کرتا ہے۔

متی نرہ فاننا لا نخاتله | اذا ما غدونا نبتغی الصید مرة

جنگ و غارت کی تصویر بہت زیادہ موثر اور حقیقت سے قریب ہے۔

قعس لکواهل فی اکنافها شمم | کانوا فریقین یصغون الزجاج علیٰ

ان میں دو قسم کے افراد تھے کچھ تو نیزوں کو ایسے جانوروں پر اٹھائے ہوئے تھے جن کے کاندھے باہر نکلے ہوئے تھے اور جنکے بازو اونچے اونچے تھے

من نسج داؤد اوما اورثت ارم | واٰخرین تری الماذی عدتهم

کچھ اور لوگ تھے جو زرہ پہن کر تیاری کئے ہوئے تھے۔ ایسی زرہ جو حضرت داؤد کی بنی ہوئی، یا ارم سے ورثہ میں آئی ہوئی تھی۔

لاینکصون اذا ما استلحموا و حموا | هم یضربون حبیك البیض اذ لحقوا

جب ان کی مڈبھیڑ ہوتی ہے تو وہ تلوار کے دستوں پر چوٹ مارتے ہیں اور جب وہ لڑائی میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور ان کو جوش آجائے تو وہ پسپا نہیں ہوتے

شد السروج علیٰ اثباجها الحزم | ینظر فرسانهم امر الرئیس وقد

ان کے شہسوار اپنے رئیس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ اس حال میں کہ گھوڑوں کی پیٹھ پر زین کے بند کسے ہوئے ہوتے ہیں۔

حتی اذا ما بدا للغارة النعم | یمرونها ساعة مریا باسوقهم

وہ شہسوار اپنی پنڈلیوں کے اشارے سے تھوڑی دیر ان گھوڑوں کو دوڑاتے ہیں یہاں تک کہ جب لوٹ مار کیلئے مویشی سامنے آتے ہیں۔

تحثك درّاتها الارسان والجذم | شدوا جمیعا وکانت کلها نهزا

تو وہ سب کے سب ایک دم جھپٹ پڑتے ہیں مویشی بآسانی حملہ کا نشانہ ہوتے ہیں اور گھوڑے ان گھوڑوں کی دوڑ کو مسلسل اور تیزی کے ساتھ جاری رکھتے ہیں۔

تشبیہات | زھیر تشبیہات کا بادشاہ ہے۔ اس کی تشبیہات بعض تو بہت سادی، بسیط اور معنی خیز ہوتی ہیں جیسے: "فهن لوادی الرس کالید للفم"

(وہ مشاہدان ہودج نشین وادی رس کی طرف ایسی بڑھ رہی تھیں جیسے ہاتھ منہ کی طرف) اور

بثوا خیولھم فی کل معرکۃ کما تقاذف ضرب القین بالشرر

انھوں نے ہر معرکہ میں اپنے گھوڑے دوڑائے اور (ایسا معلوم ہونے لگا) جیسے لوہار کے ہتھوڑا مارنے سے شرارے اڑنے لگتے ہیں۔

ہودج سواروں کو جو اونٹنیوں پر ریگستان طے کر رہے ہیں کشتی سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ تشبیہ دیگر بالخصوص طرفہ کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ زہیر کہتا ہے:۔

یقطعن أمیال اجواز الفلاۃ کما یغشی النواتی غمار اللج بالسفن

وہ (اونٹنیاں) وسط ریگستان کے میلوں کو اس طرح طے کرتی ہیں جیسے ملاح موجوں کے بیچ بیچ کشتی ڈال دیتے ہیں

یغشی الحداۃ بھم وعث الکثیب کما یغشی السفائن موج اللجۃ العرکُ

حدی خواں ان کو ٹیلے کی نرم ریت پر اس طرح لیجاتے ہیں جیسے کہ ملاح کشتیوں کو سمندر کی موجوں پر گذارتے ہیں۔

اپنی اشکبار آنکھوں کو پانی سے بھرے ہوئے ڈول اور لڑی سے ٹپکتے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دیتا ہے:

غرب علی بکرۃ او لولوء قلق فی السلک خان بہ ربّاتہ النظم

(میری آنکھ) اونٹنی پر رکھا ہوا ڈول ہے یا جھڑتے ہوئے موتیوں کی لڑی ہے جس کے تاگے نے مالک کے ساتھ بے وفائی کی ہو (یعنی ٹوٹ گیا ہو)

کبھی کبھی زہیر کی تشبیہات مرکب اور بہت طویل ہوتی ہیں۔ ان میں اس کی قوتِ تخیلہ خوب کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کی متخیلہ کا مواد صرف محسوسات ہوتے ہیں۔ زہیر کی یہ تشبیہیں بہت مشہور ہیں۔ جنگ کے ہولناک نتائج کو یوں بیان کرتا ہے:۔

فتعرککم عرک الرحی بثفالھا وتلقح کشافا فتحمل فتتئم

جنگ تم کو ایک چلتی ہوئی چکی کی طرح پیس کر رکھدے گی۔ وہ (جنگ) پے درپے بلا فصل حاملہ ہوگی اور جڑواں بچے پیدا کرے گی

فتنتج لکم غلمان اشأم کلھم کاحمر عاد ثم ترضع فتفطم

وہ ایسے بچے جنے گی جو سب کے سب احمر عاد کی طرح منحوس ہوں گے۔ پھر وہ ان بچوں کو دودھ پلائے گی اور پالے گی یہاں تک کہ دودھ چھڑانے کے قابل ہوں۔

فتغلل لکم مالا تغل لاھلھا　　قری بالعراق من قفیز و درھم

تمہارے لئے جنگ کی پیداوار کہیں زیادہ ہوگی غلہ اور مال کی اس پیداوار سے جو عراق والوں کو اپنی زمینوں سے حاصل ہوتی ہے۔

زہیر کی تشبیہات کا بہترین نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے مخاطب سے کہنا چاہتا ہے کہ تو نے مال چھین لیا لیکن نہ تو اسے اپنے کام میں لا سکتا ہے نہ واپس کرتا ہے تیرے لئے ایک مرض بن کر رہ گیا ہے۔ اس مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے۔

تلجلج مضغۃ فیھا انیض　　اصلت فھی تحت الکشح داءُ

تو ایک کچا بدبودار گوشت کا لوتھڑا منہ میں بھرے ہوئے ہے۔ پس یہ تیرے پہلو میں ایک مرض بن کر رہے گا

غصصت بنیھا فبشمت عنھا　　وعندک لو اردت لھا دواءُ

اولاً یہ سخت گوشت تیرے حلق میں پھنسا پھر اس نے بدہضمی پیدا کی۔ اگر تو چاہے تو تیرے پاس اس کی دوا موجود ہے۔

عشق بازی ترک کردینے کو کہتا ہے۔ "وعرّی افراس الصبا و رواحلہ"

نوجوانی کے تمام گھوڑوں اور سواریوں پر سے زین اتار لی گئی"

ایک بہت ہی لطیف تشبیہ زہیر کی مشہور ہے جس میں اس نے محبوبہ کو ایک شعر میں تین چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔

تنازعھا المھا شبھا و در النحور وشاکھت فیھا الظباء

ہرن، جنگلی گائے اور گلے کے موتی سب اس محبوبہ کی مشابہت میں مشترک ہیں۔

فأما ما فویق العقد منھا　　فمن أدماء مرتعھا الخلاءُ

کمر بند سے اوپر کا حصہ جسم تو اس سفید ہرنی جیسا ہے جو بیابان میں چرتی ہو اور تنہائی کے خوف سے بار بار گردن بلند کرتی ہو

واما المقلتان فمن مھاۃ　　وللدر الملاحۃ والصفاءُ

دونوں آنکھیں جنگلی گائے جیسی ہیں ـــــ اور ملاحت اور صفائی موتی کی ہے

دیوبند میں علم کی پہلی درسگاہ

عہدِ عالمگیری کے دو پروانے

از جناب سید محبوب حسن صاحب رضوی دیوبندی

گیارہویں صدی ہجری کے اوائل سے دیوبند میں سادات کا ایک خاندان آباد ہے اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہے سید محمد ابراہیم (قدس اللہ سرہٗ) دیوبند اور اس کے اطراف و جوانب میں دعوت و تبلیغ کا سب سے پہلا کام اسی بزرگ ہستی کی ذات سے انجام پذیر ہوا۔ اور متعدد قومیں ان کے ہاتھ پر شرفِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئیں۔

دعوت و تبلیغ کے علاوہ تعلیم و تدریس اور تذکیر و تزکیہ کا سلسلہ بھی خاصے اچھے پیمانہ پر جاری تھا۔ دین کی اُن خدمات سے جو محض حسبتہً للہ انجام دی جاری تھیں۔ دہلی کی حکومت بھی بے خبر نہ تھی۔ چنانچہ اس نے متعدد مرتبہ مختلف اوقات میں سید صاحب کے اخلاف کو وظائف اور جاگیریں عنایت کیں۔ عطایا کا سلسلہ جہانگیر سے شروع ہو کر محمد شاہ اور نواب نجیب الدولہ پر ختم ہوتا ہے۔

سید صاحبؒ کے خاندان میں مرورِ زمانہ سے اس وقت کے فرامین اور کاغذات اکثر و بیشتر تو تلف ہو گئے ہیں۔ کچھ البتہ باقی ہیں۔ ان ہی میں عہدِ عالمگیری کے دو پروانے ہیں جن کے ذریعہ سے دیوبند کی تعلیمی تاریخ میں ایک جدید باب کا انکشاف ہوتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ دیوبند میں علمِ دین کا چرچا دارالعلوم کے قیام ۱۲۸۳ھ سے وابستہ ہے لیکن عہدِ عالمگیری کے ان پروانوں سے جو ذیل میں درج ہیں پتہ چلتا ہے کہ یہاں اس زمانہ کی

عام روش کے مطابق خانقاہ میں تزکیہ وتذکیر کے ساتھ ساتھ تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا پروانہ میں مرقوم ہے کہ :-

"دریں ولا شیخ وجیہ الدین کہ بصلاح وتقوی آراستہ لیاقت تمام دارد، بجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس وتذکیر با جماعت طالب علمان وفقرار وصوفیان مشغول ست"

دیوبند میں علم کی غالباً یہ اولین شمع تھی جس کو گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں حضرت الحاج سید محمد ابراہیم قدس اللہ سرہٗ کے مبارک ہاتھوں نے روشن کیا تھا۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت سید احمد شہید قدس اللہ سرہٗ ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے تو فرمایا کہ "یہاں سے علم کی بو آتی ہے" سید شہیدؒ کے اس مقولہ کو دارالعلوم کی نسبت بطور مکاشفہ و پیش گوئی کے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن راقم السطور کا خیال ہے کہ جس "بو" کو سید شہیدؒ نے محسوس فرمایا تھا وہ اسی گلدستۂ علم کی بو تھی جو سید شہیدؒ کے قریبی زمانہ تک موجود تھا۔

عہدِ عالمگیری کے پروانے

عہدِ عالم گیری کے جن دو پروانوں کا اوپر ذکر آیا ہے وہ سید وجیہ الدین اور سید محمد صابر بن سید محمد عارف رحمہ اللہ علیہم سے متعلق ہیں، ان کی نقل ذیل میں درج ہے :-

"متصدیانِ مہماتِ حال واستقبال پرگنہ دیوبند بدانند کہ چوں موازی دوصد و ہفتاد و یک بگیہ ۲۷۱ بسوہ زمین بگر اہی منجملہ پانصد بگیہ بموجب اسناد حکام و بموجب پروانہ مہرایں جانب باسم غفران پناہ معارف آگاہ سید محمد عارفؒ ولد مغفرت پناہ بندگی حضرت سید محمد اسمٰعیلؒ از قدیم الایام بجہت خرچ خانقاہ از پرگنہ مذکور مقرر است۔ معارف آگاہ سید محمد عارف مرحوم ودیعت حیات سپرد دریں ولا شیخ وجیہ الدین پسران غفران پناہ کہ بصلاح وتقوی آراستہ لیاقت تمام دارد بجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس وتذکیر با جماعت طالب علمانؒ

فقراء و صوفیان مشغول است و خرچ خانقاہ فی سبیل اللہ مصروفست بنا بر آں تصدق فرق مبارک بندگان حضرت سلیمان منزلت خدیو زمین و زماں باعث امن و امان۔

موازی مسطور بدستور سابق از محلِ قدیم باسم پسر غفران پناہ مذکور بموجب خمس شرط قبض و تصرف آں مقرر و مسلم داشتہ شد کہ حاصلات آں را فصل بفصل و سال بسال صرف معیشت طالب علماں و فقراء و صوفیاں خانقاہِ خود نمودہ بدعا رگوئی دوام دولت ابد اشتغال می نمودہ باشد۔ تحریر فی التاریخ ہفدہم شہر شوال المکرم سنہ ۲۶ جلوس والا۔"

یہ پروانہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانہ میں غضنفر خاں صوبیدار شاہجہاں آباد کی مُہر خاص سے ۲۷ شوال المکرم سنہ ۲۶ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۹۳ھ میں جاری ہوا۔ اس کے بعد ذیل کا یہ دوسرا پروانہ دوسرے صوبیدار محمد عرب بن محمد خسرو کی مہر سے ۱۱ شعبان المعظم سنہ ۳۰ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۹۷ھ میں صادر ہوا۔

"متصدیان حال و استقبال پرگنہ دیوبند بدانند کہ چوں موازی دو صد و بست و ہشت بیگہ یازدہ بسوہ زمین بگڑآہی باسم سیادت پناہ سید محمد عارف ولد غفران پناہ حضرت بندگی سید محمد اسمٰعیل کہ منجملہ پانصد بیگہ زمین بموجب سند جاگیرداران پیشین از موضع مہتولی در وجہ مدد معاش شیخ محمد صابر و غیرہ پسران غفران پناہ مذکور از قدیم الایام بجہت اخراجات خانقاہ مذکور مقرر است، سید محمد عارف ودیعت حیات سپرد دریں ولا دو پسر بجائے پدر خود خانقاہ بتدریس و تذکیر یا جماعت طالب علماں فقراء و صوفیاں مشغول اند و خرچ خانقاہ فی سبیل اللہ مصروف است بنا برآں حسب الحکم خان عالیشان و تصدق فرق مبارک بندگان حضرت سلیمان منزلت خدیو زمین و زمان باعث امن و امان۔

موازی مسطور بدستور سابق از محل قدیم باسم پسران غفران پناہ مذکور مطابق خمس شرط قبض وتصرف آنہا مقرر ومسلم داشتہ شد کہ حاصلات آنرا فصل بفصل وسال بسال صرف معیشت طالب علمان وفقرا وصوفیان وخود ہا نمودہ بدعا گوئے دوام دولت ابد اشتغال می نمودہ باشند۔ بتاریخ یازدہم شعبان المعظم سنہ ۳۰ جلوس والا۔"

پروانوں کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ "عطائے معافیات" کا مقصد صرف [ان] حضرات کو وسائلِ معاش سے مطمئن کرنا نہ تھا بلکہ اس کا اصل مصرف طلبائے علوم دینیہ [او]ر طالبانِ طریقت کے طعام وقیام کے مصارف تھے۔ اس زمانہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جو لوگ [تو]کل علی اللہ علم اور دین کی خدمات محض لوجہ اللہ انجام دیتے تھے حکومتِ وقت وظائف [او]ر معافیات کے ذریعہ ان کو مالی امداد بہم پہنچاتی تھی۔

اس کا افسوس ہے کہ ہمارے پاس آج کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہوسکتا [کہ] خانقاہ میں طلبا اور صوفیا کی کس قدر تعداد مقیم رہتی تھی۔ اور کتنے لوگوں نے اس سے ظاہری [او]ر باطنی استفادہ حاصل کیا۔ البتہ ایک تحریر سے اس قدر سراغ ضرور ملتا ہے۔ کہ خانقاہ [سے] متعلق ایک کتب خانہ بھی تھا۔ جس میں کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ خانقاہ کی [آت]ش زدگی میں یہ ذخیرہ بھی برباد ہوگیا۔

[سکھ]وں کی آتش زدگی [اور] خانقاہ کی تباہی

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں خانقاہ اور اس کا تمام نظام درہم برہم ہوگیا۔ کیونکر ہوا؟ یہ داستان ایک نہایت دل خراش اور ہولناک حادثہ [پر مش]تمل ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۱۱۸۹ھ (بعہد شاہ عالم) میں سکھوں نے قزاقانہ طور پر دیوبند [کو] تاخت وتاراج کیا۔ لوٹ مار کے دوران میں جن لوگوں نے کچھ بھی مزاحمت کی۔ سکھوں نے [ان] باکرائن کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگادی، اور دیوبند کے متعدد محلوں کو جلا کر خاکستر کردیا۔ [خا]نقاہ نشینوں کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا۔ اس کی کیفیت ایک درخواست سے معلوم ہوتی ہے

جو زعمائے خانقاہ کی جانب سے منصوبہ آراضی کی واگزاری کے سلسلہ میں ۱۲۱۸ھ / ۱۸۳۹ء میں جبکہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ سہارنپور کی عدالت کلکٹری میں پیش کی گئی تھی۔ اس واقعہ کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ چونکہ مرورِ ایام کے سبب سے یہ واقعہ خود دیوبند کی تاریخ میں بھی عام طور پر بھلایا جاچکا ہے، بنابریں اس موقع پر درخواست کی نقل پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ درخواست میں مرقوم ہے :۔

"سوال می کنند وشہادتِ حق می خواہند اضعف العباد مسیمان حافظ مقبول عالم وجانِ عالم وعلی بخش وکریم الدین وبدر الدین وغلام حسن وملا الٰہی بخش و سراج الدین ونجابت علی ساکنون قصبہ دیوبند از سادات عظام ومشائخ کرام و قانون گویان راسخ الکلام وزمینداران وغیرہ سائر سکنہ جمہورا نام پرگنہ مرقوم برایں معنی کہ احوال حادثات تاخت وتاراج وغارت گری وسوختگی قصبہ مسکنِ ماسائیلون از زیادتی تعدی زمرۂ سکھان برمان از شوامت قسمت مسکن ماسائیلون کرۂ بعد اولیٰ ومرۂ بعد اخریٰ بر جمیع صغار وکبار ایں دیار ہویدا وآشکار خصوصاً ایں دفع اُخریٰ کہ بتاریخ نہم شہر ربیع الاول ۱۱۸۹ھ کھنیگ سنگھ و مادھو سنگھ وجیت سنگھ وتارا سنگھ وصاحب سنگھ کھنڈا وغیرہ بجمعیت یک لکھ سوار وپیادہ از مقام قصبہ اندری[۱] کہ تخمیناً مفاصلہ چہل کُروہ[۲] خواہد بود شباشب باختہ محاصرہ مسکین ماسائیلون شدہ بغارتے وسوختگی اماکن ومساکن ماسائیلون

---

[۱] اندری کا محل وقوع ماورائے جمن پنجاب کے ضلع کرنال میں ہے اب اس کی حیثیت محض گاؤں کی ہے۔

[۲] کُروہ: (بہر دو پیش) فاصلہ میں اختلاف ہے۔ بعض اس کی مسافت چار ہزار گز بتلاتے ہیں اور بعض بقدر ایک میل (۱۷۶۰ گز) چنانچہ نفائس اللغات اوحد الدین بلگرامی میں لفظ "کوس" کے تحت میں ہے :۔

بمعنی ثُلث فرسخ یعنی یک فرسنگ بعربی آنرا "میل" بکسر گویند "امیال" بالفتح و "میول" بالضم جمع آں۔ فارسی "کُروہ" گویند ونیز سنگے راگویند کہ برائے علامت تمام شدن "کُروہ" بر سر راہہا نصب کنند" "س، م"

بہ اختیار اشیائے از قسم کاغذ و زیور و ظروف وغیرہ بخانہ ہیچک از ما باشندگان

قصبہ ما سائیلون نگذاشتہ تا ہیجدہ یوم قیام ورزیدہ بخاطر جمع تمام از نقود و

عروض اثاث البیوت خانہ روبی کردہ کوچیدہ رفتند بُردن رخت او بار آں

مقاہیر نابکار بشہیر سوختہ خود ہا داخل شدہ بعد الفراغ تجہیز و تکفین مقتولان

وانقضائے مکانات آتش زدہ بتوقع یافتگی کاغذ وغیرہ اسناد عزیز تر از ہمہ

اثاث البیوت ہر چند تجسس و تلاش نمودیم اصلاً ازاں اثرے و نشانے

نیافتہ محروم و مضطرب ماندند . . . .

. . . . ہر کس بر صحت ایں حال و صدق ایں مقال آگہی و اطلاع داشتہ

باشد حسبۃً للہ مہر و گواہی خود ہا برایں وثیقہ ثبت نمائند۔"

لوٹ مار اور آتش زدگی ہی سکھوں کے وحشیانہ مظالم کی آخری حد نہ تھی۔ سکھوں کے سرگروہ گرو گوبند سنگھ کے متعلق معاصر مورخ غلام حسین طباطبائی کا بیان ہے کہ:۔

"بر دیہات و آبادی اہل اسلام ہر جا دست او می رسید تاختہ از سکنۂ آنجا ہر کرا می یافت

القانہ می کرد ہر چند اطفال صغیر السن باشند۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"حتی کہ زن ہائے حاملہ را شکم دریدہ و جنین را بیروں کشیدہ می کشتند۔" (سیر المتاخرین ص ۴۰۲)

وحشت و بربریت کی کتنی لرزہ خیز اور ہولناک داستان ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ دیوبند میں یہ واقعات پیش نہ آئے ہوں گے۔ خیال ہوتا ہے کہ تحریر درخواست کے وقت حیا اور عزت و ناموس کے خیال نے مہر سکوت لگا دی ہوگی اور بادلِ ناخواستہ صرف بیان کردہ واقعات ہی پر اکتفا کر لیا گیا! دیوبند کی تاریخ کا یہ وہ قیامت خیز سانحہ ہے جس نے ڈیڑھ سو سال کی شمعِ علم کو ایسا بجھایا کہ آج اس کے آثار و نقوش بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتے!

ادبیات

سازِ بیخودی

از جناب سیفی ندوی صاحب

اُٹھے تلاش میں اس کی تو یہ ہوا معلوم ۔۔۔ کہ ذرہ ذرۂ ہستی کو تھا پتا معلوم

بُھلا رہا ہوں جنوں میں اُسے جو تھا معلوم ۔۔۔ کہ ہر ستم ترا ہونے لگے نیا معلوم

اب انقلابِ بہار اس کو کیا چھپائے گا ۔۔۔ ہر ایک پھول کو جو راز ہو چکا معلوم

کہاں سے لاؤں غمِ انتظار کی طاقت ۔۔۔ حبابِ عمر کروں بھی تو انتہا معلوم

فریب میں رہے دانائیوں کے ہم، اب تک ۔۔۔ ہوا بھی علم تو کیا جانے کیا ہوا معلوم

جب اپنے ہوش پہ چھائی ہوئی ہو مستیِ عشق ۔۔۔ پھر ایسے حال میں تکمیلِ التجا معلوم

کہاں میں! اور کہاں رازِ عشق و مستوری؟ ۔۔۔ یہ سب خلوصِ وفا ہے جو کچھ ہوا معلوم

نہ پوچھو گردشِ ایام سے مری پرواز ۔۔۔ میں کس مقام پہ ہوں، یہ کسی کو کیا معلوم؟

ابھی سے ہیں یہ ستم آفرینیاں دل کی ۔۔۔ یہ ابتدا ہے تو آشوبِ انتہا معلوم

مرے سوال کی پیچیدگی، معاذ اللہ ۔۔۔ ہر ایک ذرہ یہ کہتا ہے مجھکو کیا معلوم؟

نیاز اصل میں یہ ہے کہ پھر نیاز نہ ہو ۔۔۔ جو بندہ ہو وہی ہونے لگے خدا معلوم

نگاہِ عشق کی کوتاہیاں خدا رکھے ۔۔۔ فروغِ حسن کا ہر راز ہو گیا معلوم

جہانِ دل عجب آشوبگاہ ہے سیفیؔ
یہاں سزا کی خبر ہے نہ کچھ خطا معلوم

تبصرے

فلسفۂ اقبال کا مطالعہ (A study in Iqbal's philosophy.)

از جناب بشیر احمد صاحب ڈار ایم۔ اے ضخامت ۲۲۴ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن قیمت مذکور نہیں۔
شائع کردہ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔

کوئی مہینہ ایسا ہوتا ہوگا جب اقبال پر کوئی نئی کتاب خود یا اس کا اشتہار نظر سے نہ گذرتا ہو۔
لیکن اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے فکر کے مختلف گوشوں پر جس ہمہ گیری اور وسعتِ نظر کے
ساتھ لکھنا چاہئے اور جس طرح لکھنا چاہئے اب تک نہیں لکھا گیا۔ فنونِ لطیفہ کے متعلق اقبال کا نظریہ،
اقبال کا فلسفہ خودی وغیرہ یہ عام پیش پا افتادہ چیزیں ہیں جن پر ہر ایک مصنف طبع آزمائی کرتا ہے۔
ہمارے نزدیک اقبال کے اسلامی فکر کا صحیح آئینہ ان کے وہ چھ انگریزی لکچر ہیں جس میں انھوں نے
وحی۔ الہام۔ مذہبی وجدان۔ مقام نبوت۔ تجدید احکامِ اسلام۔ اجتہاد۔ اور ختمِ نبوت وغیرہ کی
نسبت اپنے خیالات آزادی اور صفائی سے بیان کئے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اقبال پر
بحیثیت مفکرِ اسلام بحث کرتے ہوئے ان لکچروں کا جائزہ لیا جائے اور ان کی روشنی میں بتایا جائے
"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کے مصنف کا مقام فکر کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب بھی اس عام روش سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ لائق مصنف نے شروع میں
اپنی عقیدت کا اظہار ان لفظوں میں کر دیا ہے کہ ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت
شاہ ولی اللہؒ کے بعد صرف ایک ڈاکٹر اقبال ہیں جنھوں نے صحیح اسلام کو پیش کیا اور لوگوں کو اسی کے
سانچہ میں اپنی زندگیاں ڈھال لینے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال پر
اعتراض بالکل غلط ہے کہ ان کا نظامِ فکر برگساں اور نیٹشے سے مستعار لیا ہوا ہے۔ بلکہ اس کا
سرچشمہ دراصل قرآن و حدیث، مولانا رومی اور دوسرے صوفیائے اسلام کی کتابیں ہیں۔ ہمارے

نزدیک یہی باب (Iqbal's predecessors) اگرچہ افراط و تفریط سے یہ بھی خالی نہ
اس کتاب کا اصل حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ابواب بھی اقبالیات کے طالب علم
لائقِ مطالعہ اور دلچسپ ہیں۔

محمد علی حزیں | (انگریزی) ضخامت ۲۳۲ صفحات تقطیع متوسط ٹائپ جلی اور روشن۔ کاغذ
قیمت آٹھ روپیہ۔ شائع کردہ:- شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار لاہور۔

محمد علی حزیں جو عام طور پر علی حزیں کے نام سے معروف ہیں، مختلف علوم و فنو
فاضل اور فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ عمر کے تقریباً ۴۳ سال ایران میں بسر کرنے کے بعد ہند
آئے اور ۳۴ سال تک یہاں کی آب و ہوا میں زندگی کا سانس لینے کے بعد بنارس میں
کیا اور وہیں (۱۱۸۰ھ) دفن ہوئے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عام تذکروں میں ان کے حا
مفصل نہیں ملتے اور پھر جو بعض طلسم ہوشربا قسم کی کہانیاں ان سے منسوب ہیں۔ انھو
اصل واقعات پر اور زیادہ ابہام و اشتباہ کا پردہ ڈال دیا ہے۔ اس بنا پر سرفراز خاں صا
ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) کی یہ کوشش ہر حیثیت لائقِ تحسین و آفرین ہے کہ آپ نے بڑ
اور تحقیق و تدقیق سے شیخ حزیں سے متعلق تمام ممکن الحصول مواد کو کنگھال ڈالا اور اس کی
ایک ایسی کتاب مرتب کر دی جو فارسی شعر و ادب کے طلبا کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ بڑ
کی بات یہ ہے کہ لائق مرتب نے نصرف خارجی مواد کتاب پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے
رائے کو ثابت کرنے کے لئے خود کلام حزیں سے اندرونی شہادتیں بھی بہم پہنچائی ہیں۔
کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کر کے مصنف کی محنت و کاوش کی داد دیں گے۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں۔ تفصیل
[...] دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے
[...]ے محسنین و معاونین اور احبا کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

[...] اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی
[...] کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی
[...] ہیں۔ قیمت سے مجلد للعہ

[...] اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور
[...] نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد [illegible]

[...]یم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق
[...]ر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے
[...] اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت سے مجلد للعہ

[...]تان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ [illegible]

[...] نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس
[...]رت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک
[...] ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ
[...]ن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے
[...] گئے ہیں۔ اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب
[...] ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل
[...] قیمت [illegible] مجلد [illegible]

غلامانِ اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام
کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا
تفصیلی بیان۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط
محققانہ کتاب۔ جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن حصہ اول جدید ایڈیشن
ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب
زیر طبع۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ قیمت
دو روپے مجلد [illegible]

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک
لائبریری میں رہنے کے لائق ہے۔ قیمت [illegible]

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند
اور مکمل خلاصہ۔ قیمت [illegible]

۱۹۴۲ء: قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد ؁ر

اسلام کا اقتصادی نظام:- وقت کی اہم ترین کتاب، جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن زیرِ طبع قیمت للعہ مجلد ؁ر

خلافتِ راشدہ: تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ۔ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ؏ مجلد ؏ ۱۲ر

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن۔ زیرِ طبع۔ قیمت عار مجلد ؏ ر

۱۹۴۳ء: مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب۔ قیمت ؏ مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ۔ قیمت عہ ر

اسلام کا نظامِ حکومت:- صدیوں کے قانونی مطالبے کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپے مجلد سات روپے

خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخِ ملت تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ؏ مجلد ؏ ۱۲ر

۱۹۴۴ء: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب۔ اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ ر

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی۔ قیمت للعہ مجلد صہ ر

قصص القرآن حصہ سوم: کتاب کے اس حصہ میں انبیا علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی اور تاریخی واقعات کی مکمل تشریح و تفسیر کی گئی ہے قیمت للعہ مجلد ؁ر

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی قیمت ؏ مجلد للعہ

۱۹۴۵ء کی کتابوں میں "قرآن اور تصوف" مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی طبع ہو چکی ہے۔ عنقریب حضرات محسنین و معاونین کی خدمت میں روانہ کی جائیگی۔

قصص القرآن جلد چہارم پریس کو جا رہی ہے باقی دو کتابوں کا اعلان بعد کو کیا جائے گا۔

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب

ں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ

یا گیا ہے قیمت ۲ مجلد للعہ

راشدہ:۔ تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جس میں

لفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات

ت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں

یے مجلد ...

وں کا عروج اور زوال۔ عہ

مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن

مثل کتاب ہے مجلد للعہ

۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ

ترجمہ قیمت ...

م کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ

کی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے

بیوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت

روپئے مجلد سات روپئے۔

ت بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے

ہ کے مستند حالات وواقعات ... مجلد ...

سنہ ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ

بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی

قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات

کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔

قیمت ۲ مجلد للعہ

سنہ۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت

کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین

اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت

مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور

اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح

کیا گیا ہے قیمت عار مجلد سے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء

کے حالاتِ مبارکہ کا بیان قیمت صہ مجلد ...

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب

صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد سے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسنِ خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل

دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے

معاونین اور احبا کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ۳ مجلد للعہ

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد ہے

غلامان اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصول اخلاق اور انواع اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے قیمت صہ مجلد ہے

۱۹۴۱ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت صہ مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ہے

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد پنجم — شمارہ (۳)

رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریباً چھ سال کی عام ہلاکت انگیزی اور تباہی و بربادی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی جنگ آخر کار ختم ہو گئی۔ اس کا آغاز یورپ میں پولینڈ کی سرحد سے ہوا اور اس کی رسمِ اختتام کی آخری تکمیل مشرقِ اقصیٰ میں جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو میں ہوئی۔ اس طویل مدتِ جنگ میں کتنے فرزندانِ آدم کی نعشیں خاک و خون میں تڑپیں۔ کتنی آبادیاں ویرانے اور کتنی شاندار عمارتیں کھنڈر بن کر رہ گئیں۔ خدا کی سرزمین کو انسانی خون سے لالہ زار بنانے کی آرزو اور تمنا میں خود زمین کی پیدا کی ہوئی دولت و ثروت کے کتنے بڑے بڑے انبار اور ذخیرے آگ اور بارود کی نذر ہو گئے۔ کتنی عورتیں بیوہ۔ اور کتنے بچے اور بچیاں یتیم اور لاوارث ہو گئے۔ ان سب کا اگر حساب لگایا جائے تو بے شبہ یہ تمام جانی اور مالی نقصانات ان نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں جو عہدِ گذشتہ کی کسی بڑی سے بڑی مذہبی لڑائی میں ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود آج کل کے ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک مذہب ہی دنیا کا وہ سب سے بڑا عامل ہے جس کے باعث ایک قوم دوسری قوم سے نفرت کرتی اور لڑتی ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کا گلا کاٹتا ہے۔

موجودہ تہذیب کا خمیر جن عناصر سے تیار ہوا ہے ان کی فطرت ہی جذباتِ نفرت و عداوت کو ہوا دیکر جنگ برپا کرنا ہے۔ جس تہذیب کی بنیاد مادیت پر قائم ہو، اس میں یہ ظاہر ہے کہ روحانیت، خدا پرستی، اور اعلیٰ انسانی اخلاق کی گنجائش کہاں تک ہو سکتی ہے، مذہب ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت کرنے کا سبق دیتا ہے۔ ہمدردی بنی نوع کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے خود غرضی اور نفس پرستی سے دور رکھتا ہے۔ لیکن ایک مادی تہذیب کا اثر یہ ہے کہ نسلی اور وطنی تفوق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اقتصادی غارتگری کی بہیمانہ خواہش مشتعل ہو کر دیوانہ بنا دیتی ہے

اور بقول اقبال مرحوم کے " انسان خدا کی بستی کو دکان سمجھنے لگتا ہے۔ اب اس کی سائنس اس کے ہاتھ میں اٹم بم ایسی قیامت انگیز چیز دیتی ہے اور وہ اس کی مدد سے اپنے جذبۂ انتقام کو تسکین دینے کی کوشش کرتا ہے۔ منکرینِ مذہب بتائیں کہ کیا اس قسم کی ہلاکت انگیزیاں پہلے کبھی مذہب کے نام پر بھی روا رکھی گئی ہیں؟

سرکاری طور پر جنگ کے خاتمہ اور امن کی بحالی کا اعلان ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک ان اسبابِ جنگ کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا اور انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد بجائے مادیت کے روحانیت پر نہیں رکھی جائیگی۔ دنیا میں کوئی پائیدار اور مستقل امن قائم نہیں ہوسکتا۔

جاپان کی یکایک شکست کے اعلان نے بہت سے باخبر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کے پاس اب بھی فوجیں کافی تعداد میں محفوظ تھیں۔ سامانِ جنگ کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر جغرافیائی اعتبار سے مقبوضاتِ جاپان کو ایک ایسی پوزیشن حاصل تھی کہ خاص جاپان میں فوجیں اتارنا اتحادیوں کے لئے بیحد مشکل تھا۔ اور ان سب سے بڑھکر بات یہ ہے کہ جاپانی اب بھی تازہ دم تھے۔ مذہبی جوش اور ولولہ کی وجہ سے یہ لوگ موت کو موت نہیں بلکہ زندگی سمجھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے جتنی بے جگری سے یہ لڑتے ہیں شاید کوئی دوسری قوم اس حیثیت میں ان کی حریف نہیں ہوسکتی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جاپان نے اپنی شکست خود تسلیم کرلی اور اس سلسلہ میں شہنشاہ نے جو اہلِ جاپان کے ناقابلِ زوال عقیدہ میں ان کا خدا اور معبود تھا وہ سب کچھ کیا جو ایک مفتوح ومحکوم کو فاتح کے حکم کی تعمیل میں کرنا پڑتا ہے۔

سر راس مسعود مرحوم نے جاپان کے سفر سے واپس آنے کے بعد کہا تھا کہ ایک مرتبہ وہ جاپان کے وزیرِ اعظم سے گفتگو کر رہے تھے۔ اسی اثنار میں خدا کا ذکر آگیا تو جاپانی وزیرِ اعظم نے

نہایت مغرورانہ انداز میں کہا کہ کیسا خدا؟ ہم کبھی اس خدا کو اپنے ملک میں نہ آنے دیں گے" لیکن
آج یہ کیا ہے کہ خود خدا نہیں۔ اس کے حقیر ترین بندے جاپانی خداوند کی شہنشاہی پر قبضہ کئے بیٹھے
ہیں اور یہ معبودِ باطل اور اس کے تمام پجاری بالکل دم بخود ہیں یہاں تک کہ آزادی سے سانس
بھی نہیں لے سکتے۔

جاپانیوں کو اس جنگ میں جس عظیم الشان خسارہ سے دوچار ہونا پڑا ہے اس میں
بے شبہ بہت سے لوگوں کو اُن کے ساتھ ہمدردی ہوگی لیکن ان لوگوں نے ان تمام نقصانات
کے بعد اگر صرف ایک چیز کا یقین حاصل کر لیا تو ہمارے نزدیک انھوں نے سب کچھ کھونے پر
بھی بہت کچھ پالیا ہے اور وہ یقین اس بات کا ہے کہ خدا کبھی کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔ خدا
اگر کسی ذات کو کہا جا سکتا ہے تو بے شبہ وہ وہی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا
جس کی حکومت کو کبھی زوال نہیں آسکتا۔ جو کبھی کسی کے سامنے مغلوب اور محکوم نہیں ہو سکتا۔ وہ
جو چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ کوئی اس کے ارادہ کو روک لینے والا نہیں۔ ہم سب کو اسی ایک اَن دیکھے
اور اَن بوجھے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اور بس! اس کے علاوہ انسان انسان سب برابر ہیں۔ کوئی
انسان کسی انسان کا معبود یا خدا نہیں ہو سکتا۔

اب کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ برہان پھر پہلے کی طرح اسّی صفحات
اور عمدہ سفید کاغذ پر مع ٹائٹل پیج کے شائع ہو سکے۔ لیکن ابھی ایسا کرنے میں قانونی دشواری ہے
ہم ساعی ہیں کہ کسی طرح اس دشواری پر جلد قابو پا سکیں اور برہان کو پھر اسی پرانی وضع میں
دیکھ سکیں۔

تدوینِ فقہ

(۹)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

شاطبی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کسی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے متعلق یہ طے کرتے ہوئے کہ
...عیت اور اس کے قوانین پر وہ کس حد تک منطبق ہے، ہمیں اسلام کے شرعی قوانین کی اس خصوصیت
...صہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ وہ قوانین کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے ایک بارگی ماننے والوں پر
...ذ کر دیا گیا ہو، بلکہ سب جانتے ہیں کہ تقریباً بیس سال کی طویل مدت میں بتدریج اس کی تکمیل ہوئی
...ے تکمیل کی اسی تدریجی رفتار کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے شرعی قوانین کے اس ذخیرہ کو
...حصوں پر تقسیم کرکے ایک کا "المشروعات المکیہ" اور دوسرے کا "المشروعات المدنیہ" نام رکھا ہے
...ں کے بعد انھوں نے ادہر توجہ دلائی ہے کہ تتبع و تلاش استقراء و جستجو سے اگر کام لیا جائے تو مشروعات
...ان دونوں حصوں میں ایک خاص امتیاز نظر آئے گا، اسی امتیاز کو بتاتے ہوئے زیادہ تر قرآنی احکام
...و پیشِ نظر رکھ کر وہ لکھتے ہیں۔

ان المشروعات المکیۃ وھی الاولیۃ کانت فی غالب الاحوال مطلقۃ غیر مقیدۃ۔ | مکی قوانین جو ظاہر ہیں کہ نزولاً مقدم ہیں۔ عام حالات میں وہ بجائے مقید ہونے کے زیادہ تر اطلاقی رنگ رکھتے ہیں۔

پھر "زکوۃ" کے قانون کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ابتدا
...ں عام طور پر خیر و خیرات، صدقات و مبرات، پر زور دیا جاتا تھا، لیکن یہ کہ صدقہ کن پر واجب ہے

کتنا واجب ہے، اس صدقہ کے کون کون لوگ مستحق ہیں "مکی مشروعات" میں ان امور کی تفصیل نہ
کی گئی ہے بلکہ ان کے الفاظ ہیں۔

کان الکثر ذلک موکولا الی نظار المکلفین	یہ بات ان لوگوں کی نظر و فکر کے سپرد تھی جن پر قانون
فی تلک العادات مصروفا الی اجتہادہم	زکوۃ عائد کیا گیا تھا، اور ان کے اجتہاد کے ساتھ
لیاخذ کل ما لائق بہ وقد رعلیہ من	بات وابستہ تھی یعنی ان کی نیکیوں اور اخلاقی
تلک المحاسن الکلیات فی ما استطاع	خوبیوں میں سے جس حد تک جو جہاں تک تعمیل
من تلک المکارم۔ (ج ۳ ص ۱۱۱)	کر سکتا ہے تعمیل کرے مطالبہ کی شکل اسوقت یہی تھی۔

وہ کہتے ہیں کہ صحابہ میں جن بزرگوں کو سابقین اولین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ قرآن
ان اطلاقی مطالبات سے ان ہی کو سابقہ پڑا، اس لئے

وکان المسلمون فی تلک الاحیان	اسی لئے مسلمان اس زمانہ میں کوشش کی انتہائی
أخذین ہا قصی جہودہم وعاملین	شکل کو اختیار کرتے تھے اور جو کچھ بھی ان کے پاس تھا
علی مقتضاہا بغایۃ موجودہم۔	اس کو ادا کر کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

اور یہ ہے ان کے نزدیک وہ خصوصی امتیاز جو عموماً "مشروعاتِ مکیہ" میں نمایاں ہے
اس کے مقابلہ میں "مشروعات مدنیہ" کا حال ان سے مختلف ہے، مطلب یہ ہے کہ یوں تو اجمال
اطلاق کا رنگ قرآن کے ہر مطالبہ پر غالب ہے خواہ مکہ میں اس کا نزول ہوا ہو، یا مدینہ میں، لیکن
اسی کے ساتھ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "مدنی مشروعات" میں باوجود کلیاتی شکل رکھنے کے اطلا
کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی ہے جو مکی مشروعات کی خصوصیت ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں
قرآن کا جو حصہ نازل ہوا، اس میں بھی اور "السنۃ" کے ذریعہ سے پیغمبر نے قرآنی مطالبات کی جو تشر
و تشکیل کی دونوں میں بقول ان کے۔

ففصلت تلک المجملات المکیہ	مکی مشروعات کے اجمال کی تفصیل کی گئی اور جن امور کا مطالبہ
وقیدت تلک المطلقات	مکہ میں اطلاقی رنگ میں کیا گیا تھا، ان میں قیود کا اضافہ ہوا۔

خیر یہاں تک تو ایک ایسی بات ہے، جس میں ظاہر ہے، چنداں کوئی ندرت نہیں، عموماً
ضیں تھوڑا بہت بھی اسلامی علوم سے لگاؤ ہے وہ ان سے ناواقف نہیں ہیں، پیش کرنے کی جو
ت ہے وہ اس کے بعد کا وہ نتیجہ ہے جس سے میرے خیال میں ایک بڑے اخلاقی مغالطہ کا جیسا کہ
ں نے عرض کیا ازالہ ہوتا ہے۔

الشاطبی نے اس کے بعد اس پر تنبیہ کی ہے کہ "مدنی مشروعات" میں قیود کے جو اضافے
ئے اور "مکی مشروعات" کے اطلاق کی جو حد بندیاں مدنی مشروعات میں کی گئیں، خواہ تقیید و
دید کا یہ کام قرآن ہی کے ذریعہ انجام دیا گیا ہو، یا "سنت" کی راہ سے یہ بات زیر عمل آئی ہو، کچھ
ں ہوا ہو، لیکن کسی حال میں اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ "مدنی مشروعات" کے بعد ان پر بالکلیہ
نسخ پھیر دیا گیا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ان کو غیر قانونی قرار دے کر شریعتِ اسلامی
ے حدود ہی سے انھیں کلیتہً خارج کر دیا گیا۔

علامہ شاطبیؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ خیال قطعاً غلط اور خلافِ واقعہ ہے، بلکہ ان کے
زدیک گو "مدنی مشروعات" میں "مکی مشروعات" کے کلیات کی تحدید و تقیید ضرور کی گئی، مگر

مع بقاء الکلیات — بایں طور کہ مکی مشروعات کے کلیات کو بھی اپنے
علی حالہا۔ — حال پر باقی رکھا گیا۔

اب اسی نتیجہ سے وہ اس پر تنبیہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں جس طبقہ کو "الصوفیہ" کے نام سے
وسوم کیا جاتا ہے، ان کی دینی زندگی بعض لوگوں کو عام مسلمانوں کی دینی زندگی سے کچھ الگ الگ
ی جو نظر آتی ہے اور یہی امتیاز ان بزرگوں کے لئے بعض حلقوں میں ناانصافیوں کی وجہ بنا ہوا ہے
شاطبی کہتے ہیں کہ ان کی یہ ناانصافیاں درحقیقت ناانصافیاں ہی ہیں، شریعت کے ایک خاص نقطۂ نظر
ے غفلت کا نتیجہ ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ کی شرعی زندگی کو "مدنی مشروعات" کی روشنی میں نہیں
ے دیکھنا چاہتے ہو تو "مکی مشروعات" کو سامنے رکھکر ان کو دیکھو، اسی مقصد کی طرف اشارہ کرتے
وئے وہ لکھتے ہیں۔

وعلى الاول جرى الصوفيه وعلى الثاني جرى من عداهم ممن لم يلتزم ما التزموه

پہلے طریقہ کار یعنی ملکی شروعات کے مقتضی پر تو صوفیہ کا عمل درآمد رہا اور دوسرے (یعنی مدنی مشروعات) کو ان لوگوں نے اختیار کیا جنھوں نے اپنے لئے ان امور کی پابندی ضروری نہیں ٹھہرائی جن کے صوفیہ پابند ہیں۔

اسی دعوی کو اور واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

ومن ههنا يفهم شان المنقطعين الى الله فيما امتازوا به من نحلتهم المعروفه فان الذي يظهر بادى الرأى منهم انهم التزموا امورا لا توجد عند العامه ولا هي مما يلزمهم شرعا فيظن الظان انهم شددوا على انفسهم و تكلفوا ما لم يكلفوا ودخلوا على غير مدخل اهل الشريعة

اور اسی سے ان لوگوں کا حال سمجھا جا سکتا ہے جو ہر چیز سے منقطع ہو کر حق تعالی کے ساتھ مشغول ہیں۔ یعنی اپنے خاص مشہور مسلک کی بنیاد پر ان کو جو (عام مسلمانوں کے درمیان) امتیاز حاصل ہے، بظاہر یہ خیال گزرتا ہے کہ ان بزرگوں نے ایسی باتوں کا اپنے آپ کو پابند بنا لیا ہے جو عام مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں اور نہ شریعت نے مسلمانوں پر ان کو واجب کیا ہے اس حال کو دیکھ کر گمان کرنے والوں کو گمان ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے ساتھ تشدد سے کام لیا ہے اور ایسے امور کے خواہ مخواہ پابند بن گئے ہیں جن کی پابندی کا ان سے شرعاً مطالبہ نہیں کیا گیا ہے اسی وجہ سے سمجھا جاتا ہے کہ ارباب شریعت کی جو راہ ہے اس راہ پر وہ نہیں ہیں۔

پھر اسی بدگمانی کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حاش لله ما كانوا ليفعلوا ذلك وقد بنوا نحلتهم على اتباع السنة وهم باتفاق اهل السنة صفوة

خدا کی پناہ، وہ ہرگز ایسے نہیں ہیں جو ایسی باتوں کا ارتکاب کریں۔ انھوں نے اپنے مسلک کی بنیاد سنت کی پیروی پر رکھی ہے ان کا شمار خدا کی چیدہ و برگزیدہ مخلوق

الله من الخلیفۃ (ج ۲ ص ۴۳۹) میں ہے اسی پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔

اور اپنا آخری فیصلہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں۔

ولکن اذا فہمت حال المسلمین	مگر تم جب آغازِ اسلام کے اس زمانہ پر غور کروگے جو
فی التکلیف اول الاسلام	اسلامی قوانین کے عائد کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ اختیار
ونصوص التنزیل المکی	کیا گیا تھا اور مکی تنزیل کے ان نصوص و تصریحات کو سوچوگے
الذی لم ینسخ وتنزل	جو منسوخ نہیں ہوئے ہیں اور ان بزرگوں کے اعمال کو
اعمالہم علیہ بین لك	ان ہی نصوص پر پیش کرکے جانچوگے تو تم پر یہ بات واضح
ان تلك الطرق مسلك	ہوجائے گی کہ درحقیقت ان حضرات کا مسلک وہی
ہولاء وباتباعہا عنوا	"مکی تنزیل" والے نصوص کے مطابق ہے اور ان نصوص
علی وجہ لا یضاد المدنی	کی پابندی ان بزرگوں نے اس طور پر کی ہے جو مدینہ
المفسر۔	کے مفصل مشروعات کی مخالف نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کے مسلک کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں یعنی ان کی زندگی جو دراصل مکی مشروعات کی ایک تعمیلی شکل ہے "مدنی مشروعات" سے کیوں متصادم نہیں ہوتی اسی کو وہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

اذا سمعت مثلا ان بعضہم	تم مثلاً جب سنتے ہو کہ ان بزرگوں میں بعضوں سے
سئل عما یجب من الزکوٰۃ	پوچھا گیا کہ دو سو درم پر کتنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے
فی مائتے درہم فقال	تو جواب میں انھوں نے فرمایا ہمارے مسلک کے روسے
اما علی مذہبنا فالکل للہ واما	پوچھتے ہو تو سب کچھ اللہ کی راہ میں خیرات کر دینا چاہئے
علی مذہبکم فخمستہ دراہم	باقی تمہارے مسلک پر سو دو سو درم میں پانچ درم زکوٰۃ
وما اشبہ ذلك علمت ان	ادا کرنی چاہئے، یہ اور اسی قسم کے مسائل پر جب غور کروگے
ہذا یستمد مما تقدم فان التنزیل	تو معلوم ہوگا کہ اس میں اسی بات سے فائدہ اٹھایا
المکی امر فیہ بمطلق انفاق	گیا ہے جو گزر چکی یعنی مکی آیتوں میں تو مطلق مال کے

عربی	ترجمہ
لمال فی طاعة الله ولم يبين	خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن کتنا دینا واجب ہے
الواجب من غيره بل وكل	اس کو نہیں بیان کیا گیا بلکہ خرچ کرنے والے کے اجتہاد
الى اجتهاد المنفق ۔	کے سپرد اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔

پھر اسی کی کچھ اور تشریح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

عربی	ترجمہ
ومثله لايقال فی ملتزمه	ظاہر ہے کہ اس قسم کی بات (یعنی سب کچھ اللہ کے لئے قرا
انه خارج عن الطريقة	دینا) جو اس کا پابند ہو اس کے متعلق یہ کہنا درست
ولا متكلف فی التعبد ۔	نہ ہوگا کہ وہ اسلام کے طریقہ سے باہر ہوگیا یا دینداری
	میں اس نے حد سے تجاوز کیا ہے ۔

بہر حال ان کے نزدیک صوفیا کا طرزِ عمل اور طریقِ زندگی عام مسلمانوں کی دینی زندگی سے اگر کچھ مختلف ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی زندگی شریعت سے بھی مختلف ہے بلکہ انھوں نے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے۔

عربی	ترجمہ
لما كان هذا الميدان لايسرح فيه	یہ میدان (یعنی اطلاقی رنگ کے مطالبات کی پوری تکمیل
كل الناس قيد التنزيل المدنی	ایسا نہ تھا جس میں ہر شخص چر سکتا تھا اس لئے مدنی
حين فرضت الزكوة فصارت	آیتوں میں مفروضہ زکوۃ کو مقید کر کے بیان کر دیا گیا اور اسی
هی الواجبة انحتاما مقدرة لا	کو قطعی شکل میں مسلمانوں پر واجب کر دیا گیا اس طور پر کہ
يتعدى الى ما دونها وبقی ما	اس سے کم کی گنجائش نہیں (لیکن زیادہ) سوا اپنے اپنے
سواها على حكم الخيرة فاتسع	اختیار کے حوالہ رہا پس عمل کرنے والوں کے لئے جواز کا
على المكلف مجال الابقاء جوازا	میدان اب بھی کھلا رہا، پھر ان میں کچھ ایسے ہیں جنھوں نے
والانفاق ندبا فمن مقل ومن	کمی کی راہ اختیار کی اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے زیادتی کی
مكثر والجميع محمودون لانهم لا	راہ اختیار کی، اور سب کے سب قابلِ تعریف مستحق مدح
يتعدون حدود الله (ص ۴۲)	وستائش ہیں کیونکہ اللہ کے مقررہ حدود کی کوئی متجاوز نہیں ہے۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وھکذا یجب ان ینظر فی کل	یوں ہی تمام "مکی مطالبات" کو سوچنا چاہیے تاکہ جو واقعہ
خصلۃ من الخصال المکیۃ	ہے وہ لوگوں کو معلوم ہو جائے یعنی وہی بات
حتی یعلم ان الامر کما ذکر	جس کا ذکر کیا گیا۔

لیکن افسوس ہے کہ یہی "نظر" ہے جس سے بعض محروم ہوئے اور اسلام کے اس طبقہ پر
کی زبانیں کھلیں، جنھوں نے رخصتوں کو چھوڑ کر عزمیت پر ادنیٰ پر کفایت نہ کر کے اعلیٰ درجہ
ل کیا اور سچ پوچھو تو انھوں نے اپنی راہ وہ بنائی تھی جس پر صحابہ کے سابقین اولین چلے تھے، بلکہ
بی کی اس تنبیہ پر لوگ غور کرتے تو شاید ان پر بھی وہی بات کھلتی، جو خدا نے اپنے اس بندے پر
لی وہ لکھتے ہیں۔

اذا نظرت الی اوصاف رسول اللہ	اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر تم غور
صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ تبین	کرتے اور آپ کے اعمال وافعال کو سوچتے تو مسلمانوں
لک الفرق ما بین القسمین و	کے دونوں گروہ یعنی عوام اور صوفیا میں جو فرق ہے
بون بین المنزلتین (ص ۲۳۸)	وہ تم پر ظاہر ہو جاتا، اور دونوں میں جو فرق ہے وہ کھل جاتا۔

شبہ نہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں جس قسم کی زندگی گزاری، جس مکان میں
اسوتی سانس پوری کی، جو کچھ کھاتے تھے، جو کچھ پیتے تھے، ان کے نمونوں کو مسلمانوں کے
طبقہ میں اگر تلاش کیا جا سکتا ہے تو شائد صوفیا ہی کے اس گروہ میں وہ مل سکتا ہے، جنھیں نہ جاننے
نے محض ان کے فقر وفاقہ، صبر وشکر، قناعت وتوکل کی زندگی کو دیکھ کر ان کو محلِ اعتراض
یا، مگر کچھ بھی ہو مسلمانوں کے فہم عمومی کو اس باب میں بحمد اللہ کبھی مغالطہ نہیں لگا۔ اور جیسا کہ
نے لکھا ہے۔

وبھذا عول من شھر من اھل	صوفیا میں جن بزرگوں نے شہرت حاصل کی ان کو جو
التصوف وبذلک سادوا من	سیادت اور امتیاز ان لوگوں کے مقابلہ میں حاصل ہے

لم يبلغ مبالغهم في الاتصاف بأوصاف الرسول واصحابه۔ | جو ان کے درجہ تک نہیں پہنچے ہیں انکی وجدی بات ہی کہ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحابؓ کے اوصاف سے یہ حضرات متصف تھے

بہر حال واقعہ یہی ہے کہ "مدنی شروعات" میں قیود وحدود کا اضافہ کرکے شرعی مطالبا[ت] کے اطلاق کو کم کرکے عام مسلمانوں کے لئے بہت کچھ آسانیاں پیدا کردی گئی تھیں لیکن اس کے [یہ] تو نہ تھے کہ "مکی مشروعات" منسوخ ہوکر اسلامی قانون کے حدود سے باہر ہوگئے تھے، ہوسکتا ہے [کہ] بعضوں نے اس پر نسخ کے لفظ کا اطلاق کیا ہو، اور قدماء میں اس لفظ کے بولنے کا ایک عام رو[اج] تھا، حتیٰ کہ اسی رواج کی بنیاد پر بعضوں نے تو ناسخ ومنسوخ آیتوں کی جو فہرست بنائی شاید یہ مبالغہ [ہے] کہ قرآن کے نصف حصہ کو انھوں نے منسوخ ٹھہرادیا۔

لیکن متقدمین جس معنیٰ میں اس لفظ کو استعمال کرتے تھے اس میں اور نسخ کی اصطلاح [سے] متاخرین جو کچھ مراد لیتے ہیں، دونوں میں فرق عظیم تھا۔ اب تو کسی حکم کے منسوخ ہونے کا یہ مطلب لیا جا[تا ہے] کہ وہ شرعی قانون ہی باقی نہ رہا۔ حالانکہ متقدمین کی مراد اس سے جو کچھ ہوتی تھی، حافظ ابن قیم اس [کے] متعلق لکھتے ہیں۔

رفع دلالة العام والمطلق والظاهر وغيره اما بتخصيص او تقييد او حمل مطلق على مقيد وتفسيره وتبيئة حتى انهم يسمون الاستثناء والشروط والصفة نسخا لتضمن ذلك رفع دلالة الظاهر وبيان المراد۔[1] | کسی عام یا مطلق، اور ظاہر لفظ کی دلالت وغیرہ کو کسی خصوصیت کے اضافہ سے، یا قید کے بڑھانے سے یا [مطلق] کو قید پر محمول کرنے سے یا اس کی تفسیر وتبیین سے جو اٹھا دیا جاتا تھا اس پر بھی نسخ کے لفظ کا اطلاق ہوتا تھا حتیٰ کہ (اگلوں) میں تو لوگ استثنا اور شروط اور صفت کے اضافہ کو بھی نسخ ہی کہدیتے تھے کیونکہ ظاہر کلام جس بات پر دلالت کرتا تھا وہ بات اس اضافہ کے بعد باقی نہیں رہتی تھی۔

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۳۔

خیال تو کیجئے کہ نسخ کے اس قدیم معنی اور جدید اصطلاح میں کوئی نسبت بھی ہے؟ پس، "دکی مشروعات" کی طرف نسخ کے لفظ کا انتساب اگر کسی نے کبھی کیا ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے اشارہ اسی معنی کی طرف ہو سکتا ہے جو پہلوں کی اصطلاح تھی، ورنہ نسخ کا مطلب جو کچھ اب سمجھا جاتا ہے کم از کم قرآنی آیات کی حد تک مشکل ہی سے کسی آیت کو اس بنیاد پر منسوخ قرار دیا جا سکتا ہے، خیر یہ ایک الگ بحث ہے[1] لیکن اس اصطلاحی مغالطہ کے ازالہ سے اسلام کے ایک بڑے "مذہبی اختلاف" کے چہرے سے چونکہ غبار صاف ہوتا تھا، اس لئے ضمناً اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا۔

"البینات" کے سوا شریعت کے غیر بیناتی اجزار کے اختلاف کے متعلق بزرگوں کے جس نقطۂ نظر کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا، یعنی تقریباً سب ہی حق و صواب ہے، ان مختلف پہلوؤں میں سے جسے جس پر عمل کی توفیق میسر آجائے وہی اس کے لئے کافی ہے دوسروں کو نہ اس پر اعتراض کرنے کا حق ہے اور نہ غلط ٹھرانے کا، یہی صحابہ کا طرز عمل تھا کہ ان مسائل میں باوجود اختلاف رکھنے کے آج تک کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ انھوں نے کسی دوسرے صحابی کے پیچھے نماز پڑھنے سے مثلاً اس لئے انکار کیا ہو کہ فلاں مسئلہ میں وہ ان سے مختلف خیال اور عمل رکھتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد کے جس واقعہ کا ذکر کر چکا ہوں وہی اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاوی میں ایک موقعہ پر لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے۔

قد کانت الصحابۃ والتابعین	صحابہ وتابعین اور جو لوگ ان کے بعد تھے
ومن بعدہم منہم من یقرء	ان میں کچھ حضرات بسم اللہ زور سے پڑھتے اور
البسملۃ ومنہم من لا یقرء	بعض نہیں پڑھتے
وکان منہم من یقنت فی الفجر	بعض لوگ فجر میں قنوت پڑھتے تھے اور بعض
منہم من لا یقنت ومنہم من یتوضاء	نہ پڑھتے تھے بعض لوگ پچھنا لگانے کے بعد وضو
بالحجامۃ والرعاف والقیئ ومنہم	کرتے یا نکسیر پھوٹنے قے ہونے سے بھی وضو کرتے

---

[1] اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے مناسب ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب فوز الکبیر فی اصول التفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

من لایتوضاء من ذلک منھم من	اور بعض نہیں کرتے بعض عضو مستور کے چھونے سے
یتوضاء من مس الذکر ومس النساء	وضو کرتے بعض نہ کرتے یا عورت کو نفسانی میلان
بالشھوۃ منھم من لا یتوضاء	سے چھونے سے وضو کرتے بعض نہ کرتے اسی طرح
بالقھقھۃ فی الصلاۃ ومنھم من لا	نماز میں قہقہہ کے ساتھ ہنسنے کی وجہ سے وضو
یتوضاء من ذلک مع ھذا فکان	کرتے بعض نہ کرتے مگر باوجود ان تمام باتوں کے
بعضھم یصلی خلف بعض [۱]	بعض بعض کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔

بلکہ شیخ الاسلام نے اسی موقعہ پر اس کی بھی تصریح کی ہے۔

کان ابوحنیفہ واصحابہ والشافعی	ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب، امام شافعیؒ وغیرہم
وغیرھم یصلون خلف ائمۃ المدینۃ	حضرات مدینہ کے مالکی اماموں کے پیچھے نمازیں
من مالکیۃ وان لا یقرون البسملۃ	پڑھا کرتے تھے حالانکہ مالکی نہ آہستہ سے بسم اللہ
لاسرا ولا جھرا۔ [۲]	پڑھتے تھے نہ زور سے۔

آخر میں لکھتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

ما زال المسلمون علی عھد النبی صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور آپ کے
علیہ وسلم وعھد خلفائہ یصلی	خلفاء کے زمانے سے مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہی عمل
بعضھم خلف بعض۔	درآمد رہا ہے یعنی بعض بعض کے پیچھے نماز پڑھتے رہے

چند سطر پہلے اپنی خاص زبان میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے۔

من انکر ذلک فھو مبتدع۔	جو اس کا انکار کرتا ہو وہ بدعتی اور گمراہ ہے۔

لیکن اس کا کیا یہ مطلب ہے کہ ہر مسلمان ان مسائل کے متعلق جو چاہے کرے اور جس وقت اس کے جی میں جس طریقۂ عمل کے اختیار کرنے کو جی چاہے اس پر عمل پیرا ہو، جس کا مآل شاید یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک مسجد میں بیسیوں طرح کی نماز پڑھنے والے، وضو کرنے والے پیدا ہو جائیں اور

---

[۱] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۳۸۱ ۔ [۲] ر

یک نماز وضو کے مسائل کیا اس سلسلہ میں انسانی زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس میں کچھ نہ کچھ اختلاف
نہیں پایا جاتا۔ پھر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کیا ہوگی، ایسے غیر متناسب متخالف عناصر کا مجموعہ
ہوگی، جن میں کوئی ربط کوئی انضباط نہیں اور اجتماعی کیا انفرادی زندگی میں جب یہ شکل پیدا ہو کہ ایک
شخص آج کچھ کر رہا ہے۔ کل کچھ آج کچھ بول رہا ہے، کل کچھ سنا رہا ہے، اور یہ سارے حرکات
ین کے تحت انجام دے رہا ہو، خود ہی سوچنا چاہئے کہ ایسی صورت میں دین میں اور بچوں کے
کھیلوں میں کیا فرق رہے گا۔ شاطبی نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے، اس طرز عمل پر جو خرابیاں
رتب ہوں گی ان میں ایک یہ بھی ہے۔

کالاستھانۃ بالدین اذ	دین کی یہ بات اہانت وتحقیر بن جائیگی کیونکہ اگر یہ صورت
یصیر بھذا الاعتبار سیالا	حال ہوگی تو دین ایک ایسی سیال بہتی چیز قرار پا جائیگی
لاینضبط ؎	جس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہے۔

اگر اسلام کے پیش نظر یہی بے ضابطگیاں تھیں تو پھر نمازوں میں، روزوں میں، حج میں، بلکہ اگر
کیا جائے تو اپنے ہر ہر شعبہ ہر ہر شاخ میں اس کو نظم وضبط وحدت ویکسانیت پیدا کرنے کی کیا
ورت تھی، لوگ سوچتے نہیں ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث یعنی صفوف کو درست
نے کا حکم دیتے ہوئے جو آپ فرمایا کرتے تھے۔

استووا ولا تختلفوا فتختلف	برابر برابر کھڑے ہو جاؤ (اختلاف نہ کرو یعنی آگے پیچھے
قلوبکم ؎	نہ ہو جاؤ) ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے۔

اگر صرف اسی پر غور کر لیتے تو دلوں میں جو شبہ ہوا ہے اس کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ظاہر ہے
فوں کا برابر رکھنا نماز کا کوئی ایسا جز تو نہیں ہے جس کے بغیر نماز باطل یا فاسد ہو جاتی ہو لیکن
ضرت نے فرمایا کہ صفوں کے ظاہری اختلاف کا اثر تمہارے باطن پر پڑے گا، کیوں پڑے گا؟
ہے کہ اس کا بالخاصیت بھی یہ اثر ہو جس پر نبوت کی نظر پہنچی ہو، لیکن اسی کے ساتھ اتنی بات تو

ؔم ص ۱۴۷۔ ؎ مسلم ابوداؤد وغیرہ۔

شاید یوں بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ ظاہر کی یکسانیت کا اثر باطن پر اس لئے بھی پڑتا ہے کہ آدمی جب دوسرے کو بھی اسی کام میں پاتا ہے جس میں وہ خود مشغول ہے تو نفسیاتی طور پر دونوں کے قلوب بھی باہم یگانگت محسوس کرتے ہیں اور جب ظاہر کے اتحاد کا اثر باطن کے اتحاد پر نفسیاتی طور پر پڑتا ہے تو اختلاف کا اثر بھی اسی قانون کا پابند کیوں نہ ہوگا، صفوف کی ظاہری ناہمواری کو مٹانے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا اصرار تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آپ نمازیوں کے مونڈھوں کو جا کر چھوتے اور جو باہر نکلا نظر آتا اسے برابر کرنے کا حکم دیتے صحابہ کا بیان ہے

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مونڈھوں

یمسح مناکبنا فی الصلوٰۃ — کو چھوتے (یعنی برابر ہے یا نہیں اس کا پتہ چلانے)

اور اسی کے بعد آپ استووا (برابر ہو جاؤ) کا حکم دیتے۔ اور جب ایک معمولی صفوں کے اختلاف سے پیغمبر کو نظر آیا کہ دلوں میں اختلاف پڑ جائے گا، پھر خود ہی غور کرنا چاہیئے کہ بلا وجہ اگر مسلمان مذہبی زندگی کے عام شعبوں میں گوناگونی پیدا کریں گے۔ تو اس کا اثر ان کے نفسیات پر کیا پڑے گا خصوصاً عوام کا جو حال اس باب میں ہوتا ہے اس کے دور رس نتائج کا تو اس وقت صحیح اندازہ بھی مشکل ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سب کا حق پر ہونا، یہی اس بات کو شرعاً و عقلاً و مصلحۃً ضروری بنا دیتا ہے کہ بلا وجہ ایک امام کو چھوڑ کر دوسرے کی پیروی نہ کی جائے۔ آخر سب کے صواب و حق پر ہونے کا نتیجہ یہی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بھی جائز وہ بھی جائز، پھر دو جائزوں میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو جو آپ اختیار کرتے ہیں تو یقیناً ایک ایسا کام آپ کر رہے ہیں جس کی ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔

لیکن بجائے اس کے آپ ایک ہی پہلو کو اگر اختیار کئے رہیں خصوصاً جس کے پابند اس ملک کے عام لوگ ہوں تو یہ فعل آپ کا بلا وجہ نہ ہوگا، بلکہ اس اختلاف سے مسلمانوں کے اجتماع کو آپ بچا رہے ہیں جس سے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہمارے اور آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ عوام سے اختلاف خواہ کسی معمولی ہی بات میں کیوں نہ ہو باعثِ فساد ہوا ہے

ن المسلمین جسے قرآن نے حرام کیا ہے کسی جائز فعل کے لئے اس کا ارتکاب آخر کیسے جائز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ طیبہ تو یہ ہے کہ جائز ہی نہیں بلکہ جائز سے بھی جو چیز اہمیت دہ بڑھی ہوئی تھی، آپ نے اس کو اس لئے ترک فرما دیا کہ جس خطرہ کا اندیشہ اس سے تھا وہ ہمیت رکھتا تھا، بناء کعبہ کے متعلق آپ کا فرمانا

ولاحدثان قومك بالکفر لفعلت (صحاح)	اگر تمہاری قوم (اے عائشہ) کفر کو حال ہی میں چھوڑے نہ ہوتی تو میں ایسا کرتا یعنی ابراہیم علیہ السلام کی نیو پر اسے تعمیر کرا دیتا۔

افقین کے قتل کے مشورہ پر آپ کا فرمانا کہ

لایتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابہ (مسلم)	لوگ، اس کا چرچا کرنے لگیں کہ محمد اپنے صحابیوں کو قتل کرتے ہیں۔

یہ کو بھی بہت سی جائز باتوں کے متعلق حکم دینا کہ عوام کے سامنے ان کا اظہار نہ کیا کرو، فرماتے کہ

اتریدون ان یکذب اللہ ورسولہ (بخاری)	کیا عوام کے سامنے ان باتوں کا ذکر کرکے چاہتے ہو کہ اللہ اور رسول کو جھٹلایا جائے۔

یسی بیسیوں باتیں ہیں جن سے مصالح عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شریعت کا حکم ہے کہ اگر کوئی جائز بھی ہو تو اس کو ترک کر دیا جائے چہ جائیکہ فساد بین المسلمین جسے قرآن نے حرام کیا ہے اس کے ب کا اندیشہ پیدا ہوتا ہو۔

شہور بات ہے بخاری وغیرہ سب کتابوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کو جاہلیت کے زمانہ میں قریش نے حلال پیسوں کی وجہ سے ان حدود جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کی تھی ایک سمت حطیم کی طرف کچھ ہٹ کر رت بنائی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد چاہتے تو ابراہیمی حدود پر پھر کعبہ کو بنوا دیتے، لیکن سمت کے پیش نظر کہ قریش کا اسلام ابھی نیا اسلام ہے جس حال پر کعبہ بنا ہوا تھا چھوڑ دیا گیا۔ ظاہر ہے ام کے چار ارکان میں سے دو مستقل ارکان نماز اور حج کا براہ راست کعبہ سے تعلق ہے، لیکن باوجود اس لحت کی رعایت فرمائی گئی۔ ۱۲

آپ نے عمر بن عبد العزیزؒ امام مالکؒ وغیرہم اکابر اسلام کے ان اقوال کو تو شوق
کہ اختلافات کی تمام صورتوں کو وہ جائز قرار دیتے ہیں جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے وہی اس کے
کافی ہے، لیکن آپ نے ان ہی بزرگوں کے اقوال کے اس حصہ پر غور نہیں کیا کہ تمام مسلمانوں کو
ہی رائے پر جمع کیوں نہیں کر دیتے جب ان سے اس کی خواہش کی گئی تو انکار کرتے ہوئے تمام
محروسہ کے ولاۃ و حکام کے نام آپ نے فرمان جاری فرمایا۔

يقضي كل قوم بما	ہر ملک والے اسی پر عمل در آمد کریں جس پر ان کے فقہاء
اجتمع عليه فقهاءهم	نے اتفاق کیا ہو۔

اور خلیفہ عباسی کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا۔

دع الناس وما اختار اهل	چھوڑ دو مجھے ہر شہر کے لوگوں کو جو کچھ انھوں نے
كل بلد منهم لانفسهم	اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔

خود سوچئے کہ ان اقوال کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس علاقہ کے
دین کے غیر بنیادی حصہ میں جس مسلک کے پابند ہیں، ان کو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے، اور یہی
چاہتا ہوں، اور میں کیا کہتا ہوں، ابتدا سے مسلمانوں کا ہر ملک میں نسلاً بعد نسلٍ، طبقۃً بعد طبقۃٍ
چلا آرہا ہے کہ جس علاقہ کے مسلمان جس چیز کے پابند ہیں بس اسی کے پابند رہتے ہوئے چلے
ہیں، جیسا کہ بہ تفصیل آئندہ معلوم ہوگا کہ اسلام کے ساتھ قدرت کی یہ غیبی امداد ہوئی کہ دین
غیر بنیادی حصہ کے متعلق اگرچہ ابتداءً بیسیوں آرا اور مسالک پیدا ہو گئے تھے، اور ہر ایک کا
کسی نہ کسی مجتہد اور امام ہی کی طرف تھا لیکن بتدریج ان کی تعداد کم ہوتے ہوئے اس نوبت
آپہنچی کہ آج مسلمانوں کی اکثریت غالبہ (یعنی اہل سنت میں) لے دے کر صرف چار مسلکوں کا
باقی رہ گیا ہے، اور ان میں بھی اگر سچ پوچھئے تو حنابلہ کی تعداد اتنی اقلیت میں ہے کہ شاید
زیادہ صحیح ہوگا کہ اب اسلامی دنیا زیادہ تر صرف حنفیہ و مالکیہ اور شافعیہ پر مشتمل ہے اور ان میں
عددی نسبت ہے اس کا اندازہ آپ کو اس تازہ رپورٹ سے ہو سکتا ہے جسے امیر شکیب ارسلان

ب حسن المساعی کے حاشیہ پر درج کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

واتباع مذهب ابی حنیفة اکثر المسلمین	مسلمانوں کی اکثریت امام ابوحنیفہؒ کی پیروی
فالترک باجمعهم ومسلموا بلاد	یعنی سارے ترک اور بلقان کے مسلمان اور
البلقان ومسلموا الرسیة ومسلموا افغانستان	روس کے مسلمان افغانستان کے مسلمان
والهند والصین واکثر مسلمی العرب فی	ہندوستان کے چین کے عرب کے اکثر مسلمان
الشام والعراق فی الفقه علی مذهب الحنفی	جو شام و عراق میں رہتے ہیں، فقہ میں حنفی
واکثر اهل سوریة والحجاز والیمن والحبشه	مسلک رکھتے ہیں اور سوریہ (شام) حجاز یمن
وجمیع بلاد الجاوی واکثر الامة	حبشہ اور جاوہ کے سارے علاقے کردستان
الکردیة یقلدون الامام الشافعیؒ والمغاربة	والے امام شافعیؒ کے مقلد ہیں اور مغرب کے
واهل غربی افریقیة واواسط افریقیة	مسلمان اور مغربی و وسط افریقہ کے مسلمان اور
بعض اهل مصر یقلدون امام دار الهجرة	مصر میں کچھ لوگ دار الہجرت کے امام امام مالکؒ
مالک بن انس واهل نجد وبعض	کے مقلد ہیں، نجد والے اور بعض شام کے
اهل سوریة کاهل نابلس ودومه	باشندے جیسے نابلس و دومہ والے امام احمد
یقلدون احمد بن حنبل (ص ۶۹)	بن حنبل کے مقلد ہیں۔

اسی کے ساتھ اگر اس پر بھی غور کیا جائے کہ عموماً مختلف فقہی مسالک رکھنے والے مسلمان لک میں ملے جلے نہیں پائے جاتے بلکہ بعض قدرتی اسباب و حالات ایسے پیدا ہوئے کہ عموماً جہاں اں احناف ہیں وہاں موالک نہیں ہیں، و بالعکس[1]، اور یہی حال دوسرے ائمہ کے متبعین و مقلدین کا ے، جس کی وجہ سے بحمد اللہ ان تیرہ صدیوں میں جہاں تک ممکن تھا، مسلمانوں کی عملی وحدت بھی ہر ملک یں عموماً ہمیشہ محفوظ رہی ہے، جس کا مآل یہی ہوا کہ باوجود اختلاف کے عام حالات میں ان کی دینی حدت کسی زمانہ میں بھی مجروح نہیں ہوئی، غیر اقوام جو ان کے ساتھ مختلف ممالک میں آباد تھے

[1] یعنی جہاں مالکیہ ہیں وہاں حنفیہ نہیں مثلاً مراکش و الجیریا وغیرہ میں۔

ان کی نگاہوں میں کبھی اس لئے سبک نہیں ہوئے کہ کوئی مسلمان کسی طرح نماز پڑھتا ہے کوئی
گویا عبادت تک میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، دوسری قوموں کے لئے مسلمانوں کی
ہم آہنگی ہمیشہ محل حیرت واستعجاب رہی، کیونکہ ایک ملک بلکہ ایک صوبہ بلکہ شاید کسی ایک
بھی اسلام کے سوا کسی دین کے ماننے والوں میں کوئی ایسا طبقہ مشکل ہی سے پایا جاتا ہے جن
فروعی ہی نہیں بلکہ اصولی اختلافات نہ ہوں خصوصاً یہود و نصاریٰ جن کی طرف قرآنی آیات
حدیثوں میں بھی اشارے کئے گئے ہیں کہ ستر ستر بہتر بہتر فرقوں میں یہ منقسم ہیں اور بعض مذ
کے پیروؤں کا حال تو یہ ہے کہ معبود تک پر ان کا اتفاق نہیں ہے یعنی کوئی کسی دیوتا کا پجاری
اور کوئی کسی دیوی کا۔

بہر حال ہر ملک کے مسلمانوں کی یہ عملی وحدت، ایک رنگی کی نعمت بڑی نعمت تھی، اور کہ
ہوں کہ ابھی تک یہ رنگ زیادہ خراب نہیں ہوا ہے، لیکن جو لاپروائیاں چند سطحی تاثرات کے زیر ا
اس کے متعلق برتی جا رہی ہیں، کون جانتا ہے کہ ان کے نتائج آگے کیا ہوں گے۔ امام الس
امام اوزاعیؒ سے منقول ہے۔

من اخذ بنوادر العلماء	علما کے نادر اور شاذ اقوال کو جو اختیار کرتا ہے وہ
فقد خرج من الاسلام	گویا (اسلام) سے خارج ہو گیا۔

میں تو اس کا یہی مطلب سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی جماعت سے ایسا آدمی نکل جاتا
اور اپنی جماعت سے نکلنے کے بعد اگر اپنے دین سے بھی نکل جائے تو کیا تعجب ہے، ان لوگوں کے
جو اسی قسم کی انوکھی نادر و شاذ باتوں کو تلاش کر کر کے احیاء سنت وغیرہ ناموں سے مسلما
میں پیش کر کے اختلاف کی آگ بھڑکا رہے ہیں، امام اوزاعیؒ کا یہ قول ان سے فکر و نظر کا مطالبہ کر
ع ان کان فی القلب ایمان واسلام۔

پس صحیح طریقۂ عمل یہی ہے کہ علم و اعتقاد کی حد تک تو غیر بنائی اختلافات کے متعلق
یہی خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے ماننے والوں اور ان پر عمل کرنے والوں میں کوئی غلطی پر نہیں

لیکن علماء مسلمانوں کو چاہئے کہ جس مسلک کا اس ملک میں رواج ہو، جن لوگوں کی ان مسائل کے متعلق اکثریت ہو اسی کی اتباع کریں تاکہ حدیث اپنے پیغمبر کے فرمان۔

اتبعوا السواد الاعظم	بڑی اکثریت کی پیروی کرو، جس نے عام مسلمانوں
من شذ شذ فی النار۔	سے الگ ہو کر راہ بنائی وہ جہنم میں گرا۔

کی تعمیل سے بھی سرفراز ہوں اور جس "شذوذ" کی اس میں دھمکی دی گئی ہے اس سے بھی مامون ہو جائیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے، جیسا کہ بعضوں کے اصرار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورةً بھی آدمی اپنے ملک کے عام مسلک سے کسی وقت کسی زمانہ میں تجاوز نہیں کر سکتا، کم از کم احناف کا مسلک تو کتابوں میں جو نقل کیا جاتا ہے سو یہ ہے۔

لو افتی بقول مالك فی موضع الضرورة	اگر ضرورت کے وقت امام مالک کے قول کے
ینبغی ان لا باس به	مطابق (کوئی حنفی عالم) فتوی دے تو اس
(فتح المعین شامی وغیرہ) کتاب المفقود	میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ "مالک" کے لفظ کا یہاں بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے ورنہ مقصد وہی ہے کہ جن چار مجتہدوں کی فقہ دنیا میں باقی رہ گئی ہے، یعنی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جس کی صفت یہ بیان کی ہے۔

ان یکون اقوالهم التی یعتمد	یعنی ان ائمہ کے جن اقوال پر اعتماد کیا جاتا ہے
علیها مرویة بالاسناد الصحیح	وہ صحیح سندوں سے مروی ہوں اور عام مشہور متداول
ومدونة فی کتب مشهورة وان	کتابوں میں ان کے یہ اقوال مدون ہوں نیز ان کی
یکون مخدومة بان بین الراجح	خدمت بھی کی گئی ہو، یعنی مختلف پہلوؤں میں جو
من محتملاتها وتخصص عمومها	راجح ترین پہلو ہو اس کو ترجیح دی گئی ہو، نیز بعض
فی بعض المواضع ویقید	مقامات میں عام الفاظ کے ساتھ جہاں ضرورت ہو
مطلقها فی بعض المواضع	خصوصیت کا اضافہ کیا گیا ہو، اور بعض کو مقید کیا

---

[1] یعنی مسلمانوں کی عام جماعت کے دائرہ سے نکلنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ ایسا آدمی جہنم میں جا پڑیگا

والجمع المختلف فیھا — گیا ہو، مختلف اقوال میں تطبیق دی گئی ہو، جو احکام ان کے

ویبین علل احکامھا — ثابت ہوں ان کے اسباب و علل بیان کیے گئے ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے ان صفات کو بیان کر کے لکھا ہے۔

ولیس مذھب فی الازمنۃ — اور پچھلے زمانہ میں مذکورہ بالا صفات کے ساتھ

المتاخرۃ بھذہ الصفۃ الاھذہ — کوئی مذہب بجز ائمہ اربعہ کے مذہب کے نہیں

المذاھب الاربعۃ (عقد الجید ص۳۶) — پایا جاتا۔

گفتگو اگرچہ تدوینِ فقہ میں ہو رہی تھی، لیکن اسلامی فقہ کو ان ہی اختلافات کے قصوں کو سُنا سنا کر آج جتنا بے وزن کر دیا گیا ہے، ان ہی قصوں نے مجبور کیا کہ اختلاف کا جو واقعی قصہ ہے کچھ کہنے سے پہلے اس قصہ ہی کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ بیان تو ابھی اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی اس کتاب میں بطور تمہید کے جس قدر کہنا مقصود تھا وہ بحمد اللہ کہا جا چکا اب اپنے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔ انشاء اللہ "مجلہ تحقیقاتِ علمیہ" کی آئندہ اشاعت میں آئندہ ابواب بتدریج شائع ہوتے رہیں گے۔

یکم ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ م ۴ خورداد ۱۳۵۲ف م، اپریل ۱۹۴۳ء چہار شنبہ

جوار الجامعۃ العثمانیہ

۳ بجے شب

حیدر آباد دکن

صلۂ عام:۔ ہر مسلمان کو اس کی اجازت ہے کہ جی چاہے تو حسبۃ للہ اس مضمون کو چھاپ کر بھی تقسیم کر سکتے ہیں اور جس زبان میں چاہیں ترجمہ کر کے بانٹ سکتے ہیں۔

مناظر احسن گیلانی

توحیدِ الوہیت

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا
صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن

سیری بہ حریمِ جان و دل منزل کن قطعِ نظر از صورتِ آب و گِل کن
جز معرفتِ الٰہ ہیچ است ہمہ بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن! (سیری غزنوی)

تخلیقِ عالم کی غایت کیا ہے؟ جن وانس پیدا کیوں ہوئے؟ ع از آمدن و رفتن ما سود ے کو؟ فلسفیوں کو اپنے کودکِ عقل کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر (ذرھم فی خوضھم یلعبون) ہم اس اساسی سوال کے جواب کے لئے قرآنِ کریم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مبدء ہے علمِ حقیقی کا اور جو ریب و شک، ظن و تخمین، قیاس و وہم سے منزہ ہے! یہیں ہمیں وہ نورِ ہدایت نصیب ہوتا ہے جس کو عقلِ نظری ہمیں عطا نہیں کرسکتی! انّ ھدی اللہ ھو الھدیٰ! یہیں مومن کے لئے یقین و اذعان کا ذخیرہ ہے۔ یہیں بداہت و ہدایت کا جلوہ ہے یہیں علمِ حقائق ہے اور یہیں طمانیت و تسکین۔ وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ۔ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ[1]! (پ ۸ ع ۶)

علمی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃِ نبی است واللہ کہ سیرابی از آں تشنہ لبی ست
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکمِ وقت تابع شدن حکمِ خرد بوالہبی ست (شاہ ولی اللہ)

جن وانس کی تخلیق کی غائت صاف و سلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے "مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ" عبادت کے معنی ہیں "توحید" چنانچہ امام المفسرین حضرت ابنِ عباس رض کا

---

[1] اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی۔ اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی توحید کے ہیں[۱]۔ گویا محاورہ قرآن میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے" ایاک نعبد وایاک نستعین" کے معنی ہوں گے نوحدک ونطیعک اور" ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔ عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے جو واحد لاشریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے وَاعْبُدُوا اللہَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا[۲] (پ۵ ع۳) ہمیں اپنی عبادت و معرفت کے لئے پیدا کیا ہے، ہماری زندگی کا مقصود ہی عبادت و بندگی ہے، یہی عرفان ہی توحید ہے، تمام انبیا نے اسی توحیدِ الوہیت کو پیش کیا۔ یہی ان کی بعثت و دعوت کا اصل مقصود تھا۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم ۔۔۔ خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم!
مقصودِ منِ خستہ زکونین توئی ۔۔۔ از بہر تو میرم و برائے تو زیم!
(قائم)

تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ یعنی اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کا سوائے تمہارا کوئی معبود و رب نہیں! یا اَنْ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللہ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو! حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا: اَنِ اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون، اور یہ عبادت اسی توحید و تقویٰ و اطاعت پر مشتمل ہے! حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ نے بھی انہی الفاظ سے کہ یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ سے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلایا! حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا اعبدوا اللہ واتقوہ ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون اور مشرکین سے اپنی برات اس طرح ظاہر فرمادی۔ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ[۳] (پ۲۵ ع۹) انھوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ وصیت فرمادی تھی کہ اِنَّ اللہَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[۴] (پ۱ ع۱۶)

---

[۱] بخاری حدیث وفد عبدالقیس۔ [۲] تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو۔
[۳] میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے۔
[۴] اے میرے بیٹو، اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہلِ فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ
رب اللہ ہی کو پوجو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں! اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہمارے نبی
الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذات پر اس دعوت الی التوحید کو ختم
کیا، آپ کو ارشاد ہوا۔ قُلْ یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنِّی رَسُولُ اللّٰهِ إِلَیْکُمْ جَمِیعًا الَّذِی لَهُ مُلْكُ
السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ یُحْیِی وَیُمِیتُ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ (پ ۹ ع)

غرض توحیدِ الوہیت پر سارے انبیائے اولین وآخرین کا اجماع ہے، جو بھی رسول آیا وہ توحید
کی دعوت لیکر آیا۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِی إِلَیْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا
فَاعْبُدُونِ۔ (پ ۱۷ ع ۲)

اسی لئے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحیدِ الوہیت
و رسالتِ محمدی کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لئے ضروری ہے، فرضِ اول ہے
اسمِ صفت ہے اور باجماع اہلِ علم اس کے معنی "معبود" کے ہیں اور اس پر آیاتِ قرآنی دلیل ہیں
ان میں سے بعض پر غور کرو۔

(۱) وَهُوَ الَّذِی فِی السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَفِی الْأَرْضِ إِلٰهٌ — یعنی وہی ذات پاک آسمان اور زمین کا معبود ہے۔

(۲) أَمْ لَهُمْ إِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُونَ۔ — یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟

(۳) وَجَاوَزْنَا بِبَنِی إِسْرَائِیلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَعْکُفُونَ عَلٰی — ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا، پس ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھے ہیں

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں
اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر
اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں،
پس میری عبادت کیا کرو۔

اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۔ (پ ۹ ع ۶)

کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔"

(۴) وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ۔ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۔

اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو جما ہوا بیٹھا تھا۔ ہم اس کو جلا دیں گے پھر اس کو دریا میں بکھیر دیں گے بس تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں، وہ علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے۔ ابوجہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلا وہ کلمہ کیا ہے، ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لئے تیار ہیں۔ فرمایا دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا کہنے لگے: " اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۰) یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔"

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ "الٰہ" سے مراد معبود ہے اور لا الٰہ الا اللہ سے ا[illegible] توحید الوہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جس کو سارے انبیاء نے پیش کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی [illegible] عبادت ہے اسی کی عبادت کی جانی چاہیئے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جوڑنی چاہیئے" افراد عبادت [illegible] ہی تمام پیغمبروں کے پیام کا حاصل ہے یعنی صرف اللہ ہی الٰہ رہے۔ غیر اللہ بحیثیت الٰہ قلب سے فنا ہو ج[illegible]

دل عاشق روئے تست با عہد درست
جاں طالب وصل تست از روز نخست
آنکس کہ نہ جست وصل تو ہیچ نیافت
وآنکس کہ ترا یافت دگر ہیچ نجست
(شیخ عطار)

توحید فی العبادت کی ضد شریک فی العبادت! موحد اللہ ہی کو الٰہ مانتا ہے یعنی اللہ ہی کی
[عبادت] کرتا ہے اور مشرک غیر اللہ کو بھی الٰہ مانتا ہے اور اس کی بھی عبادت کرتا ہے۔ سورہ انعام میں اٹھارہ
[نبیوں] کے نام لیکر یعنی ابراہیم۔ اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون
[زکریا، یحییٰ]، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کرکے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوسِ قدسیہ
[اللہ تعالیٰ] کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں کیونکہ شرک کے
[ساتھ ک]وئی عمل مقبول نہیں۔ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (پ۷ع۱۵)
تصریحاتِ بالا سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس عالم میں انسان کی تخلیق عبادت
[یعنی توحید فی العباد]ت کے لئے ہوئی ہے، اسی لئے تمام انبیاء و رسل توحید ہی کی دعوت کے لئے مبعوث ہوئے،
[انہو]ں نے بنی نوعِ انسان کو توحید فی العبادت کی طرف بلایا شرک سے ڈرایا، ہر ایک نے بآواز بلند فرمایا
[لا الٰہ] اِلّا اللّٰہُ۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ! انتہائے کارِ عالم لا الٰہ!

اور جب مقصودِ زندگی توحید فی العبادت ہے تو ہمیں عبادت کے مفہوم پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے
[اور اس] کی ماہیت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں اس کے
[حصول] میں کامیاب ہوں اور کامیاب عمل ہونا بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں! یاد رکھو کہ یہ دو روزہ پُر فریب زندگی
[م]ختلف ادوارِ طفلی و جوانی و پیری کی مخصوص نعمتوں اور بلاؤں سے گزر کر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے
[آ]خری دور میں پہنچ کر ہم بیدل کے الفاظ میں کہہ اٹھتے ہیں۔

طفلی کہ زمانِ بازی می آراست	دامن افشاند
انگاہ جوانی کہ داغش پیداست	گل کرد و نماند
اکنوں پیری نفس شماری دارد	بیدل چہ علاج
زیں نسخہ ہم آخر ورقے چند بجاست	باید گرداند

لیکن ورق الٹنے کے بعد قصہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اب دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کا دور

شروع ہوتا ہے اور یہ ابدی ہے، اس کی انتہا نہیں، یہاں یا تو سکھ ہی سکھ ہے یا پھر دکھ ہی دکھ۔ تو حید
خاتمہ ہوا تو سوائے سکھ کے کچھ نہیں[۱] اور اگر شرک پر دم توڑا تو سوائے دکھ کے کچھ نہیں[۲]۔ اسی لئے حضرت ا
اور حضرت داؤدؑ نے اپنی اولاد کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ فَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ!

اب ذرا عبادت کے تضمنات پر تفصیل سے غور کرو۔

لغت میں عبادت نام ہے "غایت تذلل" کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیازمندی کا اور
میں عبادت سے مراد بندوں کے ان افعال واقوال واحوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق تعالیٰ کی عظ
جلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عبادت اسم جنس ہے اس کی بہت ساری انواع ہیں۔

(۱) عبادت اعتقادی، یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام "توحید الوہیت" ہے
جیسا کہ اوپر بتلایا گیا۔ محاورۂ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ اک
اللہ ہی الٰہ یعنی معبود و رب واحد احد ہے، وہی خالق ہے، اسی کی سب خلق ہے اور اسی کا امر، وہی مالک
وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے، وہی مولیٰ ہے، اسی طرح الوہیت کے دوسرے لوازم کا اع
لہٰذا دعا، ندا، استغاثہ، استعانت، التجا، رجا، خوف، سب کے سب اللہ ہی کے لئے ہوں، غیر اللہ
کے لئے نہ ہوں۔

---

[۱] ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٰئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا و
ابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون، نحن اولیاء کم فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ ولکم
فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون، نزلا من غفور الرحیم (پ ۲۴، ۱۸) جن لوگوں
نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے، کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو، اور تم جنت
پر خوش رہو، جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں اور عقبیٰ
میں بھی رہیں گے اور تمہارے لئے وہیں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اس میں
جو مانگو گے موجود ہے۔

[۲] انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وماوٰہ النار (پ ۶، ۱۳) جو شخص اللہ تعالےٰ
کے ساتھ شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ جنت کو حرام کردے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

(۲) عبادت لفظی: کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا زبان سے اقرار جس نے دل سے اس کا اعتقاد رکھا لیکن زبان سے اقرار نہ کیا تو اس کا خون و مال محفوظ ہوگا اور جس نے زبان سے کہا مگر دل سے معتقد نہ ہوا تو اس کا خون و مال تو بچ گیا لیکن وہ منافق ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

(۳) عبادت بدنی: جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

(۴) عبادت صوم و افعال حج و عمرہ، جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق وغیرہ

(۵) عبادت مالی: حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ۔

اسی طرح واجبات و مندوبات کی افعال و اقوال، اموال و ابدان میں اور انواع ہیں جو سب عبادت میں داخل ہیں، ان کا حصر یہاں ضروری نہیں، صرف امہاتِ عبادت کی یہاں تصریح کردی گئی۔ خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں۔ بنی نوعِ انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انھوں نے غیر اللہ کو اپنا الٰہ یا معبود قرار دیا، اپنا نافع و ضار سمجھا، باعتقاد نفع و ضر ان کی تعظیم کی، وقتِ حاجت ان سے فریاد رسی چاہی ان سے استعانت کی، ان کو پکارا، ان سے التجا کی، استغاثہ کیا، رجاء و خوف کا تعلق ان سے رکھا، ان کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے ان کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و ذلت کی نسبت ان سے جوڑی، ان کے سامنے خضوع کیا اور جب انبیائے کرام نے انھیں افراد عبادت للہ کی دعوت دی، توحید فی العبادت کی تلقین کی انھیں للکارا کہ

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی

بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تراشی

تو ان مشرکین نے از راہ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا؟ (پ ع ۱۶) کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم نرے اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اجعل الآلهة الٰها واحدا، ان هٰذا لشيء عجاب (پ ع ۱۰) یعنی

بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا۔

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مقر تھے اس پر ایمان رکھتے تھے، ان کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے، لئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله (پ ۲۵ ع۴) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ لئن سألتهم من خلق السموات والارض ليقولن خلقهن العزيز العليم، رزاق بھی وہی ہے، محی و ممیت بھی وہی اور مدبر امر بھی وہی؛ قل من يرزقكم من السماء والارض امن يملك السمع والابصار ومن يخرج الحي من الميت ويخرج الميت من الحي ومن يدبر الامر فسيقولون الله، فقل افلا تتقون (پ ۱۱ ع۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے: قل من بيده ملكوت كل شيء وهو يجير ولا يجار عليه ان كنتم تعلمون، سيقولون لله، قل فانى تسحرون (پ ۱۸ ع۵) وہی آسمانوں کا اور عرشِ عظیم کا مالک اور رب ہے۔ قل من رب السموات السبع ورب العرش العظيم، سيقولون لله، قل افلا تتقون (پ ۱۸ ع۵)

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی زبانی کہلوایا ہے۔ لقد علمت ما انزل هولاء الا رب السماوات والارض بصائر (پ ۱۵ ع۱۲) تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے ذرائع ہیں، اور تمام مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ انی اخاف الله رب العالمين، نیز رب انظرنی اور رب بما اغويتنی؟

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا، یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی و ابدی نہیں مانتے تھے، سوائے ثنویہ کے دنیا میں کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکینِ مکہ توحید ربوبیت تک کے مقر تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی خالقیت و رزاقیت، مالکیت و حاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق، مملوک و محکوم جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے۔ لبيك لا شريك لك الا شريك هو لك تملكه وما ملك

یعنی "اے اللہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شئے کا مالک نہیں"

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک و حاکم قرار دے رہے ہیں اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس اعتراف وجود باری اور ربوبیت الٰہی کے انھیں کافر و مشرک کیوں ٹھیرایا گیا، ان کے تمام نیک اعمال کیوں حبط اور برباد قرار دیئے گئے۔ خلود فی النار کی ان کو کیوں بشارت دی گئی؟ ان کا "ایمان باللہ" کیوں ان کی جان و مال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود وہ "اعداء اللہ" کیوں قرار پائے؟ ان کو کذاب، مسحور، ظالم، کیوں کہا گیا؟ ان کا شمار "ہلکین" میں کیوں ہوا؟ انھیں بے عقل حیوان بلکہ ان سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا؟ کا فیصلہ ان کے متعلق کیوں فرمایا گیا؟

اس کا جواب تم اوپر پڑھ چکے ہو وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے: اشراک فی العبادۃ! ہر قوم اور ہر امت کے لئے ایک نبی مبعوث ہوا اور اس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی: ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ (پ ۶) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو افراد عبادت الٰہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افرادِ ربوبیت کے مقر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود جانو، لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جاؤ، اس کے معنی و مقتضیٰ پر عمل کرو، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سراً و علانیۃً قلبی و قالبی طور پر خالص اللہ کے واسطے ہو۔ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف (طواف) ہو یا کوئی عبادت یا پرستش کی کوئی سی شکل صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہو، اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے۔ تم اللہ ہی کے فقیر ہو، ذل و افتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لو، جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لو ان سے نفع و ضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو، اللہ تمہارے لئے بہر حال کافی ہے۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ؛ تمہیں صرف اللہ ہی کا ہو کے رہنا چاہیے۔ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

باخلق آشنا نہ شود مبتلائے تو بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو
میخواہم از خدا بدعا صد ہزاراں جاں تاصد ہزار بار بمیرم برائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سن کر کہا دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے، اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے بلکہ ان کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں اللہ ہی کو مالک وحاکم ورب سمجھتے ہیں، مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں، ہم ان کو محض اپنا "شفیع" (وکیل اور سفارشی) جانتے ہیں۔ ہم ان کی عبادت کرنی اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا "شفاعت" اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں: ھٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (پ ۱۱ ع ۷) ان کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی وخفگی سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتے ہیں۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (پ ۲۳ ع ۱۵)

یہی ان کا کذب، کفر اور شرک تھا!! اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (پ ع)

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ع)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے یہ معبود کون تھے جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے "تفسیر کبیر" میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے، ان کی تحقیق کی رو سے بت پرستوں (عابدان اوثان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں کیونکہ انبیا میں سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور جب انھوں نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اعبدوا اللّٰه واتقوه واطیعون (پ ۲۹ ع ۹) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب وروز کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا یعنی تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ود کو اور سُواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا" (پ ۲۹ ع ۱۰)

اب ان کے یہ معبودان باطل ود و سواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے[1]

[1] رواہ البخاری۔

نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ تھے، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہوں پر ان کے نشان قائم کیے گئے، ان کا بھی وہی نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کردی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعا رہے ہیں، روزِ حشر بھی مقبول الشفاعت رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:

یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ	یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے
وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ	ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں
شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ قُلْ	اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں
اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعْلَمُ	آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو
فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ	خدا کو نہیں معلوم، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں،
سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (پ ۶)	وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے"

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بت پرستی کا منشار اولیار انبیار وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انھوں نے اپنے بتوں کو اُن ہی کی صورت پر تراشا تھا۔ اور انھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سرِ نیاز ان کے سامنے جھکاتے تھے۔ اس طرح وہ اصل میں "ولی پرست" "صالح پرست" اور "نبی پرست" تھے! اب ذرا فخر رازی کی عبارت بھی سن لو جو اوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انھوں نے لکھی ہے۔

"انھم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان	یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیا
علی صور انبیاءھم واکابرھم وزعموا انھم	و اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے
متی اشتغلوا العبادۃ ھذہ التماثیل فان	تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے
اولئک الاکابر تکون شفعاء ھم	تو یہ اکابر اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے
عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان	اس کی نظیر اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں

اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور | کی قبروں سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے
الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورھم | کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے
فانھم یکونون شفعاء لھم عند اللہ[۱] | نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے۔"

اوپر کی توضیحات سے مندرجہ ذیل چار امور بطور تفریع لازم آتے ہیں۔ انھیں خوب ذہن نش

(۱) زمانۂ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے۔ حق تـ
انھیں "مشرک" قرار دیا۔

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہما
اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے "سفارشی" ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو "شفیع" یا سفارشی
کر بھی اس کی عبادت کرنا موجبِ شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع سمجھنا یہ شرک نہیں ہے بلک
عبادت اس لئے کرنا کہ ہماری سفارش کریں گے یہ شرک ہے)۔

(۳) جو افعالِ عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس پر
کا اطلاق کیا جائے گا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہوگی چنانچہ اسی وجہ سے امام رازی
گور پرستوں کو بت پرستوں کا نظیر قرار دیا۔

(۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر ان کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر ان کو بالاستقلال عالم میں متـ
جان کر پوجنا بھی بدرجۂ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی کشادگی چاہنـ
حاجات کی دعا کرنا وغیرہ

مشرکین کی "عبادت" بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب "شفیع"
نافع و ضار جان کر ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے اور

(۱) ان سے وقتِ حاجت فریاد رسی چاہتے تھے یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے۔

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، ان سے منتیں مانگتے، ا

---

[۱] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۲ سورہ یونس تحت آیہ ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ۔

نذر ذبح کرتے اور ان کے ارد گرد پھرتے یا طواف کرتے تھے۔ گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور
کو خالق ورازق، محی ومیت، مدبر زمین وآسمان مانتے تھے: ومایومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ ندا، دعا، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیرہ
افعال عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود ورب واحد واحد ہیں تو پھر ان افعال کا تعلق صرف
ہی سے ہونا چاہئے اور کسی غیر سے نہیں اعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا (پ ۲۶) یہی ہے افراد عبادت اللہ
فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین، الا للہ الدین الخالص[1] (پ ۲۳ ع ۱۵) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ
سے روا رکھا تھا اور اسی لئے انھیں تہدید کی گئی تھی کہ "فلا تجعلوا للہ اندادا وانتم تعلمون" یعنی
جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی ند، ہمسر نہیں، پھر کیوں تم غیر اللہ کی عبادت کرکے ان کو معبود قرار دے کر
انہیں حق تعالیٰ کا ہمسر بنا رہے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب ندا ودعا، نذر و نیاز، ذبح ونحر،
طواف وعکوف کے ذریعہ حاصل کروگے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قریب" کردیں گے اور تمہارے شفیع
بن جائیں گے قطعاً باطل ہے کفر بحت ہے، شرک محض ہے!

دعا عبادت ہے | دعا (دعوت، دعایۃ، دعوی) کے معنی ندا یا پکارنے کے ہیں۔ اس پر ائمہ لغت کا اجماع ہے
چنانچہ امام راغب نے اپنی مفردات میں تصریح کی ہے کہ "الدعاء کالنداء" یعنی دعا ندا کے معنی میں ہے
اسی طرح صراح میں بھی دعا بمعنی خواندن ہے، مدارک میں ندا اور دعا کا فرق وامتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا ہے :۔
النداء مایسمع والدعاء قد یسمع وقد لا یسمع۔ اس سے دعا وظیفہ لسانی قرار پاتی ہے۔ مجمع البحار میں
بتایا گیا ہے کہ الدعاء الغوث یعنی دعا فریاد کرنی اور دہائی مانگنی ہے اور بطور شہادت آیت ادعونی
استجب لکم پیش کی ہے اور اس کے معنی اس طرح کئے ہیں، ای استغیثوا اذا نزل بکم الضر
یعنی جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو مجھ سے فریاد رسی چاہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی وآخر
دعوٰھم ان الحمد للہ رب العالمین۔ دعا کے معنی پکار کے ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت سے
لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا۔ اگر یہاں دعا کے معنی عبادت کے لئے جائیں

---

[1] سو آپ خالص اعتقاد کرکے اللہ کی عبادت کرتے رہئے، یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔

(جیسا کہ بعض کا زعم ہے) تو لازم آتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے وحاشاھم عن ذلک۔

دعا شرع میں عبادت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس سے عجز عباد، اور قدرت رب العباد، کا اظہار ہوتا ہے، مانگنا، گڑگڑانا، عجز کا ظاہر کرنا لوازم عبودیت سے ہے، جس طرح عظمت وکبریا، ہیبت وقدرت، جلال واستغنا لوازم معبودیت سے ہیں۔ لوازم عبودیت ظاہر ہے کہ عبادت ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نیشاپوری نے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ کے ذیل میں خوب تصریح کردی ہے۔

"اعلم ان الدعاء مصدر دعوت ادعو، وقد تکون اسما تقول سمعت دعاء کما تقول سمعت صوتا، وحقیقۃ الدعاء استدعاء العبد ربہ جل جلالہ العنایۃ والاستمداد والمعونۃ، وقال جمہور العقلاء: ان الدعاء من اعظم مقامات العبودیۃ وانہ من شعائر الصالحین ودأب الانبیاء والمرسلین والقرآن ناطق بصحتہ عن الصدیقین والاحادیث مشحونۃ بالادعیۃ المأثورۃ بحیث لامساغ للانکار ولا مجال للعناد" (مطبوعہ ایران ۱۲۸۰ھ ج ۱ ص ۱۹۳)

"خلاصہ یہ کہ 'دعا' مصدر ہے اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے دعا کو سنا جس طرح کہ آواز کو سنا اور دعا کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اپنے رب سے استدعا کرتا ہے اور اس سے مدد ومعونت وعنایت کا خواستگار ہوتا ہے۔ جمہور عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دعا بلند ترین مقامات عبودیت سے ہے یہ صالحین کا شعار اور انبیاء ومرسلین کا طریقہ رہا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ وہ صدیقین سے ثابت ہے، اور احادیث ادعیہ ماثورہ سے بھری ہوئی ہیں، یہاں مجال انکار نہیں"

جب دعا عبادت ہے تو پھر غیر اللہ سے دعا کرنا شرک صریح قرار پائے گا لیکن قرآن کریم نے مخلوق سے مدد ومعونت اور استغاثہ اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ جب یہ ایسے امور میں کیا جائے، جو ان کی قدرت وقوت کے احاطہ میں ہوں۔ دیکھو قرآن میں اس اسرائیلی کا قصہ مذکور ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی قبطی کے خلاف استغاثہ کیا تھا فَاسْتَغَاثَہُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِہٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّہٖ[۱] (پ ۲۰ ع)

[۱] سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰؑ سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔

ی دوسری جگہ دین کے کاموں میں مدد چاہنی اور مدد دینی واجب قرار دی گئی ہے: وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ[۱] (پ ۶۶) اسی طرح نیکی اور تقویٰ میں استعانت کا حکم دیا گیا ہے، تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[۲] (پ ۵۶) جب مظلوم کسی ظالم کے خلاف حاکم کے پاس فریاد کرتا ہے، یا بیمار حکیم سے کہتا ہے کہ تم میرا علاج کرو یا کسی مقدمہ میں وکیل سے مدد لیجاتی ہے تو اس طرح کی استعانت واستغاثہ منع نہیں۔ اسباب دنیویہ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مامور بہ ہے یں بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب بالذات موثر نہیں حق تعالیٰ ہی ان میں اثر پیدا کرتے ہیں ب کوئی چیز اثر کرتی ہے تو حق تعالیٰ اس میں اثر پیدا کرتے ہیں، یہ عقیدہ باطل ہے کہ اشیاء کی وجود نی کے وقت ہی ان میں اثرات رکھ دئے گئے ہیں اور اسی راہ سے وہ اثر کرتی ہیں اور اب حق تعالیٰ حکم و امر کی حاجت نہیں، یا ان میں یہ قوت ہے کہ کبھی بھی اپنے آثار واحکام سے تخلف نہ کریں! دیکھو ب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو حق تعالیٰ نے آگ میں اثر احراق پیدا نہ کیا اور نہ جلے!

غرض آثارِ اشیاء حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور باران صفت اشیاء پر برستے رہتے ہیں۔ ی طرح مخلوق میں فعل کی جو قدرت ہوتی ہے وہ فعل کے وقت ہی عنایت ہوتی ہے اور اس سے فعل صدور ہوتا ہے، یہ نہیں کہ فعل کی قدرت پہلے ہی سے مخلوق میں موجود ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے افعال ادر ہے اور خالق کا محتاج نہیں، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ تمام مخلوقات وجود میں آنے کے بعد حق تعالیٰ ے مستغنی ہوں اور بے پرواہ، مستقل ہوں اور غیر محتاج، واللازم باطل فالملزوم مثلہ، ملا علی قاری رح نے رح فقہ اکبر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے:

ثم اعلم ان ارادۃ العبد التی تقارن	یعنی جان لینا چاہئے کہ بندہ کا ارادہ جو فعل کے ساتھ
فعلہ وقدرتہ علیہ حال صنعہ مخلوقتان	ہوتا ہے اور اس فعل کی قدرت وقت وقوع فعل
مع الفعل لا قبلہ ولا بعدہ[۳]	دونوں فعل کے ساتھ ہی مخلوق ہوتے ہیں نہ پہلے ہوتے ہیں نہ بعد

---

[۱] اگر وہ تم سے دین کے کام میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ مدد کرنا واجب ہے [۲] نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔ [۳] ص ۶۱ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۷ھ

یعنی ارادہ، قدرت اور فعل سب مخلوق الٰہی ہیں، یہی عقیدہ ہے اہل سنت وجماعت کا،
اور مبنی ہے اس آیتِ صریح پر، واللہ خلقکم وما تعملون (پ۲۳ ع ۶) نیز اس آیت پر ما تشاؤن الا
ان یشاء اللہ (پ۲۹ ع ۲۰) نیز لا قوۃ الا باللہ۔ پر

اس طرح عقیدہ کی تطہیر ہونے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مغیث
ہے اور نہ غیاث، نہ کوئی معین ہے اور نہ مستعان، ہماری ہر فریاد رسی علی الاطلاق حق تعالیٰ ہی سے ہے
دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو دق کیا کرتا تھا، حضرت ابوبکرؓ
نے فرمایا چلو حضرتؐ سے استغاثہ کریں۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ مجھ سے استغاثہ نہ کرنا چاہئے، استغاثہ تو اللہ ہی
سے کرتے ہیں (رواہ الطبرانی) اگر کسی غیر کے ہاتھ سے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو وہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت،
کیونکہ حقیقت اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی کا اسم مبارک غیاث ومغیث ہے۔ تاہم امور اختیاریہ میں
خلق سے استعانت جائز ہے مگر اسی عقیدہ کے ساتھ جس کا ابھی ذکر ہوا۔

جن امور میں سوا حق تعالیٰ کے کسی اور کو قدرت نہیں ان میں کسی اور کو پکارنا اور ان سے استغاثہ
کرنا، یا اعانت چاہنا حرام یا شرک ہے جیسے رزق کا دینا[۱]، مینہ کا برسانا[۲]، بیمار کو شفا بخشنا[۳]، ہدایت کرنا[۴]،
گناہ کا بخشنا[۵] وغیرہ۔ اب پہلے بعض ان آیات قرآنی پر بھی غور کر لو جن سے دعا کا عبادت ہونا صاف
ثابت ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض۔ [۲] وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ۔ [۳] واذا مرضت فھو یشفین۔ [۴] انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء۔ [۵] ومن یغفر الذنوب الا اللہ۔

تاریخ کے دورِ آغاز میں مختلف آرین قومیں

از جناب میجر خواجہ عبدالرشید صاحب آئی۔ایم۔ایس

ہم نے گذشتہ تین مقالوں میں تاریخِ قدیم کے چند اہم پہلوؤں پر گفتگو کی تھی۔ اور اس دوران میں دجلہ و فرات کی تہذیبوں اور وادی سندھ کی تہذیب کا بھی ذکر کیا تھا۔ اب کچھ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی تین مقالوں کے ان تاریخی پہلوؤں کی تھوڑی سی اور تفصیل کر دی جائے، تاکہ مختلف اقوام جو وقتاً فوقتاً ادھر آ آکر بستی رہیں ان کا ذکر بھی ہو جائے۔

اس تفصیل سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصری فہرست دیدی جائے جس میں وہ تمام اقوام آجائیں جن کا ہم ابھی ذکر کریں گے، تاکہ قارئین کرام ان ناموں سے مانوس ہو جائیں یہ اقوام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سومیری Summerians

۲۔ آکادی Akkadians

۳۔ میتانی Mitanis

۴۔ حتّی Hittites

۵۔ آشوری Assyrians.

۶۔ عیلامی Elamites

۷۔ مادی Medians

اور ۸۔ صوبیری Subereans.

ان میں سے کچھ اقوام کا نام تو اکثر سنا گیا ہوگا اور کچھ ان میں سے ایسی ہیں جن کے متعلق بہت کم معلوم

ہو سکا ہے۔ ہم مختصر طور پر ان کی تاریخ بیان کریں گے اور بعض اقوام کے تعلقات بھی بیان کریں گے
دوسری اقوام و ممالک کے ساتھ جہاں تک وہ تعلقات تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ لَعَلَّ اللّٰہَ
یُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِکَ اَمْرًا۔

سومیری | ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ غیر سامی ہیں اور آرین تھے۔ دجلہ و فرات کی وادی میں سب سے پہلے
تہذیب کا پرچم انھوں ہی نے لہرایا۔ ان کو سومیری محض ان کی زبان پر کہا جاتا ہے، کیونکہ جب کتبات
خط میخی حل ہوئے تو ماہرین نے اس زبان کو سومیری زبان کہہ کر پکارا (Summerian Language)
اس وقت تک اس قدر ثابت ہو چکا تھا کہ یہ لوگ غیر سامی یعنی (Non-Sematic) ہیں۔ یہ علاقہ
بابل کے جنوبی حصے کے باشندے تھے اور اس علاقے کو مات شمری (Mat Shumri) کہا جاتا تھا
یہ آرین کا سب سے پہلا گروہ تھا جو ایران و عراق میں آیا اور میڈیا، اناطولیا اور آشور سے ہوتا ہوا بابل
کے جنوب میں مات شمری پر پہنچ کر آباد ہو گیا۔ انہی میں سے کچھ گروہ میڈیا اور اناطولیا اور آشور میں بھی
بس گئے۔ جنھوں نے بہت بعد میں ترقی کی اور ان کی تاریخ کا اب بوغاز کوئی (Bogaz Kui)
سے پتہ چل رہا ہے۔ تو گویا یہ اولین گروہ تھا آرین کا جو ہلالِ خصیب میں پہنچا اور اسی گروہ کے
کچھ لوگ تھے جو وادیِ سندھ میں بھی پہنچے۔

آکادی | (Akkadians) ان کے متعلق ماہرین آثار قدیمہ اور مستشرقین ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں
کر سکے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ یہ سامی یعنی (Semetic) تھے اور کچھ کہتے ہیں یہ ایک مخلوط قوم تھی، ہمارا
ذاتی خیال ہے کہ یہ غیر سامی یعنی (Non-Semetic) تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ آرین تھے اور یہ
انہی سومیری اقوام میں سے تھے جو کچھ عرصہ ان سے پہلے اس علاقہ سے ہو کر جنوب کی طرف بڑھ چکی
تھیں۔ جس علاقہ میں یہ قوم آباد تھی اس کو مات آکادی کہا گیا ہے (Mat Akkadi) اور یہ تقریباً
ہلالِ خصیب کا وسط بنتا ہے، یا یوں کہہ لیجئے دجلہ و فرات کی وادی کا شمالی حصہ۔

ان اقوام کی اصل کے متعلق مختلف خیالات ہیں۔ مگر یہ سب نظریے ہیں اور ماہرین کے
ذاتی فکر کا نتیجہ۔ ہم ایک بات ضرور جانتے ہیں اور وہ یہ کہ ان تمام اقوام کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔

کان الناس امۃ واحدۃ — ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ ایک ہی قوم اور جماعت تھے۔

گردشِ اقوام ایک عرصۂ طویل سے جاری تھی، ہمارے پاس اس گردش کا مکمل پروگرام
جود نہیں اور نہ عقل و فہم اس عرصہ کا اندازہ لگا سکتی ہے، ہم جتنے عرصہ سے ان اقوام کا ذکر
نتے ہیں یہی سمجھتے ہیں کہ یہ اقوام مختلف النسل تھیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ البتہ جہانتک تاریخ و قرآن کریم
یں پتہ دیتے ہیں۔ اتنا ضرور علم ہے کہ ہلالِ خصیب زمانۂ قدیم سے ایک مستقل مملکت تھی جس میں دو
وم آباد تھے۔ قرآن نے ان کا نام عاد اور ثمود دیا ہے۔ قومِ ثمود ہلالِ خصیب کے اس حصہ میں آباد
جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے اور وادی القریٰ تک چلا گیا ہے مگر ایک زمانہ میں اس
قہ کا پھیلاؤ بابل کے جنوب سے ہوتا ہوا شہر اور تک پہنچا تھا۔ دوسرا علاقہ جس میں قوم عاد
د تھی اس کو ارام کہا گیا ہے۔

دراصل ارام، عاد کے دادا کا نام تھا اور اسی نام کے ساتھ یہ علاقہ بھی منسوب کردیا گیا۔
لاقہ ہلالِ خصیب کا شمال اور شمال مغرب ہے اور اس کے حدود اربعہ تقریباً وہی ہیں جو مات
ی کے تھے۔ ایک اور نظریہ یہ بتاتا ہے ارام ایک قدیم شہر تھا یا ایک ملک تھا جہاں کے باشندے
کہلاتے تھے۔ اگر نقشہ کو بغور دیکھا جائے تو یہ علاقہ جہاں عاد اور ثمود آباد تھے وہی علاقہ ہے
کو ہم نے ہلالِ خصیب کہا ہے اور یہ اقوام جن کا نام عاد اور ثمود ہے آکادی اور سومیری ہی ہیں۔
ن کتبات خطِ میخی کے حل کے وقت ان الفاظ میں نقل واقع ہوگئی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔
اقوام کی تہذیب کا جو ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے وہ یقینی ہی معلوم ہوتا ہے جو دریافت کیا جاچکا ہے،
ایک جملہ معترضہ تھا۔

سڈنی سمتھ (Sidney Smith) اپنی مشہور تاریخ Early History of Assyria
لکھتے ہیں کہ سنہ ۲۷۰۰ سنہ ۳۵۰۰ قبل مسیح کے درمیان مملکتِ بابل میں ایک متجانس تہذیب موجود تھی
کا ثبوت ہمیں مقام کیش (Kish) میں ملا ہے اور جو لوگ اس وقت یہاں آباد تھے ان کی زبان

سومیری زبان کے کتبات سے بہت مشابہ ہے۔ جس تہذیب کو در حقیقت وہ ایک مخلوط تہذیب
کرتے ہیں وہ دراصل مخلوط نہ تھی۔ بلکہ یہ عرصہ ایک عارضی کشمکش کا تھا اور اس دوران میں
شمال کی طرف سے دیگر اقوام حملہ آور ہوتی رہیں اور ایک کی تہذیب نے دوسری پر اثر کیا اور
چونکہ اس وقت تہذیب کا مرکز تھا زیادہ اثر وہیں ہوا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہاں
تہذیبیں مل جل گئی تھیں۔ کیش کے گرد و نواح میں یہ چیز بالکل واضح نہیں ہے اور نہ ہی علاقہ
کے کسی اور خطے میں ایسا ثبوت ملا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ وادئ سندھ سے جو مہریں (دگ
برآمد ہوئی ہیں، ان پر بھی وہی زبان لکھی ہوئی ہے جس کو سومیری کہا گیا ہے اگرچہ اس میں خ
فرق ہے جس کی بنا پر سڈنی سمتھ بابل کی تہذیب کو ایک مخلوط تہذیب بتاتے ہیں۔ وادی سندھ
کو بھی اگر اس ثبوت کی بنا پر ایک مخلوط تہذیب مان لیا جائے تو وہ بھی پھر ایک عارضی چیز تھی
کہ سومیری سندھ میں پہنچے اور دراوڑن سے ساتھ ان کی مڈ بھیڑ ہوئی! اس کے کچھ عرصہ بعد
کی شکل بدل چکی تھی۔

میتانی | (mitanis) ان کا ذکر ہم نے کچھ تفصیل کے ساتھ اپنے پچھلے تین مقالوں میں
تاریخی لحاظ سے یہ قوم بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مختلف شاخوں اور اس کے بادشا
نہ صرف نام و نسب بلکہ قریبی ممالک سے جو تعلقات ثابت ہو چکے ہیں وہ بہت دلچسپ اور
ہم نے بیشتر بتایا ہے کہ اس قوم کو ہوری کا لقب بھی دیا گیا ہے اور ان کا تعلق ہم نے ہور۔ کرد
اور بلوچ سے ثابت کیا تھا اور ملک طاؤس والے مقالے میں ہم نے ان کو کورو بھی بتایا
اب ان کے ایک بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام خط میخی کے کتبوں سے دسرتھ (...ratha
حل ہو چکا ہے۔ اس کی ایک بہت دلچسپ خط و کتابت فرعون مصر امینوفس سوم (...nophus III
کے ساتھ اب تک برٹش میوزم میں محفوظ ہے۔ یہ خط و کتابت میتانی زبان میں ہوتی رہی۔ اس
کا زمانہ مورخین کے بیان کے مطابق ۱۳۲۷ء سے ۱۳۹۷ء قبل مسیح تک ہے۔ یہ قریب قریب صحیح
ہوتا ہے۔ اس میتانی قوم کو ہم نے آرین ثابت کیا تھا۔ ماہرین اثریات و مستشرقین ان

(Indo Irani) کہتے ہیں۔ یہ بادشاہ اپنے ذاتی عقیدہ کے مطابق آفتاب پرست تھا اور سلسلۂ نسب اکشواکو (Ikshwaku) کے خاندان سے ملاتا ہے۔ وہ اس خاندان کا سولہواں تھا۔ اس کو مُورُو (Muru) کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ شمالی شام سومیری باشندہ تھا۔

ہمارے اس بیان میں اور پچھلے بیان میں کہ سومیری قوم بابل کے جنوب میں آباد تھی۔ کسی قدر تضاد ظاہر ہوتا ہے مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ سومیری قوم درحقیقت ایک زمانے میں شام خصیب پر قابض تھی اور بالآخر یہ بابل کے جنوب میں آکر جمع ہو گئی۔ اس کے کچھ لوگ ہلالِ خصیب کے مختلف حصوں میں آباد رہے اور یہ بادشاہ دسرتھ بھی انھیں میں سے تھا۔ یہ شمالی شام کا علاقہ حقیقت بعد میں میتانیوں کا علاقہ بنا۔

رامائن (Ramayana) میں راجہ دسرتھ اور اس کے بیٹے رام چندر کا ذکر ہم نے پڑھا ہے۔ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی راجہ دسرتھ ہوں! تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس بادشاہ دسرتھ کا ایک بیٹا تھا جس کو امرسین کہا جاتا ہے۔ امرسین (Amar Sin) کا مطلب ہے "چاندوالا امر" (Amar of the moon) رامائن والے رام چندر جو راجہ دسرتھ کی بیوی کوشلیا کے بطن سے تھے۔ ان کے نام کے معانی بھی یہی ہیں یعنی "چاندوالا رام" Rama of the moon اصل کلمہ کی رو سے بہت ممکن ہے کہ امر (Amar) کا لفظ رام (Rama) بن گیا ہو۔ حروف کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ ان کی ترکیب میں فرق پڑ گیا ہے۔

بادشاہ دسرتھ کی جو خط وکتابت فرعون مصر سے ہوئی تو وہ ایک شادی کے سلسلے میں تھی۔ اور تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اس بادشاہ کی ایک لڑکی فرعونِ مصر آخنیطون (Akhnaton) سے بیاہی گئی۔ یہ فرعون مصر آمینوفس سوئم (Amenophus III) کا بیٹا تھا اور اس کی والدہ بھی میتانی خاندان ہی سے تھی۔ اس ملکہ کا نام ملکہ طی (Tiy) تھا۔ آخنیطون کے دادا تھوتموسس چہارم (Thutmosis IV) نے ایک میتانی بادشاہ کی طرف خط لکھا۔ اور اس کی لڑکی اپنے لڑکے

کے لئے مانگی۔ جو بعد میں اس لڑکے آخنیطون کی والدہ بنی۔ اسی طرح آخنیطون کے والد کو بھی معلوم تھا کہ بادشاہ دسرتھ کی ایک حسین لڑکی ہے۔ چنانچہ اس نے بادشاہ دسرتھ کو لکھا۔ یہ تمام خط و کتابت اس وقت برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس خط و کتابت کا ذکر مسٹر ایل۔ ڈبلیو۔ کنگ (L. W. King) اپنی مشہور تصنیف میں کرتے ہیں۔ History of Babylon ص ۲۲۱ و ۲۲۴۔ اور پھر اسی خط و کتابت کا ذکر ہم آرتھر ویگل (Arthur Weigall.) سے بھی ان کی کتاب The Life and Times of Akenaton میں سنتے ہیں۔ اس خط و کتابت کا ذکر انھوں نے خاص طور پر ص ۴۸ پر اس شادی کے سلسلہ میں کیا ہے۔

آخنیطون مصری فرعونوں کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس لئے کہ یہ توحید کا قائل تھا۔ اور اس نے بت پرستی اور بت تراشی بالکل ممنوع قرار دے رکھی تھی۔ یہ وہی فرعون ہے جس کی شادی بعد میں ملکہ نفرٹائٹ (Neffertite.) سے ہوئی۔

حیرت کا مقام ہے کہ جس وقت یہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی اور اس نے فوراً ہی اپنے مذہب میں ترمیم شروع کر دی۔ اس پرانے مذہب کی رو سے آمن را (Amon Ra) جو دیوتا تھا اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ آرتھر ویگل۔ اس نوجوان بادشاہِ مصر کے متعلق لکھتا ہے۔

> "اس نوجوان بادشاہ نے یہ اعلان کر دیا کہ خدا کو ایک ناقابلِ زوال حقیقت ہونا چاہئے۔ نیز یہ ضروری ہے کہ وہ انتہا درجہ ذہین اور سمجھدار ہو۔ اور زمان و مکان میں ساری ہو۔ اس نے کہا کہ اوٹین (Aton) تقریباً ایسا ہی خدا ہے جیسا کہ ہم اسے تصور کرتے ہیں۔ یہ بادشاہ Aton کی طرف جو صفات منسوب کرتا تھا ان میں سے کوئی صفت ایسی نہیں ہے جن کو ہم خدا کی طرف منسوب نہ کرتے ہوں۔

ہماری تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ اس نوجوان فرعون کے ذہن پر دو اثر بہت شدت سے پڑے ایک اس کی والدہ کا اور دوسرے اس کی بیوی کا۔ اور یہ دونوں یونانی خاندان سے

تھیں۔ میتانی آرین تھے۔ اور جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں کہ آرین کا بھی خالص مذہب وحدانیت ہی تھا۔ اگرچہ مختلف گروہوں میں مختلف مقامات پر اس عقیدہ کے اندر انحراف پیدا ہو چکا تھا۔ تاہم ہر زمانے میں ضرور کچھ ایسے آرین ہوتے تھے جو اصل مذہب کے پیرو ہوتے تھے۔ انہی لوگوں سے یعنی اپنی والدہ اور بیوی سے آخنیطون نے توحید کا سبق سیکھا۔ عورت مرد کی نسبت زیادہ مذہبی احساس رکھتی ہے اور چونکہ بچے پر اولین اثر جو اس کے گھر میں ہوتا ہے وہ والدہ ہی کا ہوتا ہے لہذا قرین قیاس ہے کہ آخنیطون نے اپنی والدہ کے خیالات کی طرف رجوع کیا ہوگا۔ اور پھر جب بعد میں ایسا ہی ایک عقیدہ رکھنے والی سے وہ بیاہا گیا تو اس کا یقین وایمان بھی پختہ ہوگیا۔ اور پھر جب وہ تخت پر بیٹھا تو اپنے کو خود مختار پاتے ہوئے اس نے توحید کا اعلان کیا۔

ہم یہ اس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں جبکہ میتانیوں اور حتی (Hittites) کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اسی جنگ کے دوران میں آخنیطون کی شادی شہزادی میتان کے ساتھ ہوئی۔

حتی (Hittites) یہ بھی آرین کے اولین گروہ کا باقی ماندہ حصہ تھا۔ جو اناطولیا میں بس گیا تھا جیسا کہ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ یہ اناطولیہ کے باشندے تھے، تو یہ غلط ہے تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ یہ آرین گروہ جس کو حتی کہا جاتا ہے اس کے آنے سے بیشتر وہاں ایک اور قوم موجود تھی۔ مگر ان باشندوں کو اناطولیا سے حتی لوگوں نے مار بھگایا۔

Sir Percy Sykes اپنی کتاب (History of Persia) میں فرماتے ہیں کہ جو کتبات ہمیں حال ہی میں بوغاز کوئی (Boghaz Kui) میں دستیاب ہوئے ہیں اور (Ptera) میں تو کچھ ان میں ہمیں ایسے عہدنامے بھی ملتے ہیں جو حتی اور میتانیوں کے مابین ہوئے۔ ہماری نظر میں یہ عہدنامے وہی ہیں جو اس جنگ کے بعد ہوئے جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔

وقت گذرتا گیا اور یہ اقوام آپس میں جذب ہونا شروع ہوگئیں۔ تاوقتیکہ ان علاقوں میں فقط ایک حکومت رہ گئی۔ اور ایک قوم بن گئی جس کو ماہرین آثار قدیمہ

آشوری

(Assyrians.) کہتے ہیں۔ یہ قوم بھی آرین ہی تھی اور آشور دیوتا کی پرستش کرنے کی وجہ سے ان کو آشوری کہا جاتا ہے۔ اس مملکت کا اولین دارالخلافہ آشور تھا جس کو آجکل قلعہ شرقت کہا جاتا ہے۔ جب ماہرین آثریات نے اس کی کھدائی شروع کی تو یہ بالکل جلا ہوا نکلا۔ لفظ آشور کے مطلب کے متعلق ... L. W. King کی ایک بہت دلچسپ تحقیق بیان کردینا نامناسب نہ ہوگا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب "رحمٰن" ہے۔ ہمارا ذاتی فکر یہ ہے کہ یہ لفظ آشور سومیری زبان کے ایک لفظ آ۔اُسار (A-Usar) سے بنا ہے جس کے معانی بھی ایک ذات واحد یا "رب" کے لئے جا سکتے ہیں۔ اور غالباً ہندوؤں کے بھی جو دیوتا آشور ہیں وہ اسی مفہوم کی صدائے بازگشت ہیں۔ مگر ان ہندو دیوتاؤں کے متعلق ایک اور بات بھی دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ مہابھارت کی جنگ سے پیشتر انہی آشور دیوتا کا مطلب اچھے معنوں میں لیا جاتا تھا مگر مہابھارت کی جنگ کے بعد یہ لفظ اچھے معنوں کی جگہ برے معنوں میں یعنی بجائے فرشتوں کے شیاطین کے معنی میں مستعمل ہونے لگا۔

نیز زردشتیوں کے آہورمزد کی طرف بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ آہور اور آشور ہم معنی لفظ ہیں۔ تو گویا آہور اور آشور کے معنی "رب" کے معنوں کے لگ بھگ ہوا کرتے تھے مگر وقت نے ان کی اصلیت کو معدوم کر دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام اسی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اور ان کو آشوری دارالخلافہ نینوا (Ninevah.) کی طرف جانے کا حکم ملا تھا۔ اسی مقام پر ان کی وفات ہوئی اور نینوا کے قریب ہی ان کا مزار اس وقت موجود ہے۔ سارگون دوئم (Sargon II) کے زمانے میں آشوری حکومت کا دارالخلافہ خورسس آباد (Khorasabad) بن چکا تھا۔ خورسس آباد موصل سے قریباً ۱۷ میل عین شمال کی طرف ہے۔

اس مقام پر ماہرین آثارِ قدیمہ نے بہت کام کیا ہے اور یہاں سے بہت کچھ تاریخی مواد حاصل ہو چکا ہے۔ ہمیں بھی یہاں سے ایک اینٹ جس پر سارگون دوئم کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ملی۔ اسوقت وہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس اینٹ کا وزن تقریباً ۲۰ سیر ہے اور اس کی شکل ایک مربع کی مانند ہے جس کی ایک طرف تقریباً ۱۴۔ انچ ہے اور اس کی موٹائی تین انچ ہے۔ یہ اینٹ دھوپ میں پکائی ہوئی ہے (Sun Baked.) اور اس کا رنگ پیلاہٹ پر ہے۔

الغرض آرین، ایران سے ہوتے ہوئے اناطولیا میں پہنچے اور وہاں سے آشور (Assyria) ہوتے ہوئے آکاد اور آکادے سومر پہنچے۔ یہ آرین کے اولین گروہ تھے جو سومر میں پہنچتے ہی سومیری کہلائے۔ ان کے بعد جو جو گروہ ان علاقوں میں آکر آباد ہوتا رہا، یا تو اپنے اعتقادات کی وجہ سے وہ مشہور ہوا یا اپنے ملک کے نام پر منسوب کیا گیا۔

عیلام | Elam. یہ لفظ ہمیں سب سے پہلے خورس آباد سے برآمد شدہ کتبوں میں ملتا ہے اس کے معنی ہیں "پہاڑی" (Mountainous.) یہ اس علاقہ کا نام تھا جو آجکل وسطِ ایران کی سطح مرتفع سے بنتا ہے۔ اور یہاں کا دار الخلافہ شوش (Susa) تھا یہاں کے باشندوں کو عیلامی کہا جا سکتا ہے یعنی Elamites یہ بھی ایک آرین ہی کا گروہ تھا۔ اس قوم نے کچھ عرصہ تک حکومت کی جو بابل کے تیسرے خاندان کے ہم عصر تھی۔ بابلیوں نے اس ملک پر بہت دھاوے بولے اور بالآخر اس کو فتح بھی کر لیا۔ علامیوں نے اپنا ایک علیحدہ رسم الخط بھی ایجاد کر رکھا تھا۔ اس قوم کا ذکر انجیل میں اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ عیلام کا ملک مکمل طور پر حمورابی..... Hammurabi نے ۲۲۳۰ قبل مسیح میں فتح کر لیا تھا۔ حمورابی ایک سومیری شاہنشاہ تھا جو اپنے مذہبی قوانین کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ درحقیقت اس کی شخصیت کے متعلق بھی بہت سے شکوک موجود ہیں کہ یہ کون تھا۔ اگرچہ اس کے ثابت ہو جانے کے بعد بھی ہمارے نزدیک کچھ تاریخی علم میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔

اس علاقہ عیلام کے شمال میں کوہستان ذاگرس (Zagros.) ہے۔ ان پہاڑی

سلسلوں پر ایک اور قوم بھی آباد تھی جس کا نام ہم نے فہرست میں درج نہیں کیا۔ ان کو کاشی یا (Kassites) کہا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ قوم مادا یعنی میڈیا کی رہنے والی تھی۔ اور آرین النسل تھے۔ ہم نے میڈیا کو ملکِ طاؤس والے مقالے میں مدھ دیس یا کوروا ستھان لکھا تھا۔ ۔ ۔ ۔
L. A. Waddell اسی علاقے کو کورلینڈ (Kurland) کہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ آرین جو اول ہندوستان میں پہنچے وہ عیلام کے علاقے سے گئے تھے۔ ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے اور ہم اسکی وجہ ہلالِ خصیب اور وادیٔ سندھ والے مقالے میں بتا چکے ہیں۔

Sir Percy Sykes اپنی کتاب History of Persia Vol I میں لکھتے ہیں کہ میڈیا کے لوگ جب اول اول ایران پہنچے تو یہ جنوبی روس کی طرف سے آئے اور ان کی آمد کے وقت ارارات میں ایک حکومت موجود تھی جس کا رعب ان پر اس قدر جما کہ یہ بغیر مڈبھیڑ کئے وسطِ ایران کو بڑھ آئے۔ مگر ہمیں اس زمانہ کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس وقت آرین کا ایک اور گروہ مشرقی ایران کی طرف بھی بڑھ رہا تھا اور یہ گروہ خراساں کی طرف سے داخل ہوا تھا۔ اس نے اول کرمان کو فتح کیا اور فارس تک جا پہنچا۔ اس وقت وادی زندہ رود میڈین (Median) اقوام کے قبضے میں تھی۔ اور ان کا تسلط خلیج فارس تک تھا۔ اس نقل و حرکت کا زمانہ ہماری دانست میں ۲۵۰۰ سنہ قبلِ مسیح ہے۔ مگر ڈی مورگن (De Morgan) فرماتے ہیں کہ جب یہ نقل و حرکت شروع ہوئی تو وہ زمانہ تقریباً ۲۰۰۰ سال ق م کا تھا۔ بہرحال ان کا زمانہ خواہ کچھ ہی ہو، یہ آرین کے اولین گروہوں سے بہت بعد میں آئے۔

ابھی ہم نے ویڈیل صاحب کے کورلینڈ (Kurland) کا ذکر کیا ہے۔ سومیری زبان میں بھی ایک لفظ ملتا ہے جس کو کور (Kur) کہا جاتا ہے اور جس کے معانی ہیں "پہاڑی" یعنی Mountanions. بعینہٖ وہی معنی ہوئے جو ہم نے عیلام کے بتلائے ہیں۔ سومیری اس لفظ کو مشرقی مادا (Media) کے لئے استعمال کرتے تھے۔ عبرانی زبان میں بھی اس قسم کا ایک لفظ موجود ہے جس کا تلفظ ہے کور (Kore.) اس کا مطلب ہے "حفاظت کرنے والا" یا

(Kore.) کور درحقیقت عبرانی زبان میں کہتے ہیں One who Defends a pla-
...یشہ" کو (Place.)

ہمارا اس تمام بحث سے مقصد یہ تھا کہ مادا، میڈیا، مدھ دیس، کورلینڈ۔ کوروا ستھان
...ر آج کل کا کردستان سب ایک ہی علاقے کے نام ہیں جو مختلف وقتوں اور حکومتوں
...ے زیر اثر بدلتے رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

...ی یا میڈین | .Medians یہ لوگ مادہ یعنی میڈیا کے باشندے تھے۔ میڈیا مادہ کا یونانی
...فظ ہے۔ عرب مورخوں نے اسے ماہات کہا ہے۔ ابوالکلام ترجمان القرآن ج دوم ص ۲۰۴ پر
...لکھتے ہیں۔

"حضرت مسیح سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمالِ مغربی میڈیا۔ چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہاء عروج تک پہنچ چکی تھیں، اس لئے قدرتی طور پر یہ ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امراء تھے جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔ ۶۱۲ء قبلِ مسیح میں جب نینوی تباہ ہوگیا اور آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تو میڈیا کے باشندے آزاد ہوگئے اور بتدریج ایک قومی حکومت نشوونما پانے لگی۔"

مندرجہ بالا بیان اس وقت کا ہے جب میڈیا کی ایک تہذیب ابھر رہی تھی۔ اس
...نے سے پیشتر بھی اس علاقے میں اقوام موجود تھیں مگر وہاں کوئی تہذیب نہ تھی۔ اگر اس علاقہ
...محض ایک اردگ یعنی (Camping Ground) کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ تقریباً تمام آرین گروہ
...ں سے ہوتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پہنچے۔ مگر اس علاقے
...ان کا مستقل قیام ہرگز نہیں ہوا تا وقتیکہ ذوالقرنین نے اسے فتح کر کے ایک مستقل حکومت
...قائم کردی۔

صوبیری. Subereans - ان کے متعلق ہمیں بہت کم معلوم ہے۔ ہم ان کا ذکر صرف اس واسطے کر رہے ہیں کہ ان کا تعلق یتانیوں سے ہے۔ مورخین کہتے ہیں کہ یتانیوں کے کچھ گروہ بعد میں صوبیری کہلانے لگ گئے تھے۔ گویا یتانی، ہوری کہلانے سے پیشتر صوبیری کہلائے اور بعد میں ہوری۔ ماہرین آثارِ قدیمہ نے ایک قدیم زبان کا بھی پتہ چلایا ہے جو یتانی زبان سے مختلف ہے اور اس کا نام انھوں نے صوبیری زبان رکھدیا ہے۔

اوپر ہم نے کچھ اقوام کا ذکر کر دیا ہے جو اولین گروہِ آرین سے پیدا ہوئیں اور جنھوں نے مختلف وقتوں پر اپنی ایک مخصوص تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند ایک اور مقامات کی تفصیل کر دی جائے جن کا ذکر ہم پیچھے کر آئے ہیں۔ جو بات غور طلب ہے وہ فقط اتنی ہے کہ جس ترتیب سے ہم نے مذکورہ بالا فہرست اقوام بنائی ہے اس کو کیا اسی طرح رہنے دیا جائے؟

جو بات ترمیم کے قابل ہے وہ درحقیقت اتنی ہی ہے کہ یہ سب اقوام ایک ہی نسل کی تھیں اور مختلف وقتوں پر مختلف جانب حرکت کرتی رہیں اور جوں جوں ترقی کرتی گئیں۔ ایک تہذیب کی بنیاد رکھتی گئیں۔ یہ بات کہ ان کے ہلالِ خصیب میں وارد ہونے سے پہلے یہاں کے باشندے کون تھے تو اس میں کیا اشکال ہے؟ آرین کے قطب شمالی سے چلے آنے کے بعد یا وسطِ ایشیا سے حرکت کرنے کے بعد وہاں پھر کون موجود تھا؟ بات صرف اتنی ہے کہ اگر ہم اقوام کی نقل و حرکت کے ساتھ ساتھ موسموں کا تغیر بھی زیرِ نگاہ رکھیں تو پھر اس مسئلہ میں کوئی اتنی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ یہ حالت دنیا کے ہر خطہ کی رہی ہے تاوقتیکہ وہ خطہ قابلِ رہائش نہ ہو گیا ہو۔ دنیا میں اب بھی بے شمار ایسے حصے ہیں جہاں کوئی آباد نہیں! تو پھر ہلالِ خصیب کے متعلق تعجب کیوں ہو؟ اسی طرح جب ہلالِ خصیب آہستہ آہستہ بیابان بننے لگا تو یہ گروہ ایک ایک کر کے مختلف ممالک میں ہجرت کرنے لگے۔ چنانچہ ہندوستان اور مصر میں بھی پہنچے۔ کچھ گروہ ان کے ہلالِ خصیب میں آنے سے پیشتر ہی روس سے ہوتے ہوئے یورپ میں پہنچ چکے تھے۔ آج کل ان ممالک میں کچھ بھی نہیں رکھا

جہاں کبھی دنیا کی سب سے بڑی تہذیبیں موجود تھیں۔ بغداد اور مصیب کو عراقیوں نے بابل کی اینٹوں سے تعمیر کیا! آشور اور نمرود کی اینٹیں نینوا اور موصل میں استعمال ہوئیں۔ غرضیکہ یہ تمام علاقے قابل رہائش نہ رہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کی خواہ کچھ ہی وجوہ بیان کرتے ہوں، ہم تو لکھ چکے ہیں کہ اس کی محض ایک وجہ تھی اور وہ قہر الٰہی تھا جس نے ان آبادیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

وَحَرامٌ علیٰ قریۃٍ اھلکنٰھا انّھم لا یرجعُون ؕ

اور یہ جو موسموں کا تغیر ہے تو یہ ایک قدرتی امر ہے جس کا تعلق قہر الٰہی سے مطلقاً نہیں قدرت کا قانون یہی ہے کہ موسموں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ بابل کی تاریخ میں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ملکہ سیمرامیز (Semirames.) نے الجنائن المعلقہ بنوائے تھے اور ایک اب یہ بھی ہے کہ وہاں سوائے ریت اور کھجوروں کے درخت کے کچھ نظر نہیں آتا۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبیں جہاں موجود تھیں وہ علاقے بھی ریگستان بن چکے ہیں اور رہائش کے قابل نہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ قوموں کے دن پھیرتا رہتا ہے اسی طرح موسم اور مقامات کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔

ویڈیل صاحب اپنی مشہور کتاب میں جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے فرماتے ہیں کہ دیگر اقوام کی نقل و حرکت کے ساتھ حتی (Hittites.) جب ہندوستان پہنچے تو وہ وادی گنگا میں وارد ہوئے اور یہ ختی (Khatti) جن کو ہم نے حتی (Hittites.) کہا ہے ہندوستان میں آکر کھشتری (Kashatriya) بن گئے۔ یہ واقعہ ۳۰۰۰ قبل مسیح کا ہے۔ ہمیں اس تحقیق سے اتفاق نہیں ہے کھشتری (Kashatriya) حتی لوگ نہیں تھے، بلکہ ایک اور گروہ تھا آرین کا جس کا ہم نے مختصر سا ذکر اوپر کیا ہے اور جن کو ہم نے کاشی (Kassites.) لکھا ہے انھوں نے ہندوستان میں آکر کھشتریوں (Kashatriya) کی بنیاد رکھی۔ یہ واقعہ تقریباً ۱۲۰۰ قبل مسیح کا ہے۔ ان کی آمد سے بہت پیشتر آرین تہذیب ہندوستان پہنچ چکی تھی۔ ہمارا اپنا یہ نظریہ ہے کہ ہندوؤں میں جو مختلف ذاتیں اسوقت موجود ہیں یہ تمام ہندوستان میں ہی آکر بنیں، ہندوستان میں آنے سے پیشتر ان کی کوئی تقسیم موجود

نہ تھی۔ البتہ حمورابی کے قوانین سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بابل میں دو قسم کے لوگ موجود تھے، ایک تو سپاہی پیشہ اور دوسرے تجارتی لوگ، مگر ان کو کسی خاص نام سے منسوب نہیں کیا گیا۔ برہمن کا تخیل تمامتر ہندی ہے۔ زیادہ اس لیے کہ اس کا تعلق ہندوؤں کی تثلیث سے ہے۔ برہما تثلیث کا ایک جزو ہے۔ اور یہ برہمن اسی برہما کی اولاد ملنے جاتے ہیں۔ مختصر طور پر ان کی تاریخ یوں ہے۔ برہما کے سر میں سے سات رشی پیدا ہوئے۔ (ان سات رشیوں میں سے دو رشی کشتری تھے) بہر حال ان دو کو جنجو پہنا کر برہمن کیا گیا! ان سات رشیوں کی اولاد کو برہمن کہا جاتا ہے۔ ان رشیوں کے مر جانے کے بعد یہ مشہور کر دیا گیا کہ یہ آسمانوں پر چلے گئے ہیں اور یہ جو سات ستارے ہم دیکھتے ہیں جن کو انگریزی میں (Great Bear) کہا جاتا ہے اور جس کی مدد سے قطبی ستارے کی سمت معلوم کی جاتی ہے وہی سات رشی ہیں جو برہما سے پیدا ہوئے غالباً ان کی پیدائش برہما کے سر سے اس لئے کہی جاتی ہے کیونکہ سر انسان کا ایک بزرگتر حصہ ہے!

یہ جو حمورابی (Hammurabi) کا ذکر ہم نے ابھی اوپر دو تین مقامات پر کیا ہے تو یہ ایک سومیری بادشاہ تھا۔ اس کا وقت تقریباً ۲۱۲۳ئہ قبل مسیح ہے۔ اس نے ۴۳ سال حکومت کی اور اپنے قوانین بنائے۔ ان قوانین کو دنیا کے بڑے بڑے قوانین میں سے سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کے آخری حصے میں ان قوانین کو اس نے مرتب کیا۔ یہ بات ہمیں ان قوانین کے دیباچہ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس وقت اس نے آشور اور نینوا کو بھی فتح کیا تھا۔ اور یہ شہر اس کی حکومت کے چالیسویں سال میں فتح ہوئے تھے۔

L. W. King. ان قوانین کے مرتب ہونے کا وقت ۲۰۸۱ئہ یا ۲۰۸۰ئہ قبل مسیح میں یقین کرتا ہے۔ ان قوانین کا اب ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض مستشرقین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تورات انہی قوانین کی نقل ہے! حضرت موسیٰ علیہ السلام حمورابی سے تقریباً پانصد سال بعد پیدا ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو ان قوانین کا علم ہو۔ مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انھوں نے انہی قوانین کو نقل کیا ہے؟ بہت ممکن ہے کہ حمورابی چونکہ خود ایک بہت پارسا اور عبادت گزار بادشاہ تھا اور اس کی سلطنت میں

بہت امن و امان رہا، یہ خود بھی کوئی ایک نبی ہو اور اس پر وحی کے ذریعے قوانین اترے ہوں جن کو اس نے خطِ میخی میں لکھوا کر محفوظ کر لیا ہو۔ تمام آسمانی صحیفوں میں مشابہت اور مماثلت ہے مگر اس سے یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کی نقل ہیں؟ البتہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام صحیفے مختلف پیغمبروں پر وحی کے ذریعے نازل ہوتے رہے اور اس میں کسی کو بھی شک کی گنجائش نہیں۔

حمورابی کے قوانین میں آزاد اور غلام لوگوں کا بھی ذکر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک معاشرتی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم چند ایک قدیم عبرانی قوانین میں بھی پائی جاتی ہے۔

حمورابی کے قوانین میں اللہ تعالیٰ کے لئے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ مَہر اِلی (Mahar Ili) ہے۔ دراصل اس کے معانی ہیں "اللہ کے روبرو" یعنی Before God. (Ili) کا لفظ ہم بابل کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں ثابت کر آئے ہیں کہ اس کا مطلب اللہ ہے۔ حمورابی کے قوانین میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے کہ جب انسان مر کر دوسری دنیا میں چلا جائے گا تو وہ اپنے اعمال کے لئے "اللہ کے روبرو" پیش ہوگا۔ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ حمورابی کو ایک رب العالمین کا احساس تھا۔ اور پھر کیا یہ احساس کچھ معمولی احساس ہے؟

حمورابی کے قوانین بہت مفصل ہیں۔ ان میں ہر قسم کی بحث موجود ہے اور جو قوانین ایک سوسائٹی کے لئے لازم ہیں، اس زمانے کے مطابق سب بتا دیئے گئے ہیں۔ حمورابی کے مختلف نام مشہور ہیں مگر سب سے مشہور اس نام کے علاوہ حمورابی ہی ہے۔ اس کی شخصیت کے متعلق بھی کچھ اختلاف ہے جیسا ہم نے ذکر کیا ہے مگر چونکہ یہ ایک مختلف فیہ موضوع ہے اس لئے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم حمورابی کا ذکر ختم کریں اس کے نام کے متعلق اپنی تحقیق بتانا چاہتے ہیں حمورابی جیسا کہ ہم نے لکھا ہے مختلف ناموں سے موسوم ہے مگر ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی نام بھی دل لگتا ہوا نہیں۔ ہمیں اس کے معانی سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے لہٰذا جو صحیح نام ہم نے

تجویز کیا اس کی تفصیل ذیل میں اختصاراً عرض ہے۔ ہم نے بہت سے خطِ میخی کے کتبوں سے اس
کا حل دیکھا ہے کسی ایک میں بھی یگانگت موجود نہ تھی۔ حروف والفاظ و تلفظ ملتے جلتے ضرو
مگر ان کے معنی کچھ نہ بنتے تھے۔ ہماری نگاہ میں یہ نام حمورابی یا خمورابی، حمیر ابو ہے "حمیر ح[1]
(سرخی) سے ماخوذ ہے" اور احمر سرخ کو کہتے ہیں۔ ابو عربی میں والد کو کہتے ہیں۔ تو گویا حمیر ا
کے معنی ہو گئے "سرخ والا" یعنی The Red Father چنانچہ حمیر محض اس کی رنگ
کے لئے استعمال کیا گیا معلوم ہوتا ہے۔ اور ابو اس کو اس لئے کہتے ہوں کہ یہ اپنی قوم کو نہایت د
عدل و انصاف کے ساتھ رکھتا تھا۔ جس طرح ترکوں نے مصطفےٰ کمال پاشا مرحوم کے لئے
لقب تجویز کر لیا تھا اتاترک کا (Ataturk) حمیر ابو بھی ممکن ہے کوئی اس قسم کا لقب ہو

ایک اس تحقیق پر پہنچنے کی وجہ اور بھی ہے کہ جب ہم نے اپنے علم کے مطابق خطِ می
سے حمورابی کے نام کو حل کرنا شروع کیا تو بجائے حمورابی کے یہ لفظ ہر دفعہ حمی رابو ہی بنتا تھ
Hammirabbu. پہلے کچھ مغالطہ کا خیال ہوا مگر جب بار بار یہی حل نکلتا رہا تو یقین
ہو گیا کہ ماہرین آثریات نے اس بادشاہ کا نام غلط حل کیا ہے مگر اس میں ایک اور پیچیدگی پ
میں پیش آئی اور وہ یہ کہ ایک دفعہ ایسے ہی خطِ میخی کے کتبات کا حل کرتے کرتے ایک لفظ پر
جو رُبُّو (Rabbu) بنتا تھا اور جن معنوں میں یہ لفظ مستعمل تھا وہ بعینہ رب کے معنی
پھر جب میں نے اس نام کے اپنے حل کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو وہ (Hammi Rabbu) بن
رُبُّو کے معنی تو سمجھ میں آ گئے مگر پہلے حصے کے یعنی (Hammi) کے معنی معلوم نہ ہو سکے۔

ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے حل میں کچھ غلطی رہ گئی ہو اور بجائے Hammi Rabbu
کے اس میں ایک اور R ہو جیسے (Hammir-Rabbu) دراصل خطِ میخی کے کتبوں ک
حل کے تمام اصول کسی قاعدہ کے ماتحت نہیں۔ ماہرین جس طرح چاہتے ہیں ان کو توڑ مروڑ
لیتے ہیں۔ اور چونکہ کچھ نام ان کو پیشتر ہی سے معلوم ہوتے ہیں یہ اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے ک

---

[1] قصص القرآن ج ۲ ص ۳۲۵ - از مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔

...نتہ تک پہنچ جائے۔ اس عمل کے لئے ایک تو بہت وقت درکار ہے اور دوسرے خطِ میخی ...ت کی کمی کی وجہ سے اس میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ نام -Hammir ...Ra بن جائے تو اس کے معانی بن سکتے ہیں۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ صفات الٰہی کا مکمل احساس ...نے کی وجہ سے بجائے ابو کے ربو کا لفظ استعمال کر دیا گیا ہے۔ اسی واسطے ہم نے بجائے ایک ...R کو شامل کرنے کے جو موجودہ R ہے اس کو حمی یعنی (Hamm) کے ساتھ ملا کر اس کا حمیر (-Hammir) بنا دیا ہے اور آخر حصے کو ابو کہدیا ہے۔ تو گویا ہماری تحقیق کے مطابق یہ نام ...ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مضمون کو طول دیتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ نہ معلوم عوام کے مذاق کے مطابق یہ موضوع ...ے ہی یا نہیں۔ اور کتنے احباب اس کو شوق سے پڑھتے ہوں گے۔ ہر چند اتنی گہرائیوں ...جانے سے قلم کو روکتا ہوں مگر دل یہی فتویٰ دیتا ہے کہ یہ چیز ایک دن کارآمد ثابت ہو گی۔ ...یخ قدیم کے متعلق بہت کچھ ماہرین نے لکھدیا ہے مگر اس تمام عرصہ کی سرگذشت کو ابھی ...سرے سے درست کرنا باقی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ جس دن ان تمام تحقیقات کا نئے سرے ...ل ہو گیا تو دنیا کے بہت سے مسائل کی پیچیدگیاں رفع ہو جائیں گی اور اقوام ضد میں آکر ...ت سے انکار نہیں کریں گی۔

ان اللہ لا یظلمُ الناس شیئاً ولکنّ الناس انفسھم یظلمون۔

(یونس)

ادبیات

عیدِ جاوداں

از جناب روش صدیقی

سفرِ شوق سرِ منزلِ اتمام ہے آج
فضل والطافِ خداوند کا ہنگام ہے آج
زندگی کے لئے تسکین کا پیغام ہے آج
رحمتِ خاص، زمانے کے لئے عام ہے آج
دورِ کونین میں ہے عشرتِ روحانی کا
وقت آیا ہے محبت کی جہاں بانی کا

مرحبا! حاصلِ بیداریِ شب ہائے صیام
سحرِ عید ہوئی منزلِ لیلائے صیام
مہِ نو بن کے اٹھا نقشِ کفِ پائے صیام
زینتِ مسندِ امروز ہے فردائے صیام
آج تکمیلِ مسرت ہے مسلماں کے لئے
عیدِ فطرت ہے ہر اک بندۂ یزداں کے لئے

نگراے بے خبرِ عالمِ اسرارِ نشاط
نہ سمجھ عید کو سرمایۂ بازارِ نشاط
سخت مشکل ہے حصولِ گلِ بے خارِ نشاط
طالبِ آتشِ ایثار ہے گلزارِ نشاط
عید کچھ بھی نہیں پیمانِ صداقت کے سوا
خونِ دل، سوزِ وفا، شعلۂ الفت کے سوا

محرمِ رازِ مقاماتِ بقا ہونے پر
شاہدِ عظمتِ پیمانِ وفا ہونے پر
پختہ تر آتشِ تسلیم و رضا ہونے پر
ہدیۂ عشق کے مقبولِ خدا ہونے پر
سجدۂ شکر محبانِ خدا کرتے ہیں
حق ادا عید کا اربابِ وفا کرتے ہیں

ـت حور نہیں ہے صلۂ ماہِ صیام — بادۂ نور نہیں ہے صلۂ ماہِ صیام
ۂ طور نہیں ہے صلۂ ماہِ صیام — خلد مسرور نہیں ہے صلۂ ماہِ صیام
کیا کہوں طالعِ بیدار کو کیا ملتا ہے — اسی منزل میں تو بندوں کو خدا ملتا ہے

ِ کونین کو سینے سے لگانے کے لئے — رحمتِ عام کا پیغام سنانے کے لئے
رحِ خوابیدۂ انساں کو جگانے کے لئے — امتیازات کی لعنت کو مٹانے کے لئے
خدمتِ خلق کا فرمانِ جلی ہے روزہ — دلِ انساں کو نویدِ ازلی ہے روزہ

ر کے ساتھ مصیبت کو گوارا کرنا — بہ خوشی رنج و اذیت کو گوارا کرنا
یٔ جام صداقت کو گوارا کرنا — سختیٔ راہِ محبت کو گوارا کرنا
از پئے دوست ہر اک حال میں شاداں ہونا — حاصلِ صوم ہے وارفتۂ جاناں ہونا

ھوک اور پیاس کی تشہیر نہیں ہے روزہ — خلوتِ زہد کی تعمیر نہیں ہے روزہ
خوابِ فردوس کی تعبیر نہیں ہے روزہ — ضبطِ مجبور کی تصویر نہیں ہے روزہ
بندۂ قادر و قیوم کی معراج ہے یہ — سرفرازِ درِ یزداں کے لئے تاج ہے یہ

منزلِ رنج و مسرت سے گذرنے کے لئے — طلبِ کوثر و جنت سے گذرنے کے لئے
قیدِ ہر لذت و کلفت سے گذرنے کے لئے — شبِ اوہام کی ظلمت سے گذرنے کے لئے
سفرِ زیست میں اک شمعِ ہدیٰ ہے روزہ
قاصدِ مژدۂ دیدارِ خدا ہے روزہ

عید ہے ملتِ بیضا کے لئے صبحِ جلال
عید ہے غازہ فروزِ رخِ خورشیدِ کمال
لمحہ، سحر عید کا آزادِ زوال
عید ہے زندہ کنِ عظمت وجاہ واقبال
رازِ بیداریِ جمہور کی تفسیر ہے عید
کوکبِ صبحِ مساوات کی تقدیر ہے عید

✻

مشرقِ مہرو وفا عید مسلماں کے لئے
جنتِ صدق و صفا عید مسلماں کے لئے
منزلِ لطفِ خدا عید مسلماں کے لئے
اب بھی ہے جامِ بقا عید مسلماں کے لئے
میگساروں میں ہی وہ روح نہیں باقی ہے
نشۂ بادہ ابھی منتظرِ ساقی ہے

✻

عید گہوارۂ اسرارِ جہاں بانی ہے
عید پیغامبرِ عظمتِ انسانی ہے
عید آیاتِ الٰہی کی درخشانی ہے
عید اعمالِ جہاں تاب کی تابانی ہے
عید اس ملتِ خفتہ کو سزاوار نہیں
جس کی نبضوں میں رواں آتشِ کردار نہیں

✻

نغمہ جز آتشِ خاموش لبی کچھ بھی نہیں
نشۂ جز کیفِ غمِ نیم شبی کچھ بھی نہیں
جز غمِ عشق شرابِ عنبی کچھ بھی نہیں
روحِ بے سوز کی جنت طلبی کچھ بھی نہیں
جلوۂ شام نہ تنویرِ سحر سے پیدا
عید ہوتی ہے ترے سوزِ جگر سے پیدا

✻

تجھکو خوشنودیٔ غفار ہے محبوب اگر
پیرویٔ شہ ابرار ہے محبوب اگر
زندگیٔ دلِ بیدار ہے محبوب اگر
اسوۂ احمدِ مختار ہے محبوب اگر
سحرِ عید ہے سوزِ ابدی پیدا کر
سجدۂ عشق سے محرابِ خودی پیدا کر

✻

مشاہیرِ یونان وروما (جلد اول) مترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر، ضخامت ۴۸۸ صفحات۔ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ۸ہ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

پلوٹارک یونان کا پہلی صدی عیسوی کا مشہور مصنف ہے اس نے یونان اور روما کے مشاہیر کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کا اصل یونانی نسخہ ۱۵۱۷ء میں پہلی مرتبہ اٹلی میں طبع ہوا۔ اور پھر اصل نسخہ کی بار بار اشاعت کے علاوہ یورپ کی تقریباً ہر بڑی زبان میں اس کتاب کے تراجم شائع ہوئے۔ عرصہ ہوا اردو زبان کے مشہور مترجم اور کہنہ مشق صاحب قلم مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے انجمن ترقی اردو کے لئے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اب انجمن نے تقریباً ایک ربع صدی کے بعد لائق مترجم سے نظر ثانی کرا کے بہت کچھ اصلاح وترمیم کے ساتھ اس کو زیادہ اہتمام سے شائع کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جس میں یونان وروما کی آٹھ بڑی شخصیتوں کا ذکر آگیا ہے۔ مصنف کا طریقہ عام طور پر یہ ہے کہ وہ پہلے یونان اور روما دونوں ملکوں کی ایک ایک بڑی شخصیت کا ذکر الگ الگ کرتا ہے۔ اور پھر دونوں میں مقابلہ وموازنہ کرتا ہے۔ پلوٹارک کا ہر بیان تاریخی اعتبار سے مستند نہ سہی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ کتاب نہایت دلچسپ اور بعض خاص اعتبارات سے سبق آموز بھی ہے“۔ ترجمہ کی دلکشی اور روانی کے لئے ہاشمی صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔ آپ نے اس میں ایک جدت یہ کی ہے کہ اشعار کا ترجمہ بھی اشعار میں کرتے چلے گئے ہیں۔[۱] ہمیں امید ہے کہ انجمن

---

[۱] شروع میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا ایک مختصر مگر مفید مقدمہ ہے جس سے کتاب کی اہمیت اور یونانی ادبیات میں اس کی ایک خاص وقعت وعظمت پر روشنی پڑتی ہے۔

اس مفید اور دلچسپ کتاب کے باقی حصے بھی جلد شائع کرے گی۔ اور اس جلد میں طباعت وکتابت کی جو غلطیاں رہ گئی ہیں باقی جلدوں کو اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گی۔

کتاب الہند جلد دوم۔ مترجمہ سید اصغر علی صاحب تقطیع متوسط ضخامت ۴۴۴ صفحے کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ے رشائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

یہ کتاب ابوریحان البیرونی کی مشہور ومعروف کتاب الہند کے اردو ترجمہ کی دوسری جلد ہے جو باب ۳۱ سے لیکر باب ۸۰ تک یعنی پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں ہندوؤں کے سال، مہینے اور ان کی تقسیم۔ مذہبی اور سوشل رسوم عورتوں اور مردوں کے لئے مذہبی احکام ان کے قومی عادات وخصائل، تیر تہوار، ہندوؤں کا علم النجوم۔ مذہبی پیشواؤں کے فرائض اور ان کی خصوصیات وغیرہ وغیرہ مسائل پر نہایت محققانہ اور فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے یہ کتاب عوام کے کام کی نہیں۔ جو لوگ ریاضیات اور علم نجوم وافلاک سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اصل کتاب کو نہیں پڑھ سکتے وہ اس سلیس وشگفتہ اردو ترجمہ کی مدد سے اس بے مثل کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

الف لیلہ ولیلہ حصہ سوم مترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد صاحب مرحوم تقطیع متوسط ضخامت ۵۵۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد صر غیر مجلد چار روپے شائع کردہ انجمن شائع ترقی اردو (ہند) دہلی۔

یہ کتاب عربی زبان کی مشہور افسانوی کتاب الف لیلۃ ولیلہ کے اردو ترجمہ کی تیسری جلد ہے اس میں دوسو بیسویں شب سے لے کر چار سو اکتھویں شب تک کی یعنی دو سو اکتالیس کہانیاں آگئی ہیں۔ اگرچہ کہنے کو یہ محض کہانیاں ہیں۔ تاہم بعض بعض جگہ بڑے کام کی اور مفید واخلاق آموز باتوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ترجمہ دلچسپ اور شگفتہ ہے کہ بالکل اصل کا سا لطف آتا ہے۔

ٹوٹے ہوئے پر | مترجمہ جناب حکیم حبیب اشعر صاحب دہلوی تقطیع خورد ضخامت ۱۱۶ صفحات طباعت وکتابت عمدہ قیمت ۸؍ پتہ:۔ کتب خانہ علم وادب اردو بازار دہلی۔

جبران خلیل جبران عہد حاضر کا مشہور عربی زبان کا شاعر اور ادیب ہے۔ متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ مگر اردو خواں طبقہ میں بالکل نامعروف نہیں۔ اس کی کئی کتابوں کا ترجمہ پہلے بھی اردو زبان میں ہو چکا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کے ایک حزنیہ ناول "الاجنحۃ المتکسرہ" کا ترجمہ ہے۔ لائق مترجم دہلی کے نوجوان شاعر اور ادیب ہیں اور ٹکسالی زبان بولتے اور لکھتے ہیں انھوں نے اس ترجمہ میں بھی اپنی ان خصوصیات کو باقی رکھا ہے۔ ناول دلچسپ اور بعض اعتبارات سے سبق آموز بھی ہے۔

عرفانِ حافظ | از شیاما چرن داس صاحب۔ تقطیع جیبی۔ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت ۴؍ پتہ: ... ۱۶۴۹ دسان اسٹریٹ دہلی۔

اس کتابچہ میں فاضل مرتب نے خواجہ حافظ شیرازی کے ایسے متفرق اشعار مختلف عنوانات کے ماتحت جمع کر دیئے ہیں جن میں تصوف، معرفت اور رجوع الی اللہ کے مضامین بیان کئے گئے ہیں مصوف نے انتخاب کے ساتھ ساتھ اشعار کا اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے جو سہل وسلیس اور عام فہم ہے اور ہر باب کے شروع میں عنوان کی تشریح سے متعلق مختصر مگر مفید نوٹ بھی ہیں۔ اربابِ ذوق کے لئے یہ کام کی چیز ہے۔

یادِ اقبال | مرتبہ غلام سرور صاحب فگار۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۱۲۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت بے جلد ۹؍ پتہ:۔ اقبال اکیڈمی لاہور

اس مجموعہ میں وہ متفرق نظمیں اور قطعات وغیرہ جمع کر دیئے گئے ہیں جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اردو زبان وادب کے مختلف اربابِ قلم وسخن نے لکھے تھے اور جن میں انھوں نے اسلامی ہند کے اس حادثہ فاجعہ پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ اس کتابچہ میں اس قسم کے قطعات اور مراثی کا استقصا نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم بعض اچھے اچھے اور بلند پایہ شعراء کے قطعات اس میں شامل ہیں۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل
ئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے
ئے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

ر اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلۂ غلامی پر
حققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے
ئے گئے ہیں قیمت ؎ مجلد للعہ

سلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی
کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

زم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق
ر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے
ر اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ؎ مجلد للعہ

ستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۸ر

ہ نبی عربی صلعم:۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس
رت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک
ر تیب سے یکجا کیا گیا ہے، قیمت عہ

ن جدید اڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے
ئے ہیں۔ اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب
ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل
قیمت عہ مجلد ہے

غلامانِ اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے
کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی
بیان قیمت ؎ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط
محققانہ کتاب۔ جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے
قیمت ؎ مجلد ہے

سنہ ۴۱ء:۔ قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن
ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب
زیرِ طبع قیمت ؎ مجلد ہے

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت
دو روپے مجلد ؎

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک
لائبریری میں رہنے کے لائق ہے۔ قیمت عہ

تاریخ انقلابِ روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند
اور مکمل خلاصہ۔ قیمت عہ

۱۹۴۲ء قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ
اسلام کا اقتصادی نظام:۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن زیر طبع قیمت للعہ مجلد صہ

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۱۲؍ مجلد ۱۲؍

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن زیر طبع۔ قیمت عا؍ مجلد ۲؍

۱۹۴۳ء:۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب۔ قیمت ۲؍ مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ۔ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپے مجلد سات روپے۔

خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۱۲؍ مجلد ۱۲؍

۱۹۴۴ء:۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب۔ اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی۔ قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم:۔ کتاب کے اس حصہ میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی اور تاریخی واقعات کی مکمل تشریح و تفسیر کی گئی ہے قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی قیمت ۲؍ مجلد للعہ زیر طبع

۱۹۴۵ء کی کتابوں میں "قرآن اور تصوف" مولفہ ڈاکٹر میر ولی اللہ صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی طبع ہو چکی ہے۔ عنقریب حضرات محسنین و معاونین کی خدمت میں روانہ کی جائیگی۔

قصص القرآن جلد چہارم پریس کو جا رہی ہے باقی دو کتابوں کا اعلان بعد کو کیا جائے گا۔

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ
گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

راشدہ: تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں
ئے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات
و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں
ے مجلد ہے

کا عروج اور زوال۔ عہ

لغات القرآن جلد اول۔ لغت قرآن
کتاب ہے مجلد للعہ

رل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص سلسلہ
قیمت ہے

حکومت: صدیوں کے قانونی ...
ب اسلام کے ضابطۂ حکومت کے
پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت
مجلد سات روپیے۔

امیہ: تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے
مفصل حالات و واقعات ہے مجلد ...

سنہ ۴۴ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ
بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی
قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔
قیمت ہے مجلد للعہ

سنہ ۴۵ء قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت
کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت
مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور
اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح
کیا گیا ہے قیمت ... مجلد ہے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ
کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابلِ مطالعہ کتاب
صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ہے

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) **محسنِ خاص**:- جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین
دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی
مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسـ
شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی
ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبـ
اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ الـ
کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سا
پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبا**:- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضـ
رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گ

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جـ

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نـ
وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا
اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء: اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ۳ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عالہ مجلد سے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیہل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۲ر

۱۹۳۹ء: نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے قیمت عمر

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت ۲ مجلد ۳ر

غلامانِ اسلام: پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت ۵ر مجلد ۵ر

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے قیمت ۵ر مجلد ۶ر

۱۹۴۰ء: قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت عہ مجلد ۶ر

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عالہ

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ۳ر

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عمر

جلد پنجدہم شمارہ (۴)

شوال المکرم ۱۳۶۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۵ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ اکثر اپنی مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان کا مقصد تحصیلِ علم سے یا تو دین ہوتا ہے اور یا فقط دنیا۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو علم کو محض علم کے لئے حاصل کرتے ہیں۔ ان میں پہلا طبقہ سب سے اعلیٰ ہے اور ہمارے بزرگانِ کرام کا مقصد تحصیلِ علم سے دین ہی تھا۔ جو لوگ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ لیکن علم سے کسبِ دنیا کا کام لینا اور اسی مقصد کے لئے اسے حاصل کرنا ایک بدترین معصیت ہے اور اس قسم کے لوگ اسفل السافلین کے مستحق ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اس احمق کی سی ہے جو بازار سے ایک قیمتی شال محض اس لئے خرید کرتا ہے کہ اس سے وہ اپنا جوتہ صاف کیا کرے گا۔ اس کے بعد حضرتِ مرحوم ہم طلبہ سے خطاب کر کے تاکیداً فرماتے تھے کہ تم لوگوں کو سب سے پہلے اپنی نیت اور ارادہ کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ تم میں سے کون شخص کس طبقہ میں شریک ہونا چاہتا ہے؟"

اسی سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نہایت افسوس کے ساتھ آبدیدہ ہو کر فرماتے تھے کہ میرے نزدیک حکومتِ مسلطہ کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اس نے ہم سب کے دلوں میں خود غرضی اور دنیا پرستی کا بیج بو کر اخلاصِ عمل اور للّٰہیت کا بالکل قلع قمع کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے خالص دینی اور مذہبی کام بھی اب صرف دین کے لئے نہیں رہے۔ اور ان کا مقصد بھی اس ذریعہ سے دنیا پیدا کرنا ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے اب ہمارے کاموں میں برکت نہیں رہی۔ ہم سب کچھ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ علوم و فنون پر عمریں صرف کرتے ہیں۔ زندگی کا بہترین جوہر طلبِ علم کی نذر کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی ہماری ان کوششوں پر وہ ثمرات مرتب نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔ یہ حالت انتہا درجہ افسوسناک ہے۔ اگر اس کی اصلاح

نہیں کی گئی تو ایک دن اس کا انجام یہ ہوگا کہ مدارسِ عربیہ کی سندِ فراغ رکھنے والے تو بے شمار ہوں گے لیکن ڈھنگ کا عالم ان میں کوئی ایک مشکل سے ہی مل سکیگا۔

پندرہ سولہ برس کی مدت کوئی طویل مدت نہیں ہوتی حضرت الاستاذ کا یہ ارشاد کل کی سی بات ہے لیکن ہم آج کے حالات کا مقابلہ اس زمانہ کے حالات سے کرتے ہیں تو زمین آسمان بدلے ہوئے نظر آتے ہیں اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ حضرتِ مرحوم نے اس وقت جو کچھ فرمایا تھا وہ آج کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہا ہے، ہندوستان کے طول وعرض میں جو عربی مدارس قائم ہیں ان کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ مدارس کی تعداد، ان کی آمدنی، طلبہ کی گنتی اور دوسرے انتظامات کی فراوانی، ان سب امور کے اعتبار سے پہلے کی بہ نسبت مدارس عربیہ اب کہیں زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمی حالت کس درجہ افسوسناک ہے اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے دنوں تین مدارس کو اپنے یہاں چند مدرسوں کی ضرورت تھی۔ اس سلسلہ میں مدارس کے اربابِ اہتمام نے خود دور دراز کا سفر کیا۔ اِدھر اُدھر خطوط لکھے مگر اس کے باوجود انھیں کوئی لائق مدرس نہیں ملا۔ تو آخر کار بعض پرانے مدارس کے جمے جمائے مدرسین کو بڑی بڑی تنخواہ دیکر انھوں نے اپنا بھرت پورا کیا۔ اب ان مدرسین کے چلے جانے سے ان کے پرانے مدارس میں جو جگہیں خالی ہوگئی ہیں وہ اب تک بدستور خالی پڑی ہوئی ہیں۔ اور بیچارے مدرسہ والے اسباق کو اِدھر اُدھر منتقل کرکے اپنا کام چلا رہے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب ہمارے ملک میں قابل اور فاضل علماء کی پیداوار کس درجہ افسوسناک طریقہ پر روزانہ کم ہوتی جارہی ہے

مدارسِ عربیہ میں جو طلبار تعلیم پاتے ہیں۔ اول تو زمانۂ تعلیم میں ہی سیاسی ہنگامہ پروری اور دوسری قسم کی انجمن آرائی وغیرہ ان کے ایسے مشاغل ہوتے ہیں جو انھیں یکسوئی کے ساتھ تحصیلِ علم میں بھی مشغول نہیں رہنے دیتے۔ پھر یہاں سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد جب ان کی نگاہ گرد و پیش

کی دنیا پر پڑتی ہے تو اب وہ اس کی مصنوعی جگمگاہٹ سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جو کچھ سمجھدار اور ذہین ہوتے ہیں وہ علوم شرقیہ کے امتحانات میں
کامیابی حاصل کرکے اسکولوں یا بڑا تیر مارا تو کسی کالج میں اورنٹیل ٹیچر ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ
جن لوگوں کو طالب علمی کے زمانے میں کچھ لکھنے لکھانے کی مشق ہو جاتی ہے وہ کسی اخبار کے دفتر
میں کوئی کرسی سنبھال لیتے ہیں۔ اب جو بچتے ہیں ان میں سے کچھ انجمنوں میں کچھ کاروبار میں، اور
کچھ مدرسوں میں کھپ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے کام مختلف ہی، لیکن ان میں سے جو شخص جہاں
ہوتا ہے مطمئن ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیشہ کو اسی طرح سرانجام دیتا ہے جس طرح سرکاری دفتر کا
کوئی کلرک۔ مہینہ بھر کام کرنے کے بعد اس نے اپنی تنخواہ لی اور بس! اب اسے نہ مطالعۂ کتب سے
کوئی واسطہ ہے، اور نہ مسلمانوں کے عام ارشاد و ہدایت سے کوئی دلچسپی۔ یعنی اس نے کسی ایک
مدرسۂ عربیہ میں آٹھ نو سال مقیم رہ کر علوم دین کی تحصیل صرف اس لئے کی تھی کہ یہاں سے فارغ
ہونے کے بعد وہ خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی روزی کا بندوبست کر سکے اور ان کا پیٹ پال سکے
گویا اس طرح ہمارے مدارس عربیہ بھی معاشی ضروریات کو پورا کرنے اور انسان کو صرف اسی کے قابل
بنانے کا ذریعہ ہو گئے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی حیثیت ان اداروں سے ہرگز مختلف نہیں رہی
جن کا مقصد وجود ہی انسان کو شکم پری کے لائق بنانا ہے۔

ایک طرف ہماری دینی تعلیم کے انحطاط و تنزل کا یہ عالم ہے کہ غزالی و رازی اور سبکی و
سیوطی تو کجا، نصابِ متداول کو پڑھانے والے اور استناد کے ساتھ دو چار مسئلے بتانے والوں کے بھی
لالے پڑتے جاتے ہیں۔ اور دوسری جانب مختلف اسباب و وجوہ سے ملک میں الحاد و زندقہ عام ہوتا
جاتا ہے، بے دینی کو فروغ ہو رہا ہے اور جدید تعلیم کے نوجوانوں میں علماء کی قیادت اور رہنمائی سے سرکشی
بڑھتی جا رہی ہے۔ اب ان حالات کو سامنے رکھکر خدا کے لئے غور کیجئے کہ اگر لیل و نہار کی گردش یہی
رہی اور حالات کی رفتار میں کسی خارجی مؤثر کے ماتحت بالکل معجزانہ طریقہ پر تبدیلی پیدا نہیں ہوئی

تو اس ملک میں مسلمانوں کا اور اسلام کا کیا حشر ہوگا۔ ٹرکی، عراق، فلسطین اور ایران کا انجام ہمارے سامنے ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ ان ممالک میں آج جو لامذہبیت اور بے دینی پائی جاتی ہے اس کا اصل باعث یہ نہیں ہے کہ وہاں علمائے حق جو ایک نظر سے خاک کو کیمیا بنا دیتے تھے ان کی پیداوار یک بیک رک گئی اور اُن کی جگہ صرف پیشہ ور مولوی پیدا ہونے لگے جو نوجوان طبقہ کو اپنی مذہبی قیادت کے سایہ میں رکھنے کے قابل نہیں تھے۔

ہندوستان کے عام مسلمانوں اور علمائے کرام دونوں کو خوب اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ سیاسی اختلافات اور ان کے لئے رزم آرائیاں وقت کی آندھی کا ایک تھپیڑا ہے جو بہر حال وقتی اور ہنگامی ہے۔ لیکن اگر اس کشمکش میں خدانخواستہ مسلمانوں کے دینی رجحانات کو کوئی صدمہ پہنچ گیا اور عوام کا تعلق دین کے ساتھ ساتھ علماء سے بھی منقطع ہو گیا تو یہ یقینی ہے کہ اس عظیم خسارہ اور تباہی کی مکافات صدیوں میں بھی نہ ہو سکیگی اور پھر خدا کے یہاں اس کی بازپرس کسی ایک فرقہ اور گروہ سے نہیں۔ بلکہ سب سے ہی ہوگی۔

یہ تو ہماری تباہی و بربادی کا وہ منظر ہے جو قدیم تعلیم کی درسگاہوں میں نظر آتا ہے۔ اب ذرا جدید تعلیم کا بھی سرسری طور پر ایک جائزہ لیتے چلئے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جدید تعلیم کا مقصود بالذات بڑی بڑی ملازمتوں، عہدوں، یا معاش کے لئے کسی آزاد ذریعہ کے حاصل کرنے کے سوا، شائستگی یا کلچر کا حصول کبھی بھی نہیں رہا ہے۔ لیکن گذشتہ جنگ عالمگیر سے پہلے چونکہ حکومت نے اپنی مخصوص پالیسی کے ماتحت ہندوستان میں صنعتی وحرفتی اور دوسری قسم کی ٹکنیکل تعلیم کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اس بنا پر ہمارے نوجوان طلبہ فنون (Arts.) پر اپنا وقت زیادہ صرف کرتے تھے۔ اور اس طرح فلسفہ، تاریخ، لٹریچر، اور عربی، فارسی وغیرہ کے پڑھنے سے ان میں خود بخود شائستگی تہذیب اور کلچر پیدا ہو جاتا تھا۔

اور یہ لوگ کالجوں سے نکلنے کے بعد ملک کے ادبیات اور سیاسی وتہذیبی خدمات میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔

لیکن اس جنگ نے جدید تعلیم کا نقطہ نظر بھی بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اب چونکہ حکومت جنگ کے اثراتِ مابعد کی وجہ سے ہندوستان کو صنعتی وحرفتی ملک بنانے پر مجبور ہے، اس بنا پر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ.... طلبا میں فنون کی بے قدری اور بے وقعتی کے جذبات روز بروز افزوں ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے بجائے، سائنس اور صنعتی وحرفتی تعلیم کی طرف رجحانات زیادہ ہو رہے ہیں۔ جن حضرات کو یونیورسٹی کی تعلیم کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ آج کل تقریباً ہر یونیورسٹی میں فنون کی کلاسوں میں طلبا، اور طالبات کا وہ ہجوم نظر نہیں آتا جو طبعیات۔ کیمیا۔ زراعت اور تجارت وغیرہ کی کلاسوں میں نظر آتا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی تہذیب اور کلچر کے اعتبار سے ہم لوگوں کے لئے کچھ خوش آئند نہیں ہے۔ ہم ٹکنیکل اور میکنیکل تعلیم کے مخالف نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی سمجھدار انسان جو ملک کی مادی اور اقتصادی فلاح وبہبود کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس تعلیم کی مخالفت کر سکتا ہے لیکن ہمارے ماہرینِ تعلیم اور اربابِ حل وعقد کو ایک لمحہ کے لئے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر ملک میں صرف بڑے بڑے انجنیر، صناع اور اربابِ حرفت ہی پیدا ہونے لگے اور شائستگی اور کلچر سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہوا جو فنون کی تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں تو ہمارا ملک اقتصادی اور مادی اعتبار سے ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی، روحانی اور ادبی اعتبار سے کس قدر پست اور انحطاط پذیرفتہ ہو جائے گا اور یہ چیز ہندوستان کی اپنی کلچرل روایات کے لئے کس درجہ حسرت وافسوس کا باعث ہوگی، زمانہ کے ساتھ چلنا بیشک ہر قوم کو اپنی زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن اگر کوئی قوم اپنی قومی خصوصیات سے محروم ہو کر زندہ رہتی ہے تو درحقیقت وہ اس کی زندگی نہیں بلکہ موت ہے، زمانہ مابعد جنگ کے لئے جو تعلیمی نظام بنایا جا رہا ہے اس میں اس بنیادی حقیقت کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

توحیدِ الوہیت

(۳)

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔اے۔پی ایچ ڈی۔بیرسٹر ایٹ لا
صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

دیکھو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرمارہے ہیں۔ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ
[لَا يُ]حِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (پ۸ع۱۴) دوسری جگہ ارشاد ہے:۔ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ
[قَرِ]يْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (پ۸ع۱۴) ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں سے
[دعا] مطلوب ہے۔ اسی سے دعا کا عبادت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مزید توثیق اس امر سے ہوتی
[ہے] کہ غیر کو پکارنے سے منع فرمارہے ہیں۔ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا (پ۲۹ع۱۱) نیز حکم ہے۔ وَلَا
[تَدْعُ] مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (پ۹ع۱۶) پھر دعا کو اپنے ہی لئے مخصوص کررہے ہیں۔ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ (پ۱۳ع۸)
[اس] طرح اثباتاً و نفیاً دعا کو حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کے لئے مخصوص فرمارہے ہیں اور اپنے سوا کسی کو
[اس] کے لائق نہیں قرار دے رہے ہیں یعنی منادی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں پھر دعا کا حکم دے کر اس کو
[صا]ف طور پر عبادت قرار دیا گیا ہے:۔ ادعونی استجب لکم (پ ع)

اسی طرح جب دعا کا عبادت ہونا آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہوا تو اب احادیثِ نبویہ پر ایک نظر
[ڈالو] جو دعا کو عین عبادت قرار دے رہی ہیں۔

(۱) عن نعمان بن بشیر قال قال رسول اللہ صلعم: "الدعاء ہو العبادۃ" ثم قرأ وقال
[ربکم] ادعونی استجب لکم (رواہ احمد والترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجہ) یعنی دعا عبادت ہی تو ہے

---

[۱] تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کرتے بھی اور چپکے چپکے بھی اور واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو حد سے نکل جاویں

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ادعونی استجب لکم۔ اس آیت کے پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ دعا کے عبادت ہونے کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کا حکم کیا ہے۔

(۲) عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلعم" الدعاء مخ العبادۃ" (رواہ الترمذی) یعنی دعا مغز ہے عبادت کا، جس طرح مغز شئی، شئے کی حقیقت ہوتا ہے اسی طرح دعا یعنی خضوع وخشوع وتذلل کے ساتھ پکارنا عبادت کی حقیقت ہے اور اس لئے مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کے ساتھ جو مجیب الدعوات ہیں۔

(۳) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم، من لم یسئال اللہ یغضب علیہ (رواہ الترمذی) یعنی جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے، جب اللہ سے نہ مانگنا غصہ کا باعث ہوتا ہے تو اس سے نہ مانگ کر اوروں سے مانگنا تو اور زیادہ غضب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے۔

جب دعا کا عبادت ہونا ثابت ہو گیا تو اب صاف ظاہر ہے کہ غیر اللہ سے دعا کا مانگنا شرک ہے، شرک فی العبادت ہے۔ اس مقصد کے لئے آیات قرآنیہ کا پیش کرنا ضروری نہیں لیکن مزید تقویت کے لئے چند آیات پر غور کر لو:

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ یعنی مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اسی وقت ظالموں میں ہو جائے گا۔" (پ۱۱ ع ۱۶)

جلب منفعت ودفع مضرت کے لئے غیر اللہ کو دور دور سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو ان سے عرض کرنا اور اس طرح ان کی پرستش کرنا بڑے ظلم وستم کی بات ہے، کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک وبد، نفع ونقصان سب کچھ ہے اس پروردگار کو چھوڑ کر اس سے منہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہونا اور ذلت وفقر کی نسبت ان سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر، اس سے بڑھ کر دنیا میں ظلم وستم کیا ہو سکتا ہے! شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے، ان الشرک لظلم عظیم (پ۲۱ ع ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض مفسرین نے " دون اللہ" اور " غیر اللہ" کی توجیہ میں

اصنام واوثان کا ذکر کردیا ہے۔ اس لئے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیا و اولیا سے دعا کرنا، مرادیں مانگنی شرک نہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) علم اصول کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ "العبرۃ بعموم الالفاظ لا بخصوص الموارد" یعنی اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں سب ان میں داخل ہیں۔ خواہ ولی نبی ہو، یا بھوت پری، چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ لکھتے ہیں کہ "قل ادعوا الذین زعمتم انھم الھۃ من دونہ کالملئکۃ والمسیح وعزیر۔ یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیح و عزیر۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ویسی ہی زجر و توبیخ کی ہے جیسی کہ بت پرستوں کی کی ہے۔ اس عمومِ الفاظ کے اعتبار سے صاحب جلالین نے اکثر مقامات پر دون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تراشے تھے اور ان کی بت پرستی کا منشا ان ہی اکابر کی تعظیم تھی، لہذا وہ دراصل پتھروں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء و صلحاء پرست تھے۔

غرض غیر اللہ و دون اللہ سے مراد نہ صرف بت ہیں بلکہ انبیاء اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تو صنم و وثن، نبی ولی، پیر شہید، بھوت، پری سب حرمتِ عبادت میں مساوی ہیں اور ان میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں، کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و شرک ہے بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللازم باطل فالملزوم مثلہ۔

(۳) اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ فَادْعُوْھُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ

صادقین (پ ۹ ع ۱۲) یعنی واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں، سو تم ان کو پکارو، پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو"!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء انبیاء اور ملائکہ کو دفع مضرت و جلب منفعت کے لئے پکارا کرتے تھے اس لئے ان سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لئے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں۔ محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کرتا ہے۔ اسی لئے مقاتلؒ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود، اس لئے کہ وہ من دون اللہ سے دعا کرتا ہے۔ اور من دون اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود!

(۳) قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ ان عذاب ربک کان محذورا۔ یعنی "جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں نہ اس کے بدل ڈالنے کا، یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈھ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں"۔

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے، کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور یہ احمق مشرک جن ہستیوں کو اچھے برے کا مختار جان کر پکارتے ہیں ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرار عباد، کیونکہ حق تعالیٰ کی امید و رجا رکھنا، اس کے قرب کا طالب ہونا، اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے۔

پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفعیہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردودین کے ماننے والوں کا کیا حال ہوگا۔

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔ قل ادعوا الذین زعمتم انہم آلھۃ من دونہ کالملائکۃ والمسیح وعزیر، فلا یملکون فلا یستطیعون کشف الضر عنکم کالمرض والفقر ولا تحویلا ولا تحویل ذلک منکم الی غیرکم۔[1] دیکھیے بیضاوی نے صراحت کر دی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیر تک کشف ضر یعنی مرض وفقر وقحط یا مصائب وآفات کے رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بلاؤ دور پھیر سکتے ہیں، جب ان ابرار کبار کا یہ حال ہو تو اشرار صغار کا کیا پوچھنا!

(۴) یاایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب ما قدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ لقوی عزیز (پ۱۷ ع ۱۷) یعنی اے لوگو! ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر، ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنی چاہیے تھی وہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب ہے۔

ان آیات سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے دعا مانگتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہ صریح گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہیں، ان کا مذہب باطل ہے۔ کیونکہ

(۱) جن کی یہ عبادت کر رہے ہیں خواہ وہ اصنام ہوں یا ملائکہ عظام یا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کر سکتے، پھر ان سے کسی ایک چیز کا مانگنا اور اس کے لئے گڑگڑانا جس کو پیدا کرنے کی ضرورت ہو کیسی جہالت ہے! جب وہ سب کے سب جمع ہو کر حقیر سے حقیر چیز کو

---

[1] تفسیر بیضاوی ص ۲۰۲، مطبوعہ دار الطباعۃ عامرہ قسطنطنیہ ۱۳۰۵ھ

پیدا کرنے کے قابل نہیں تو پھر غور کرو کہ معنوی حیثیت سے وہ کس قدر عاجز ٹھیرتے ہیں۔

(۱) اب رہا ان سے ایسی چیز کا طلب کرنا جس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں سو یہ بھی باطل ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے جو چیز جس کے لئے مقدر کر دی ہے اس میں نہ وہ ایک ذرہ کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے ایک ذرہ کی کمی، وہ کسی چیز کو ایک مکھی سے بھی چھین کر دوسرے کو دینے کی سکت نہیں رکھتے اور نہ آپ ہی لینے کی قوت تو پھر ان سے عرض حاجات اور طلب مرادات کرنا کتنی حماقت ہے! اور آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان مشرکین نے حق تعالیٰ کی قدر جیسی چاہئے ویسی نہ سمجھی، اگر سمجھتے تو حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بیچاروں سے کہ جن سے کہ ایک مکھی تک نہیں بن سکتی کاہے کو حاجتیں مانگتے اور مرادیں طلب کرتے "خاک پڑے ایسی سمجھ پر جو بادشاہ کے روبرو فقیر سے بھیک مانگے"۔ اھ

شرمت باد کہ من بسویت نگراں باشم تو نہی چشم بسوئے دگراں (جامی)

یہاں "من دون اللہ" سے محض اصنام اور بت مراد لینا کسی طرح درست نہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے، اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے سب اس میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں حق تعالیٰ نے انھیں قابلِ عبادت اور لائقِ دعا اس سے نہیں قرار دیا کہ وہ کسی شے کی تخلیق پر قادر نہیں۔ لن یخلقوا میں لن اصل میں نفیِ مستقبل کے لئے آتا ہے اور اس کی نفی مؤکد ہوتی ہے جس طرح تمام اہلِ لغت اور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علت عام ہے تمام مخلوق کو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، اغنیاء ہوں یا اشقیاء ان میں سے کسی کو تخلیق کی قابلیت نہیں۔ اور یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ بت پرست اپنے بتوں کو بذاتہ معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ مقصود ان کی تعظیم سے اولیاء وانبیاء کی تعظیم تھی جن کی صورتوں پر وہ مورتیں بنائی گئی تھیں چنانچہ امام رازیؒ نے اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"فالقوم کانوا یعتقدون فیھا انھا طلسمات موضوعۃ علی صورۃ الکواکب اوانھا تماثیل الملائکۃ والانبیاء المتقدمین وکانوا یعظمونھا علیٰ ان تعظیمھا یوجب تعظیم الملائکۃ واولئک الانبیاء"۔ [۱]

---

[۱] دیکھو تفسیر کبیر اور مقامات کے لئے ج اول ص ۲۲۳، نیز ج ۴ ص ۶۸ نیز ج ۸ ص ۲۳۲۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو تعظیم وعبادت مخصوص بحضرت حق تعالیٰ جل شانہ ہو اس کو
انبیاء واولیاء کے ساتھ متعلق کرنا ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ بتوں کے ساتھ کرنا! ان وجوہ کی بناء پر ان
آیات کی تخصیص بتوں کے ساتھ باطل ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جس طرح بتوں سے دعا کرنا شرک جلی ہو
بالکل اسی طرح نبی وولی سے دعا کرنا بھی شرک جلی ہے۔

(۵) لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ، وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ
اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ، وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (پ ۱۳ ع ۸) "سچا پکارنا اسی
کے لئے خاص ہے اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور
نہیں کرسکتے جتنا کہ پانی پاس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف
پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اس کے منہ تک آنے والا نہیں اور کافروں کی
جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے"۔

یعنی پکارنا اسی کو چاہیے، درد ومصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہیے جو ہر قسم کے نفع وضرر کا
مالک ہو، عاجز وفقیر کو پکارنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے سے کیا حاصل؟ حق تعالیٰ کے سوا کون ہے
جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع وضرر ہے۔ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لئے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا
کنویں کے منہ پر کھڑا ہوکر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے
قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں، بلکہ اگر پانی اس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر
منہ تک نہیں جاسکتا"۔

غور کرو کہ اس آیت میں "دعوت" یعنی دعا کی تخصیص حق تعالیٰ ہی کے ساتھ کی گئی ہے
اس لئے کہ جار مجرور جو معمول ہے "دعوت" کا وہ اپنے عامل پر مقدم ہے اور تقدیم معمول کی مفید حصر ہوتی
ہے۔ اس پر علمائے بیان کا اتفاق ہے اور مفسرین کا اجماع، چنانچہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ
میں بھی یہی صورت ہے۔ یہاں بھی حصر ہے۔ دعا کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ چاہیے اور عبادت
بھی۔ اسی تخصیص کو مثال سے واضح کیا گیا کہ جو حق تعالیٰ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ ان

نادانوں کے مانند ہیں جو پیاس لگنے پر کنوئیں کے منہ پر جاکر پانی کو پکارتے ہیں۔ ہر ایسی پکار کو کافروں کی پکار قرار دیا اور اس کا نتیجہ اور انجام "ضلال" یا گمراہی و بطلان و ناامیدی ٹھہرایا۔

(۶) اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ وَ قَوْمِہٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَھَا عٰکِفِیْنَ ۔ قَالَ ھَلْ یَسْمَعُوْنَکُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۔ اَوْ یَنْفَعُوْنَکُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ (پ ۱۹ ع ۹) یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کس چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم ان ہی پر جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارا کرتے ہو، یا یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں، یا یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں؟

ان آیات سے واضح ہے کہ غیر خدا کو پکارنا، ان سے اپنی حاجتیں طلب کرنا مشرکین کا شیوہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی اور سے دعا کرے یا اس سے امیدِ نفع و ضرر کی بالاستقلال رکھے وہ وہ بت پرست ہے اور جس کے ساتھ اس نے فقر و ذلت کی یہ نسبت قائم کر رکھی ہے وہ اس کا بت ہے۔ حضرت سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل اندر صمد باید اے دوست بست! | کہ عاجز ترست از صنم ہر کہ ہست!

اسی لئے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا لیس الشرک عبادۃ الاصنام بل ھو متابعتک لھواک وان تختار مع ربک عز وجل شیئاً سواہ من الدنیا وما فیھا والاخرۃ وما فیھا فما سواہ عز وجل غیرہ فاذا رکنت الی غیرہ فقد اشرکت بہ عز وجل غیرہ[1] ؎

غیر حق ہر چہ دلت را بر بود | سد راہ تو ہماں خواہد بود
غیر حق یک ذرہ کاں مقصود تست | تیغ لا برکش کہ آں معبود تست

مشرکین کے طریقہ کے خلاف موحد کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے مانوس ہوتا ہے،

---

[1] شرک کچھ بت پرستی ہی نہیں ہے بلکہ خواہش نفس کی پیروی کرنا اور حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی شے کو ان کے سوا دنیا و عقبیٰ وما فیہا کو اختیار کرنا ہے کیونکہ جو کچھ حق تعالیٰ کے سوا ہے وہ غیر اللہ ہے، سو جب غیر کی طرف میل ہوا تو گویا اس میں غیر کو اللہ کا شریک ٹھیرایا۔
(فتوح الغیب مقالہ ہفتم)

ج وغم، درد والم میں اسی کو پکارتا ہے اسی سے امید ورجا رکھتا ہے اسی سے سکون وبرد قلبی حاصل کرتا ہے۔

مرا بیگانگی از خلق با حق آشنا کردہ　　بطبع من بکس کم ساختن بسیاری سازد!

مومن موحد کی اسی شان کو حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں: وبشر الصابرین الذین اذا
بابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون (پ ۲ ع ۳) یعنی "ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے
ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ
کے پاس جانے والے ہیں"۔ غور کرو یہاں "مصیبت" اسم نکرہ ہے اور "اذا" بھی عام ہے جس سے معلوم
ہے کہ وہ ہر مصیبت وآفت میں، ہر درد والم میں، ہر رنج وغم میں حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں، اسی
کارتے ہیں، اسی سے فریاد کرتے ہیں کہ "اللھم لک الحمد والیک المشتکی وبک المستغاث
المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ" "حق تعالیٰ آپ ہی کے لئے تمام تعریف سزاوار ہے،
آپ ہی کی طرف ہماری شکایت ہے اور آپ ہی سے فریاد ہے اور آپ ہی مددگار ہیں، ہمیں کوئی دوسرا
یا سکتا ہے اور نہ سوائے آپ کے کسی میں حرکت ہے نہ قوۃ!"

یارب ز تو یافت صورت آب وگلِ من　　الطاف تو شد پناہ جان ودلِ من

آسانی کار از تو بد حاصلِ من　　ہم از کرم تو حل شود مشکلِ من! (درد)

اسی آیت میں آگے صابرین کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی تفصیل فرما رہے ہیں: اولٰئک
علیہم صلوات من ربہم ورحمۃ واولٰئک ھم المھتدون یعنی "ان ہی لوگوں پر خاص خاص رحمتیں ہیں
کے پروردگار کی طرف سے اور عام رحمت بھی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ" اسی سے تضریحاً لازم
ہے جو مصیبت وغم کے وقت غیر اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور ان ہی کو اپنا
دا اور پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ نہ خاص رحمتوں کے لائق ہیں اور نہ عام رحمت کے مستحق اور نہ ہدایت کے
یعنی درد وغم میں غیر اللہ کی طرف شکایت لے جانے والے، ان ہی کو اپنی جان ودل کی پناہ
والے حق تعالیٰ کی نفرین کے لائق، غضب کے قابل اور ضلالت میں گرفتار ہیں! ذرا الفاظ کی

ثار موسوی ہے دیکھو مجمع الزوائد کتاب الادعیہ ص ۱۸۳ ج ۱۰ مطبع مصر ۱۳۵۳ھ

نزاکت پر بھی غور کرو، اولٰئک کے بعد ضمیر منفصل لائی گئی ہے اور ھم المھتدون فرمایا گیا ہے، علماء بیان کا اتفاق ہے کہ یہ ضمیر جہاں مبتدا و خبر میں آتی ہے مبتدا کو خبر میں منحصر کر دیتی ہے۔ اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہدایت سے وہی لوگ مختص ہیں جو وقتِ غم و ہنگام مصیبت حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں اور ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور جب ہدایت کا انحصار ان ہی پر ہوا تو ضلالت یا گمراہی ان کے غیر میں منحصر ہوئی! ذلک ھو الخسران المبین۔

انبیا علیہم الصلوٰة والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور بفحوائے اشد الناس بلاءً الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوئی ہیں) تو ان کا رخ حق تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا، ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے، ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم	اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ
تغفر لنا و ترحمنا لنکونن	ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو
من الخاسرین (پ ع ۹)	واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

یارب اگر از جہل خطا شد کارم — جاں از کرمت شاد بود بسیارم
زامیدِ تو بسکہ دل بود بیمارم — گویند کہ نیست از گنہ آزارم (درد)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے جور و ستم سے عاجز اور تنگ آکر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کی کہ

انی مغلوب فانتصر (پ ع ۸)	میں درماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجئے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تھکن، عجز و درماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور پکارا

رب انی لما انزلت الیّ من	اے میرے پروردگار جو نعمت بھی آپ مجھکو بھیجدیں
خیر فقیر (پ ع ۶)	میں اس کا حاجتمند ہوں۔

غم نالم واز در تو باغم نہ روم — جز شاد و امیدوار و خرم نہ روم
از درگہِ ہمچو تو کریمے ہرگز — نومید کسے نہ رفت و من ہم نہ روم (سرمد)

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم والم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی

انی مسنی الضر وانت — مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب

ارحم الراحمین (پ۱۷ع۶) — مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

یارب کرم تو گر نباشد مددم — خون جگر از دیدہ رود تا ابدم!

اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم واندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ

لا الہ الا انت سبحانک انی — (حق تعالیٰ) آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک

کنت من الظالمین (پ۱۷ع۶) — ہیں، میں بیشک قصوروار ہوں!!

یارب زکرم بہ بخش تقصیر مرا — مقبول بکن نالۂ شبگیر مرا

پیری وگناہ ماجرائیست عجیب — لطف تو کند چارۂ تدبیر مرا (سرمد)

اور حضرت یونسؑ ہی کے متعلق ارشاد ہے، فلولا انہ کان من المسبحین للبث

فی بطنہ الی یوم یبعثون (پ۲۳ع۹) یعنی اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی (مچھلی) کے پیٹ میں رہتے۔ دیکھو لبث کو لام تاکید سے مؤکد فرمایا گیا ہے اور مناطِ نجات تسبیحِ الٰہی کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ کسی نبی و ولی کے نام کا ختم پڑھنے، ان کو پکارنے اور اپنا درد و غم ان کے سامنے کھولنے کو!

قرآن کریم میں ایک جگہ (پ۸ع۱۲) حق تعالیٰ ہمیں جنتیوں کی حالت کی خبر دے رہے ہیں کہ جب وہ عالم شہادت، عالمِ برزخ اور عالمِ حشر کی ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں، آفتوں اور مشکلوں کو اٹھا کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے تو کہیں گے: الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ یعنی حق تعالیٰ ہماری ہدایت نہ کرتے تو اس مقام راحتِ ابدی تک ہماری رسائی کبھی نہ ہوتی! زندگی کے ہر قدم پر اور موت کے بعد ہر مرحلہ پر حق تعالیٰ ہی کا دستِ کرم ہماری تائید کرتا ہے اسی لئے نصیحت فرمائی: واعتصموا باللہ ھو مولٰکم فنعم المولیٰ ونعم النصیر (پ۱۷ع۱۰) یعنی حق تعالیٰ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارے کارساز ہیں کیسے اچھے کارساز ہیں اور کیسے اچھے مددگار!

اب انھیں چھوڑکر کسی اور کی طرف رخ کرنا بے شرمی نہیں تو کیا ہے!

اے آنکہ بقبلۂ بتاں روست ترا — بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا

دل در پے این و آں نہ نیکو ست ترا — یک دل داری بس است یکدوست ترا (جامی)

قرآن کریم کی ان تمام تصریحات کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ چند دعاؤں کو پیش کرکے واضح کرتے ہیں کہ رنج، غم وہم، آفت ومصیبت کے وقت سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو یاد نہ کرنا چاہیے، ان ہی کی توجہ کرنی چاہیے اور ان ہی کا نام زبان پر آنا چاہیے، اس کے بعد امتثالِ امر میں اسبابِ دنیویہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے چنانچہ مروی ہے اذا حزنہ امر فزع الی الصلوٰۃ (رواہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح وتہلیل تحمید وتقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔ ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے "یاحی یا قیوم برحمتک استغیث" اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے سبحان اللہ العظیم! جب دعا میں کوشش کرتے تو فرماتے: یاحی یا قیوم۔ آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے: اللھم رحمتک ارجوا فلا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین واصلح لی شانی کلہ لا الٰہ الا انت۔ عمیس کی صاحبزادی اسماء (جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں) کو فرمایا کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلادوں جو غم کے وقت کہا کرے؟ کہہ اللہ اللہ ربی لا اشرک بہٖ شیئًا (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابوامامہؓ تھا غیر وقت نماز مسجد میں دیکھکر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ قرض کے بار کے نیچے دبا جا رہا ہوں متفکر اور پریشان ہوں۔ فرمایا صبح وشام اس دعا کو پڑھا کرو: اللّٰھم انی اعوذ بک من الھم والحزن واعوذ بک من العجز والکسل واعوذ بک من الجبن والبخل واعوذ بک من غلبۃ الدین و قھر الرجال۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ من لزم الاستغفار جعل اللہ لہ من کل ھم فرجا ومن کل ضیق

اورزقہ من حیث لایحتسب یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع
ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک
(رواہ احمد وابو داؤد وابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل ٹوٹ پڑے
رے لاحول ولا قوۃ الا باللہ (کذافی المشکوۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اوذی نبی ما اوذیت[1] یعنی جتنی اذیت مجھے
تنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم
یا نوح نبینا، یا ابراھیم خلیل اللہ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو دفع
ہے جو فارج ھم ہے، کاشف غم ہے، جو مجیب دعوۃ المضطرین[2] ہے؟ حضرت ابن عباسؓ کو آپ نے
فرمائی تھی کہ: یاغلام احفظ اللہ یحفظک احفظ اللہ تجدہ تجاھک، واذا سألت فاسئل
واذا استعنت فاستعن باللہ واعلم أن الامۃ لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشئ لم ینفعوک الا بشئ کتبہ
لک ولو اجتمعوا علی ان یضروک بشئ لم یضروک الا بشئ قد کتبہ اللہ علیک رفعت
الاقلام وجفت الصحف (اخرجہ الترمذی عن ابن عباس) یعنی اے لڑکے اللہ کو یاد رکھ وہ تجھ کو یاد
۔ اللہ کو یاد رکھ کہ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، اور جب تو کچھ مانگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب
چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد وایاک نستعین) اور یہ یقین کرلے کہ اگر سب بندے
کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے
قدرت نہ پائیں گے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا، اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے
پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائیں گے، قلم اٹھائے
اور خشک ہو گئیں کتابیں" دیکھو اس حدیث میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن

---

[2] حدیث کے الفاظ ہیں۔ مصیبت زدہ یہ دعا پڑھے کرے: اللھم فارج الھم، کاشف الغم، مجیب دعوۃ
المضطرین، رحمٰن الدنیا ورحیمھا، انت ترحمنی، فارحمنی برحمۃ تغنینی بھا عن رحمۃ من سواک
(الحاکم وابن مردویہ عن ابی بکر صدیقؓ) [1] مشکوۃ باب فضل الفقر۔

غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سبھوں سے توڑ کر صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! اکفیٰ باللہ وکیلا!

از خدا خواہم وز غیر نخواہم بخدا کہ نیم بندۂ دیگر نہ خدائے دگرست!

یہ کہہ کر کہ ساری دنیا بھی تجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی (کیونکہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں) احتیاج کی ساری نسبتوں کو جو غیر اللہ کے ساتھ قائم کی جا سکتی ہیں، ایک ہی ضرب میں کاٹ دیا گیا ہے اور پھر یہ سنا کر کہ ساری دنیا بھی تجھے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں (کیونکہ وہ مکھی سے بھی کوئی شے چھین نہیں سکتی) غیر اللہ کے خوف کو سینے سے بالکل دور کر دیا گیا ہے اور اس طرح ہمیں خوف و حزن کی ان زنجیروں سے بالکل آزاد کر دیا گیا ہے جو غیر اللہ ہمارے جہل و شرک کی وجہ سے ہماری گردن میں ڈال سکتا تھا! اب میں توحید ہی کی بدولت آزادی و جرأت کے ساتھ بآواز بلند کہہ سکتا ہوں:

لو الثقلان الانس والجن اجمعوا یریدون ایلاما لاصغر نملۃ[1]
یکون لہا رب السموات ناصرا لما ظفروا منہا بادنی مضرۃ

کیا یہ آزادی، بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں، ان ہی کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسول کی اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

یسال احدکم ربہ حاجتہ کلہا حتی ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے
یسال الملح وحتی یسالہ شسع اپنے پروردگار ہی سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی
نعلہ اذا انقطع (اخرجہ الترمذی عن انسؓ) اسی سے مانگے اور جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنھیں افسوس ہے کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے، مصائب میں ان ہی کو پکارتی ہے، آفات کے دور کرنے کے لئے ان ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباسؓ کو جو اوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح الغیب کے

---

[1] اگر جن و انس دونوں جمع ہو کر چھوٹی سے چھوٹی چیونٹی کو دکھ پہنچانا چاہیں اور حق تعالیٰ ان کے ناصر و مددگار ہوں تو وہ اس کو ادنیٰ مضرت بھی نہیں پہنچا سکتے۔

ں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ: فیبنغی لکل مومن ان یجعل ھذا الحدیث
رآۃ لقلبہ وشعارہ ودثارہ وحدیثہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ وسکناتہ حتی یسلم فی الدنیا
لآخرۃ ویجد العزۃ فیھما برحمۃ اللہ تعالیٰ. یعنی "ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیثِ نبوی کو اپنے قلب
ے لئے آئینہ بنائے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی درشتی راستی وکجی
معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر جامہ بنالے اور ہر وقت کے لئے اس کو ایک
ن وحکایت ٹھیرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات وسکنات میں اس پر
ل کرے تاکہ دنیا وآخرت میں تمام آفات نفسی وآفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں
ان میں عزت پائے۔" [1]

شیخ جیلیؒ توحید کے آفتاب تھے، آپ کی کتاب مستطاب "فتوح الغیب" کی ہر سطر سے توحید
علیم مترشح ہوتی ہے اور سلسلہ عالیہ قادریہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے الفاظ میں "اتباعِ کتاب و
نت واجتناب از وقوع در مہاوی بدعت" کے سوا کچھ نہیں! اسی لئے محدث دہلویؒ آگے چل کر فرماتے
ں "پیر ما فرمود کہ در سلاسل دیگر از چیز ہائے دیگر پرسند اما دریں سلسلہ از شریعت زنہار کہ تا شریعت مطہرہ
مایت نہ کند از تو"!

ک فی العلم | مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزو سے ہم نے صفحاتِ بالا میں تفصیل سے بحث کی کہ یہ
ر اللہ کو مقرب، شفیع، نافع، وضار جان کر ان سے اپنی حاجت کے وقت فریاد رسی چاہتے تھے،
ر ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے؛ یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا، اگر ان ہی افعال
رتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائے گا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے
ع نہ ہوگی۔ دیکھو اس "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔ درد و مصیبت
وقت غیر اللہ کو پکارنے والا نہ صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس درد وغم کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں
لکہ اس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سن بھی

---

[1] فتوح الغیب مترجمہ شاہ عبدالحق دہلوی ص ۲۵۰۔

سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سننے اور مطلع ہونے کے وہ اس کی مدد کر کیسے سکتے ہیں؟ اس طرح وہ غیر اللہ کو علم غیب سے بھی متصف کرتا ہے حالانکہ علم غیب خصائصِ الٰہیہ سے ہے اور غیر اللہ سے قطعاً مسلوب! یہی اس کا "اشراک فی العلم" ہے! اور اس سے زیادہ ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ومن اضلُّ مِمّن یدعوا مِن دُونِ اللہ مَن لا یستجیب لہٗ الیٰ یَومِ القیامۃ وھم عن دعاءھم غافِلون (پ ۲۶ ع ۱)

"اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو"

یہ امر کہ علمِ غیب خاصۂ حق سبحانہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرانِ مبین میں نہایت صراحت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں پہلے چند اجمالی آیات پر غور کرو۔

(۱) وَلِلّٰہِ غیبُ السموات وَ الارض والیہ یُرجع الامر کلّہ۔ (پ ۱۲ ع ۱۰)
اور آسمانوں اور زمینوں میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے۔

اسی مفہوم کو نفیاً اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُل لا یَعلمُ مَن فِی السّمٰوٰتِ وَالاَرضِ الغیب الا اللّٰہ وما یَشعُرُونَ ایّانَ یُبعثون (پ ۲۰ ع ۱)
آپ کہدیجئے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود ہے کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور ان کو یہ خبر نہیں کہ کب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے"

(۲) لہٗ غَیبُ السّمٰوٰتِ والاَرضِ ابصر بہٖ واسمع (پ ۱۵ ع ۱۶)
تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا کچھ سننے والا ہے۔

(۳) فقل انما الغیب لِلّٰہِ (پ ۱۱ ع ۷)
آپ فرما دیجئے کہ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں غیر اللہ سے علمِ غیب کی مطلق نفی کی جا رہی ہے۔

(۴) وعِندَہٗ مَفَاتِحُ الغَیبِ لا یَعلَمُھا الّا ھُو (پ ۷ ع ۱۳)
اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام مخفی اشیاء کی، نہیں جانتا ہے انھیں لیکن وہی۔

خود آنحضرت صلعم نے غیب کی کنجیوں کی تفسیر ان پانچ چیزوں سے فرمائی جن کا ذکر صراحت سے سورہ لقمان میں آیا ہے

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ — بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا
يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي — ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے۔ اور کوئی
الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ — شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا۔ اور کوئی
مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي — شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔
نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ — بیشک اللہ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے۔
اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (پ ۲۱ ع ۱۳)

جتنے حوادثِ کونیہ اور وقائع غیبیہ ہیں سب ان پانچ میں داخل ہیں۔ (۱) حوادثِ سماویہ کو "انزالِ غیب" میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے۔ (۲) حوادثِ ارضی "علم مافی الارحام" میں داخل ہیں اور (۳) حوادثِ حیات کا تعلق لازماً "ماذا تکسب غداً" سے ہوگا اور (۴) حوادثِ موت وما بعدِ موت ظاہر ہے کہ "ماتدری نفس بایِّ ارض تموت" میں شامل ہیں۔ جب ان تمام حوادث وامور غیبیہ کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے اور کسی فردِ بشر کو عطا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی حادثۂ غیب کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اور جب (۵) علمِ قیامت کسی نبی کو نہیں حالانکہ سب اس کی خبر دینے میں متفق ہیں۔ تو اور حوادثِ آتیہ کا علم بدرجہ اولیٰ ان کو نہ ہوگا۔ غرض جب ان پانچ کا علم کسی کو نہ ہوا تو اور چیزوں کا علم بدرجہ اولیٰ نہ ہوا، اسی لئے ان کو "مفاتحِ غیب" کہا گیا ہے، گویا جملہ امور غیبیہ ان کے اندر ہیں اور یہ تمام خزائنِ غیب کی کنجیاں ہیں اور جب خزانہ کی کنجی ہی کسی کو نہ ملے تو اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں مل سکتا

(۵) وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ — اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام
اللّٰهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا — خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور
أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ (پ ۱۲ ع ۳) — نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں"۔

(۶) قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا — آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی
ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ — نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا

اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ — کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں
مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ — بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ — نہ ہوتی۔ میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں
لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ — ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔ (پ ۹ ع ۱۳)

یعنی میں ایک بندہ ناتوان ہوں اپنے لئے جلب نفع و دفع ضرر کی قوت نہیں رکھتا مگر جو میر
مالک چاہے نفع و دفع سے، پھر اس بیان کو اس طرح موکد کیا جا رہا ہے کہ اگر میں غیب کو جانتا تو جو
بات بھلائی اور نفع کی ہوتی اس کو اپنے لئے حاصل کرتا اور جو بات بری اور نقصان کی ہوتی اس سے دو
رہتا تاکہ وہ برائی مجھے نہ لگے، لیکن میں تو ایک بندہ عاجز ہوں، میں کیا جانوں کہ میرے رب میرے مالک
کے علم میں میرے لئے اچھا کیا ہے اور برا کیا، میرے حق میں اس کا حکم کیا ہے اور کونسی چیز میرے لئے مقدر
کر رکھی ہے، جب مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تو پھر کسی اور بات کا معلوم ہونا کیسا! یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بطور تواضع و ادب نہیں فرما رہے ہیں بلکہ بطریق اعتقادِ قلبی پیش فرما رہے ہیں کیونکہ علم غیب حق تعالیٰ ہی کی
خصوصیت خاصہ ہے عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احداً (پ ۲۹ ع ۱۲) سے صاف طور پر اس کی وضاحت
ہو رہی ہے اور اوپر جو آیات پیش کی گئیں وہ اس کی تائید کر رہی ہیں، ہر قسم کے اشتباہ و مغالطہ کو رفع کر رہی ہیں
اب رہے معجزات تو جیسے ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کر دی ہے وہ مخصص ہیں اس
قضیہ عمومی سے اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (پ ۲۹ ع ۱۲) یعنی جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کسی نبی یا رسول
کو بذریعہ وحی کسی غیب پر مطلع کر دیتے ہیں۔ انبیاء سے علمِ غیب کی نفی عقائد اسلام میں داخل ہے اور
کافہ اہلِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ عقائد خود انبیاء علیہم السلام کے تعلیم کردہ ہیں۔ لہٰذا انبیاء سے علم غیب
کی نفی کرنے میں ان کی کسی طرح تحقیر نہیں ہوتی، ایسا سمجھنے والا مجنون ہے، کتاب و سنت سے جاہل
دیکھو سورۂ نمل میں حق تعالیٰ ہدہد کا قول نقل فرما رہے ہیں " اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ " یعنی ہدہد حضرت
سلیمان علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ " میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو
معلوم نہیں ہوئی " اس آیت کو سن کر کوئی ہدہد کا بچہ بھی ایسی بیوقوفی نہ کرے گا کہ انبیاء و اولیاء کو

علمِ غیب سے متصف سمجھکر دور دور سے استعانت کے لئے پکارے اور سمجھے کہ وہ اس کے پکارنے کو سُن لیتے ہیں، آدمی کے بچے کا تو کیا ذکر ہے!

اب ذرا چند ان حدیثوں کو بھی سن لو جن سے غیر اللہ سے علمِ غیب کی کلی نفی ہوتی ہے اور حق تعالیٰ ہی سے یہ مختص کیا جاتا ہے۔

(۱) واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم[1]	یعنی باوجودیکہ میں خدا کا نبی ہوں پھر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے
(۲) عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت من اخبرک ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الخمس التی قال اللہ تعالیٰ ان اللہ عندہ علم الساعۃ فقد اعظم الفریۃ[2]	حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جو تجھ سے یہ کہے کہ آنحضرتؐ وہ پانچ باتیں جانتے تھے جن کا اللہ نے ذکر کیا ہے (آخر سورہ لقمان) تو اس نے بڑا طوفان باندھا۔
(۳) عن الربیع بنت معوذ بن عفراء قالت جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدخل حین بنی علی فجلس علی فراشی کمجلسک منی فجعلت جویریات لنا یضربن بالدف ویندبن من قتل من آبائی یوم بدر اذ قالت احداھن وفینا نبی یعلم ما فی غد فقال دعی ھذہ وقولی بالذی کنت تقولین[3]	ربیع بنت معوذ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم میرے مکان میں تشریف لائے جب میری شادی ہوری تھی پھر میرے پاس مسند پر بیٹھ گئے۔ ہماری کچھ لڑکیاں گانے لگیں دف بجا کر اور ہمارے ان بزرگوں کا ذکر کرنے لگیں جو بدر میں مارے گئے تھے ان میں سے ایک کہنے لگی کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کہو بلکہ جو پہلے کہہ رہی تھی وہی کہے جا"

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی بزرگ ترین اور کامل ترین ہستی اپنی ذاتِ مقدس سے علمِ غیب کی نفی فرما رہی ہے، پھر آپ کی امت سے کسی کی یہ مجال کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ

---

[1] اخرجہ البخاری عن ام العلاء۔ [2] بخاری [3] بخاری۔

علم غیب کی اپنی جانب نسبت کرے، امور غیبیہ کا علم بذاتہ کسی انسان کو حاصل نہیں، وہ مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کی ذات کے لئے، انما الغیب للہ کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو یا ولی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ خود وہ کل کیا کرے گا: وما تدری نفس ماذا تکسب غدا۔

حدیث اول کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناقض ہے آیۂ کریمہ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر کے اور نیز منافی اس آیت کے ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ۔ اس لئے یہ حدیث منسوخ ہے اور گر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا ایسا فرمانا محض خوف و خشیت الٰہی کے لحاظ سے تھا نہ کہ واقعہ کے لحاظ سے۔

عینی نے اس حدیث کی تشریح میں بتلایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس قول سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات سے علم غیب کی نفی فرمانا چاہتے ہیں اور صاف طور پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ ہرگز غیب پر مطلع نہیں، نہ اپنی تقدیر سے واقف ہیں نہ کسی اور کی تقدیر سے، نہ اپنے پوشیدہ کاموں سے واقف ہیں نہ غیر کے۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی نجات کا بھی یقین نہیں رکھتے اس لئے کہ یہ امر تو بہت ساری دوسری حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اور آیاتِ قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، لہٰذا اس حدیث کو کسی آیت کا معارض قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ رہا احتمالِ نسخ وہ بھی دو وجوہ سے درست نہیں: (۱) نسخ کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ تاخر ناسخ کا معلوم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہاں تقدم حدیث کا اور تاخر آیت کا معلوم نہیں۔ (۲) نسخ احکام میں جاری ہوتا ہے[۱] اخبار میں جاری نہیں ہوتا، اخبار میں نسخ کا حکم لگانا گویا شارع پر کذب کی تہمت لگانی ہے۔[۱]

دوسری حدیث تو آیت قرآنی ہی کی ترجمان ہے۔ اس کا انکار قرآن مبین کا انکار ہے۔ یہاں حجت یہ تراشی جاتی ہے کہ علم غیب کے اقسام میں امتیاز کیا جانا چاہئے۔ ایک علم غیب مطلق ہے دوسرے علم غیب اضافی، غیب مطلق یا غیب حقیقی کا تو علم حق تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے لیکن غیب اضافی کے علم کی نسبت

---

[۱] دیکھو تحریر ابن ہمام ج ۳ ص ۵۵ مطبوعہ مصر ۱۳۱۶ھ

انبیار واولیار کی طرف کی جاسکتی ہے۔

دیکھو غیبِ اضافی کے معنی تو یہی ہوئے کہ یہ بعض پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض پر پوشیدہ رہتا ہے؛ مثال کے طور پر لذتِ جماع کو لو یہ رجولیت والے پر غیب نہیں، نامرد یا عنین کے لئے غیب ہے الوان پر غور کرو، یہ مادرزاد اندھے کے لئے غیب ہیں لیکن آنکھوں والے کے لئے غیب نہیں، یہی حال آوازوں کا ہے، سننے والے کے لئے یہ غیب نہیں مادرزاد بہرے کے لئے ضرور غیب ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کا حال حیدرآباد والوں پر غیب نہیں، بریلی والوں کے لئے غیب ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیبِ اضافی کے جاننے میں کچھ اولیار وانبیار کی تخصیص نہیں۔ لذتِ جماع جو عنین کے لئے غیب ہے اس کو ہر مرد خواہ وہ کافر ہو یا مومن جانتا ہے، اسی طرح آوازوں کو ہر کان والا خواہ وہ نیک ہو یا بد جانتا ہے اور یہ مادرزاد بہرے کے لئے غیب ہیں۔ انبیار واولیار کو جو وقائع یا حوادث حق تعالیٰ بذریعہ وحی والہام بتلادیتے ہیں وہ ضرور ان کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے بغیر خبر دینے کے یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتے اور حق تعالیٰ نے اس بات کی خبر نہیں دی کہ زمین وآسمان میں جتنے حوادث وواقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں ان کی اطلاع کسی نبی یا ولی کو اس نے دے رکھی ہے۔ لہٰذا ان سب کا علم کلی عمومی کسی نبی یا ولی کے لئے کرنا محض بے دلیل ہے اور آیاتِ قرآنیہ کا صریح انکار، اور اس امر کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انبیار کی وحی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، شیطان کے تصرف سے یہ قطعاً محفوظ ہے۔ لیکن الہام میں عصمت شرط نہیں، الہام کبھی شیطانی ہوتا ہے اور کبھی رحمانی، اسی لئے اولیار کرام الہام پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق نہ ہو۔

تیسری حدیث کی تاویل میں مرضیاتی ذہنیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جمیع علوم موجود ہیں اور ان سب کا علم رسول کو ہونا ضروری ہے ورنہ جہل لازم آئے گا اور جہل منافی شانِ رسول ہے، یہاں ایک کھلا مغالطہ ہے۔ قرآن میں جمیع علوم کے موجود ہونے سے مراد جمیع علوم دینیہ کے سوا کچھ نہیں، ان علوم کا تعلق سعادتِ انسانی سے ہوتا ہے جس کے حصول کا انسان مکلف ہے۔ قرآن کریم میں نہ ملائکہ کی جملہ تعداد موجود ہے نہ

ذراتِ زمین کے اعداد اور نہ نجوم کی گنتی۔ نہ انجیرنگ کی تفصیلات اور نہ حیوانات، مصریات، کی کلی توضیحات! نہ ان چیزوں کا کتابِ الٰہی میں ہونا ضروری ہے اور نہ ہم ان کے حصول پر مامور ہیں اور نہ رسول پر اُن کی تبلیغ ضروری اور نہ ان سے جہل منافی شانِ رسول! خود حق تعالیٰ نے اس امر کی توضیح کردی ہے کہ بہت سی باتوں کا ہم نے قرآن میں ذکر نہیں کیا مثلاً: ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک[1] (پ ۲۴ ع ۱۴) یعنی بہت سے رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں کیا!

بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا یہ کہنا کہ دعی ھذہ وقولی بالذی کنت تقولین۔ محض اس بات پر دلالت کرتا ہے آپ کو ان لڑکیوں کی باتوں کے سننے کا اشتیاق تھا جو وہ شہدائے بدر کے متعلق کہہ رہی تھیں، علمِ غیب کا انکار کرنا مقصود نہ تھا۔

اس توجیہ میں بالکل اسی قسم کی ہوشمندی و ذہانت سے کام لیا گیا ہے جو ہمیں اس احمق میں ملتی ہے جس کی ٹانگ میں تیر لگا تھا اور خون بہہ رہا تھا وہ اور اس کی عورت دونوں خون پونچھ رہے تھے اور احمق عقل کا دشمن برابر کہے جارہا تھا کہ خدا کرے تیر نہ لگا ہو! حضور انور صلعم تو ان لڑکیوں کی اتنی بات سن کر کہ ہم میں ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات جانتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ بات چھوڑ دو اور اپنا پہلا قصہ جاری رکھو۔ اور اس کی تاویل یوں کی جارہی ہے کہ علم غیب کا انکار مقصود نہیں! "کل کی بات جاننے کی" نفی تو قضیہ کلیہ کے طور پر خود قرآن مبین میں حق تعالیٰ فرمارہے ہیں: وما تدری نفس ماذا تکسب غداً۔ یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا! اب اس صریح تردید کے بعد تاویل کا کونسا دروازہ کھلا رہتا ہے
ع ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال کی تصدیق ان احوال و واقعات سے بھی کرلو جو آپ کی زندگی میں رونما ہوئے۔ ان میں سے صرف تین کا یہاں ذکر کافی ہوگا۔

---

[1] ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

(۱) واقعۂ افک: آپ کی محبوبہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر لوگوں نے تہمت لگائی، آپ کو سخت صدمہ ہوا، آپ نے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی، اکابر صحابہؓ سے مشورے کئے، لیکن حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا، آپ کے غم و حزن میں اضافہ ہوا اور تیس دن اسی حال میں گذر گئے! بالآخر حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا کہ عائشہ صدیقہؓ اس تہمت سے پاک ہیں۔

(۲) واقعہ بیر معونہ: اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور انور صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ چند لوگ میرے ساتھ کر دیں جو میری قوم کو دین کی تبلیغ کریں اگر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔ آپ نے اس کی بات کو صحیح جان کر ستر صحابہ جلیل القدر اس کے ہمراہ کر دیئے۔ راستہ ہی میں اس غدار کی بیوفا قوم نے ان بزرگوں کو شہید کر دیا! جب حضور اکرمؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو نہایت رنج ہوا، اور ایک مہینے تک قاتلین کے حق میں صبح کی نماز میں آپ نے بددعا فرمائی!

(۳) سورۂ تحریم کی شان نزول۔ حضور انورؐ کو شہد نہایت مرغوب تھا، آپ حضرت زینبؓ کے ہاں تشریف لیجا کر شہد نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ آپ کا حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ ٹھہرنا کم ہو جائے، سوچ بچار کے بعد بات یہ ٹھہری کہ ہم میں سے جس کے پاس پہلے آپ کی تشریف آوری ہو وہ آپ سے کہے کہ آپ کے منہ سے تو مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ کے قلب مبارک میں یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ جو شہد آپ نوش فرماتے ہیں شاید ان مکھیوں کا ہو جو مغافیر پر بیٹھی ہوں۔ چونکہ بدبو سے آپ کو نفرت ہے اس لئے شہد پینا ترک فرما دیں گے اور اس طرح حضرت زینبؓ کے پاس کی نشست کم ہو جائے گی۔ ان بیویوں کی یہ بات چل گئی اور حضور انورؐ نے قسم کھالی کہ اب شہد کبھی نہ پیوں گا![1]

جس بات کی قرآن مبین نے صاف صریح الفاظ میں وضاحت کی، جس بات کو رسول اکرم صلعم نے خوب کھول کر بیان کیا، جس بات کی تائید آپ کی زندگی کے مختلف و متعدد واقعات سے ہوتی ہے

[1] یہ تینوں واقعات صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

وہ صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ ہی عالم غیب ہیں ان کے سوا مخلوقات میں کوئی ہستی عالم غیب نہیں ان ہی کے علم عطا فرمانے پر انبیاء و اولیاء کو غیب کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے، یہ ان کی اختیاری چیز نہیں کہ جب چاہا معلوم کر لیا، یہ حق تعالیٰ ہی کا اختیاری فعل ہے کہ جب چاہا اور جتنا چاہا کسی نبی و رسول کو بذریعہ وحی غیب پر مطلع کر دیا! اسی بات کو حضرت سعدیؒ نے اپنے مشہور اشعار میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ میں اس طرح ادا کر دیا ہے ؎

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیرِ خردمند!
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی — چرا در چاہِ کنعانش ندیدی!
بگفتا حالِ من برق جہاں است — دمے پیدا و دیگر دم نہانست!
گہی بر طارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم!
اگر درویش بر حالے بماندی — دو دست از ہر دو عالم برفشاندی

اشراک فی التصرف اور اشراک فی العلم کو اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ندا و صدا کی مندرجہ ذیل تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں کیونکہ یہ کفر و شرک کی طرف منجر ہوتی ہیں۔

(۱) درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدہ کے تحت پکارنا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندائے درد کو سُن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کر سکتے ہیں۔ یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے۔ تمام فقہاء نے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے۔

(۲) اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ان کو پکارنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (ا) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنئے، میری بلا کو ٹال دیجئے، میری حاجت کو روا کیجئے" یہ استغاثہ و استعانت دعا اور طلبِ حاجت ہے خواہ قریب سے کی جائے یا دور سے، اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعا کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔

(ii) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ اللہ میری بلا کو ٹال دے

ور میری حاجت کو روا کرے" یہ قطعاً بدعت ہے، قرونِ مشہود لہا بالخیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔ امام ابو حنیفہؒ
نے ایک شخص کو دیکھا کہ صالحین کی قبروں پر آ کر کہہ رہا ہے کہ "هل لکم من خبر وهل عندکم من اثر
انی اتیتکم ونادیتکم من شهور ولیس سوالی منکم الا الدعا، فهل دریتم ام غفلتم" اے اہلِ قبور
کیا تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا
ہوں ؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لئے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم
غافل ہو میرے حال سے"۔ یہ سن کر امام اعظمؒ نے اس شخص سے پوچھا" هل اجابوا لك؟ کیا انھوں نے تجھ کو
کوئی جواب دیا" اس نے کہا" نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا" سحقا لك وتربت یداك کیف
تکلم اجسادا لا یستطیعون جوابا ولا یملکون شیئا ولا یسمعون صوتا" یعنی" پھٹکار ہو تجھ پر، خاک آلود
ہوں تیرے دونوں ہاتھ! ایسے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شے
کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سن سکتے! پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:" وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ"
یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں" آپ ان لوگوں کو جو قبر میں ہیں کچھ نہیں سنا سکتے"۔[1]

امام اعظمؒ کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:۔

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر آ کر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں
پر جو عادی ہے جو اہلِ قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں! اگر آپ کو ان جہال کا حال معلوم ہوتا جو اہلِ قبور
سے رزق، صحت و اولاد مانگتے ہیں اور ان کو مستقل یا غیر مستقل طور پر اس پر قادر جانتے ہیں تو یقیناً ان کو
مشرک د کافر و ملعون قرار دیتے اور گردن مارنے کا حکم دیتے!

(۲) مردے نہ سن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا ٹالنا، مصیبتوں کا دور کرنا
ان سے کیا ہو سکتا ہے! اور جب یہ نزدیک سے سن نہیں سکتے تو دور کی کب سنیں گے؟ محققین حنفیہ سماع
موتیٰ کے قائل نہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگانِ بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس کی توجیہ
مختلف طریقوں سے کی گئی۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ:۔

---

[1] غرائب فی تحقیق المذاہب۔

یہ آپ کا معجزہ تھا، حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفارِ موتی کو سنادی تھی، چنانچہ کفایہ میں ہے
ومن اجوبتھم انہ لوصح فذالک معجزۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کافی شرح وافی میں صراحت
کی گئی ہے کہ والمقصود من الکلام الافہام وذا بالاسماع وذا لا یتحقق بعد الموت یعنی مقصود
کلام سے افہام ہے اور یہ السماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور السماع موت کے بعد محقق نہیں" اسی طرح
عینی شرح ہدایہ میں: قولہ لان المقصود من الکلام الانہام ای افہامہ فلانًا والموت ینا فیہ
ای ینافی الکلام الا سماع والمیت لیس باھل السماع الا تری الی قولہ تعالیٰ انک لا تسمع الموتی
والی قولہ تعالیٰ وما انت بمسمع من فی القبور۔

شرح مواقف[1] میں تصریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت وارادہ، سمع بصر میت کے لیے ثابت کرنا
فرقہ صالحیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے:" الصالحیۃ اصحاب الصالحی ومن مذھبھم جوز
قیام العلم والقدرۃ والارادہ والسمع والبصر بالمیت ویلزمھم جواز ان یکون الناس مع اتصافھم
بھذہ الصفات امواتا وان لا یکون الباری تعالیٰ حیا" یعنی صالحیہ گروہ ہے صالحی کا اور مذہب ان کا
یہ ہے کہ انھوں نے میت کے لئے علم و قدرت وارادہ و سمع و بصر کو جائز قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی
رو سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہ سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ
نہیں!" اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گور پرست مشائخ اسی فرقۂ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں
نعوذ باللہ من ذلک۔

غرض جب مردے سن نہیں سکتے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے کافروں کی تشبیہ عدم سمع میں
مردوں سے دی اور اثباتِ سمع عقیدہ ہے صالحیہ مفسدین کا جو معتزلہ کا گروہ ہے تو پھر قبروں کے پاس جاکر
مردوں کو پکارنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بے عقل پتھر کو پکارے اور اس
سے دعا کی خواہش کرے! یہ فعل کسی پاگل سے تو صادر ہو سکتا ہے عاقل و ہوشمند سے کیسے ممکن ہے
عموماً ایسے ہی پاگل مردوں کو قبروں میں نہ صرف زندہ اور توانا سمجھتے ہیں بلکہ ان کو حق تعالیٰ کے بل

---

[1] شرح مواقف تذئیل فی ذکر فرق بعد موقف سادس ص ۵۰۰، مطبوعہ نولکشور

اپنا شفیع اور مقرب بھی جانتے ہیں، اسی لئے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں یعنی ان کے سامنے ذلیل وخوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں اور ان کا طواف بھی کرتے ہیں اور کفر وشرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں! ذلك هو الخسران المبين!

یہاں غلط فہمی کے رفع کرنے کے لئے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دور سے درود بھیجتا ہے اس کو آپ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپ اس کو نہیں سنتے! البتہ بزرگانِ دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایاتِ مرفوعہ میں بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سنتے ہیں۔ چنانچہ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا ابلغتہ[1]" یعنی جو درود بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہِ راست نہیں سنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا!!

اسی طرح ابنِ حجر مکی نے شرح ہمزیہ میں ذکر فرمایا ہے: "اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعاً حقیقیاً ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعید لا یسمعہ الا بواسطۃ" یدل علیہ احادیث کثیرۃ" یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپ پر درود وسلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو حقیقت میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ اور اگر کوئی دور سے آپ پر درود وسلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو نہیں سنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں[2]) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔"

اسی چیز کو شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں یوں تصریح کی ہے: سخن دراں ماندکہ

---

[1] مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصل ثالث۔ [2] ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبداللہ بن مسعود سے رواہ النسائی وابو حاتم فی صحیحہ)

این فضیلت رد سلام از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بزائراں قبر شریف اوست صلی اللہ علیہ وسلم مثل داخل در مجلس کہ سلام گوید یا عام است بر ہر کسی را کہ سلام فرستد چنانکہ در تشہد وغیراں، وظاہر ہمیں است الا آنکہ سلام زائراں بنفس شریف خود بے واسطہ سماع فرمایند در و سلام نمایند و دیگراں بواسطہ ملائکہ یا چنین بود۔ [1]

خوب سمجھ لو کہ یہ امر یعنی رد و بلوغ سلام وغیرہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے آیا ہے، باقی رہے اور انبیا اگرچہ حیات و صلوٰۃ ان کی قبر میں مسلم ہے مگر تبلیغ سلام و رد جواب کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ المومن وقاف۔

بیانِ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ندائے بعید کو نبی ہو یا ولی کوئی نہیں سنتا اور ندائے قریب کا سننا مخصوص ہے انبیاء کے لئے، کسی ولی یا غوث و قطب کو یہ امر نصیب نہیں!

ہماری اس تصریح کے خلاف بعض کم عقل ضعیف احادیث کو پیش کرتے ہیں، اپنی ضعفِ عقلی اور کتاب و سنت سے عدم مزاولت کی وجہ [2] سے ان احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دعوے کرتے ہیں کہ انبیا و اولیا ندائے بعید کو بھی سن سکتے ہیں، نہ صرف سن سکتے ہیں بلکہ ہماری مدد بھی کر سکتے ہیں لہذا ہمیں پکارنا چاہئے، یا محمداہ، یا غوث، یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی، یا شاذلی ہماری مدد کرو۔ اس میں انھیں نہ اشراک فی العلم کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے اور نہ اشراک فی التصرف کا! انا للہ وانا الیہ راجعون!

ذرا ان کی پیش کردہ احادیث پر غور کرو۔ ابن سنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں، عبداللہ بن عمرؓ کے پیر میں چیونٹیاں بھر گئی تھیں ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین شخص کو پکاریئے۔ انھوں نے یا محمداہ پکارا اور کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ یہی حال عبداللہ عمرو بن العاصؓ کا ہوا۔ انھوں نے یا محمد کا نعرہ مارا اور ایسے ہو گئے جیسے پیر سے بندھی رسی کھل گئی ہو"

یہ حدیث حصن حصین میں ان الفاظ میں ہے: واذا خدرت رجلہ فلیذکر احب الناس الیہ اس کو موقوفاً ابن سنی نے نقل کیا ہے اور ظفر جلیل میں تحت الفائدہ یہ لکھا ہے کہ "یاد کرے محبوب کو تاکہ حاصل ہو خوشی۔ پس کہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب سے زیادہ محبوب ہیں"

---

[1] شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱۹ باب فضل الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم طبع کلکتہ ۱۲۵۳ھ۔ [2] اور اس وجہ سے کہ ان کا علم فروغ مذاہب پر منحصر ہے۔

علمارحق نے اس حدیث کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) یہ حدیث مرفوع نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو بلکہ موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں خصوصاً جس وقت کہ صدہا آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے خلاف اور معارض ہو! چنانچہ علمائے اصول نے تصریح کردی ہے کہ قول الصحابی لیس بحجۃ یعنی صحابی کا قول حجت نہیں۔

(۲) اس حدیث کو اگر تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے سُن ہوجانے کے وقت کسی محبوب کو یاد کرنا چاہئے، یاد کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور خون جوش میں آتا ہے اور نتیجہ کے طور خدر دور ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دوائے طبی اور عملِ حکمت ہے اور ادویہ طبیہ واعمال حکمت کو دین میں کیا دخل؟ اطبانے اس امر کی تصریح کی ہے کہ خدر کا سبب اخلاطِ بلغمیہ وریاحات غلیظہ ہیں، خوشی و فرحت سے خون میں جوش ہوتا ہے اور ریاح تحلیل ہوجاتی ہیں۔ دوست کا یاد کرنا خوشی پیدا کرتا ہے خوشی خون میں تغیر پیدا کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مرض رفع ہوتا ہے، اس سلسلہ علت و معلول کا تعلق نہ ندائے بعید کے سننے سے نظر آتا ہے نہ اولیا، وانبیار کی اعانت، مدد کو!

مزید تحقیق سے مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ نظر آتے ہیں۔

(۳) اس حدیث کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم کسی نبی سے تو کیا صحابی سے بھی نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی کے پیر سُن ہوگئے تو کسی نے کہا کہ تم اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معلم کوئی مجہول شخص ہے اور تعلیم مجہول حجت نہیں۔ چنانچہ نووی نے اذکار میں جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن الهيثم بن حنش قال كنا عند عبد الله بن عمر فخدرت رجله فقال له رجل اذكر احب الناس اليك فقال يا محمد صلى الله عليك وسلم فكانما نشط من عقال" یعنی ہم عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں تھے، ان کا پیر سن ہوگیا، ایک شخص نے کہا کہ یاد کرو احب الناس کو تو انھوں نے کہا کہ اے محمد رحمت کرے خدا آپ پر اور سلام نازل کرے، سو اسی وقت ان کا پیر کھل گیا جیسے اونٹ رسی سے کھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے

کہ اس روایت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نسخہ کا بتلانے والا کون تھا۔

(۴) اس سلسلہ میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم یاد کرنے کے صحیح معنی کا تعین کریں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یاد کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے :-

(i) ایک وہ جس کا ثبوت شریعت میں ملتا ہے وہ یہ کہ آپ کے فضائل صحیحہ جو احادیث اور قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں ہم ان کا تذکرہ کریں جو مصائب اور آفات آپ نے ہماری ہدایت اور رہبری کی خاطر اٹھائی ہیں ان کو یاد کریں، آپ کے خصائل محمودہ، اخلاق حمیدہ، عادات پسندیدہ کا چرچا کریں۔

(ii) دوسرا طریقہ جو قطعاً خلاف شرع ہے یہ ہے کہ آپ کو دور سے پکاریں، ندا دیں، مدد مانگیں استغاثہ کریں، یہ موہم شرک ہے اور قطعاً ناجائز، اس روایت سے تذکیر یا یاد کرنے کے معنی خلافِ شرع مراد لینا مشرکانہ ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ موحد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آپ پر درود بھیج کر کرتا ہے جو حق تعالیٰ کا تعلیم کردہ طریقہ ہے، آپ کی احادیث کا چرچا کرتا ہے جو نزولِ رحمت کا باعث ہے۔

(۵) دیکھو بعض روایتوں میں لفظ یا مذکور ہی نہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ندا ضروری نہیں اور تذکیر بغیر ندا کے ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہد کی روایت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ عن مجاھد فقال خدرت رجل رجل عند ابن عباسؓ، فقال ابن عباس اذکر احب الناس الیک فقال محمد صلی اللہ علیہ وسلم فذھب خدرہ، یعنی مجاہد سے روایت ہے کہ ابنِ عباسؓ کے پاس ایک شخص کا پیر سن ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، اس نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم" اس کا خدر جاتا رہا۔

اور خطاب جو مقرون بصلوٰۃ ہو وہ شرعاً جائز بھی ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ درود کے پہنچانے کے لئے ملائکہ مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ درود کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی ہے یا پھر شوق و محبت میں پکارا جا سکتا ہے اس میں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ منضم نہیں ہوتا جو صریحاً شرک ہے۔

(۶) آخر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آثار نہ قولی ہیں نہ فعلی کہ ان کی تعمیم کی جائے اور ان سے یہ ثابت کیا جائے کہ ہر تکلیف یا مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے، نیز یہ امر سلف کے

ت بھی نہیں کہ وہ مصیبت کے وقت ایسا کیا کرتے تھے! اور نہ یہ کسی مجتہد مسلم الاجتہاد کا مذہب ہے
مصیبت کے وقت 'احب الناس' کو یاد کیا جائے تاکہ مشکل حل ہوجائے آفت ٹل جائے اور مصیبت
ہوجائے۔ اس کے برخلاف ہم نے اوپر قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مصیبت کے وقت
نے حق تعالیٰ ہی کو پکارا، ان ہی سے اعانت چاہی اور غیر اللہ کا اس سلسلہ میں خیال بھی نہ آنے دیا
ر بلند کہا ؎

ایں بسکہ دلم جز تو ندارد کامے　　تو خواہ بدہ کام دلم خواہ مدہ[1]!

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد چاہنی سما گئی ہے اور یہ طبیعتوں میں رچ گئی ہے
یک دوسری حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں: "حصن حصین میں حضرتؐ سے مروی ہے کہ آپ
س شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعینونی یا عباد اللہ اے بندگانِ خدا تم
مدد کرو" اس حدیث سے استناد کرکے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہِ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں اعینونی
اداللہ! یا غوث! یا خواجہ یا نقشبند یا بدوی یا شاذلی" ہماری مدد کرو!

حصن حصین کے الفاظ یہ ہیں: ان ارادعونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی
داللہ اعینونی (رواہ الطبرانی) اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر علماء حق نے جو تنقید کی ہ
خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے
ہی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے[2] اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہ
ثین اور اہلِ اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوان ہے وہ مجہول الحال ہے یعنی اس کا

بامی ہو کا پہلا شعر یہ ہے [1] یا من ملکوت کل شی بیدہ - طوبیٰ لمن ارتضاک ذخرا لغدہ
[2] ن بریدہؓ اور ابنِ مسعودؓ کے درمیان۔

تقویٰ اور عدل معلوم نہیں، چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بنا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائق استدلال!

(۴) جرح سے قطع نظر کرکے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کرلیں تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لئے معین و مقرر ہیں، چنانچہ فیض القدیر شرح جامع الصغیر[1] میں اس کی یوں توضیح کی گئی ہے

ان للہ ملائکۃ فی الارض یسمون الحفظۃ یکتبون ما یقع فی الارض من ورق الشجرۃ فاذا اصاب احدکم حرجۃ واحتاج الی عون بفلاۃ من الارض فلیقل اعینونی عباد اللہ رحمکم اللہ فانہ ان شاء اللہ یعان (رواہ ابن السنی والطبرانی من حدیث الحسن بن عمر عن معروف ابن حسان[2] عن سعید ابن ابی عروبۃ عن ابی بریدہ عن ابن مسعود. قال ابن حجر حدیث غریب ومعروف قالوا منکر الحدیث وقد تضرو بہ وفیہ انقطاع بین ابی بریدہ وابن مسعودؓ) یعنی اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں مقرر ہیں جن کو حفظہ اور نگہبان کہتے ہیں جو درخت کا پتہ زمین پر گرتا ہے اس کو لکھا کرتے ہیں تو جب ہم میں سے کسی کو تکلیف پہنچے اور مدد کا محتاج ہو زمین کے کسی صاف میدان میں تو اس کو چاہیئے کہ یوں کہے کہ اے خدا کے بندو میری مدد کرو، اللہ تم پر رحم فرمائے، ایسے کہنے سے بیشک مدد حاصل ہوگی"۔

دیکھو عباد اللہ سے مراد فرشتوں کا ہونا خود حدیث ہی سے ثابت ہے جو زندہ ہیں، اب اہلِ استمداد کا اموات کو اپنی مدد کے لئے پکارنا ان کی مشرکانہ طبیعت کی ایجاد ہے، حدیث سے اس کی اجازت کہاں نکلتی ہے۔ ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ قرآنِ کریم نے مخلوق سے استعانت ان امور میں جائز رکھی ہے جو ان کی قوت و قدرت کے احاطہ میں ہوں، یہ استعانت بالمربوبیت یا عون ما بین العباد ہے۔ جب کسی کا گھوڑا بھاگ جائے یا کوئی چیز کھو جائے تو اس معاملہ میں ادنیٰ لوگوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس امر میں مخلوق سے استعانت کرسکتے ہیں اس میں ملائکہ، ابدال اور جنوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ زندہ مخلوق سے ان امور میں استعانت کرنا ہے جو ان کے دائرہ قدرت میں شامل ہے۔ اب رہی

---

[1] فیض القدیر ج ۱ ص ۳۰۷ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ [2] منکر الحدیث (میزان ذہبی)

استعانت جو حق تعالیٰ سے مخصوص ہے، استعانت بالربوبیت وہ کسی طرح اس حدیث سے ثابت
ں ہو سکتی اور نہ کسی ذی علم و ذی ہوش نے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعانت
ن الاموات کا یہاں تو شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۵) بغرض محال ہم مان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اس سے بات بھی وہی ثابت
تی ہے جو اہل استمداد سمجھتے ہیں! دعا و استعانت کے متعلق اوپر جو تصریحات پیش کی گئیں ان کو پیش نظر
کر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث جو خبر واحد ہے قرآن مبین کے معارض و مخالف ہے اور اسی وجہ
ے رد کر دی جانی چاہیے کیونکہ قرآن مقدم ہے، اس کا تقدم اس کی قطعیت اس کے متواتر النظم
نے اور اس کی سند کا شبہ سے آزاد ہونے پر مبنی ہے۔

(۶) اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حصن حصین میں ملتی ہے جس کو
نی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے: اذا اضاع لہ شیئاً او ابق فلیقل: اللّٰھم راد الضالۃ
دی الضالۃ انت تھدی من الضلالۃ لتارد علی ضالتی لقدرتک وسلطانک فانھا من عطائک
ضلک یعنی "جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اس کا غلام بھاگ جائے تو یوں دعا کرے: اے خدا
یر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے
ا میرے پاس میری گم ہوئی چیز کو اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان ہے۔"

علاوہ بریں ابن عباس رضؓ سے جو حدیث مروی اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس میں
ت طور پر حکم دیا گیا ہے فاذا استعنت فاستعن باللہ یہ معارض و مخالف ہے حدیث اعینونی
ور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباس موافق ہے فحوائے کلام مجید کے لہٰذا اس کو دوسری حدیث
یح ہونی چاہیے۔

(باقی آئندہ)

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ

اور

مقدمہ ترجمۃ القرآن

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

علمی دنیا میں شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا نام آفتاب عالمتاب کی طرح مشہور ہے اور ان کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ نے ان کے درجۂ امامت اور مرتبۂ قیادت کو بلا اختلاف علماءِ امت سے تسلیم کرالیا ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی علمی خدمات میں حجۃ اللہ البالغہ سے بھی زیادہ دقیع تالیف قرآنِ حکیم کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت منصۂ شہود پر آیا جب علمی دنیا میں یہ بحث جاری تھی کہ کلام اللہ کا ترجمہ درست بھی ہے یا نہیں۔

بظاہر اگرچہ یہ مسئلہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا اور علماء کی تنگ نظری کا آئینہ دار نظر آتا ہے لیکن حقیقتِ حال تک پہنچنے کے بعد معاملہ سطحی نظر سے بہت بلند نظر آتا ہے۔

درحقیقت اس بحث یا اس مسئلہ کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ کسی بھی زبان کا ترجمہ اس زبان کے مکمل مفہوم و معنی کا ترجمان ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ماہرین علم السنہ کا یہ بیان ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ "ادائے حقیقت و روحِ مفہوم کے اعتبار سے" ناممکن ہے۔ تقریبی مفہوم ادا ہو جائے یہ ممکن، لیکن حقیقتِ مفہوم و معنی ادا ہو جائے یہ ناممکن۔ علماءِ اسلام کہتے ہیں کہ مثلاً "الرحمن الرحیم" کا ترجمہ لغاتِ عربیہ میں دونوں اسماءِ صفات کے خصوصی امتیازات کو دیکھنے کے بعد بھی فارسی یا ترکی یا اردو وغیرہ میں اس طرح نہیں کیا جا سکتا جس سے اس جملہ کی حقیقی روح ادا ہو جائے

علمارِ اسلام ہی اس مسئلہ میں منفرد نہیں ہیں بلکہ علمار زمانہ میں بھی محققین میں سے ایک
جماعت کا یہی دعویٰ ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں حقیقی نہیں تقریبی ترجمہ ہو سکتا ہے۔

پس جب انسانی بول چال کی تراکیب و عبارات کا ترجمہ باہم مختلف زبانوں میں ناممکن
نہیں تو سخت ترین شکل سمجھا گیا ہے تو علمارِ اسلام کی ایک جماعت کا اگر یہ خیال رہا ہو کہ کلام الٰہی اور
حدِ اعجاز سے بھی بالاتر عربی کلام کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ناممکن ہے اور اس لئے انھوں نے ترجمہ
کی ممانعت کا فیصلہ کیا ہو تو یہ بات مضحکہ خیز یا تنگ نظری کیسے کہلائی جا سکتی ہے؟

غالباً یہی وجہ ہے کہ علمار امت میں سے ایک مختصر اور چھوٹی سی جماعت کا یہ فیصلہ ہے
قرآن فہمی کے بقدر عربی زبان کی معرفت ہر ایک فردِ مسلم کے لئے "فرض عین" ہے۔

البتہ ان علمار امت نے اس حقیقتِ ثابتہ کی جانب متوجہ ہونے سے گریز فرمایا کہ قرآنِ
حکیم کی دعوت ملکِ عرب ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر ایک گوشے کے لئے یکساں
دعوتِ عام ہے "تبارك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعلمين نذيرا" اور ظاہر ہے کہ
الدین یسر کے پیشِ نظر کل کائنات جن و بشر اس کے لئے مکلف نہیں ہو سکتی کہ ہر ایک فرد بشر
عربی زبان کا عالم ضرور ہو اور فرضِ کفایہ، فرضِ عین کی صورت اختیار کرلے۔

نیز یہ کہ اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ عربی زبان کی معرفت ہر فرد مسلم کے لئے ضروری ہے
تب بھی قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا دائرہ محدود ہو کر رہ جاتا اور غیر مسلم تک اس کی حقیقی آواز کا پہنچنا ناممکن
اور دشوار تر ہو جاتا ہے کیونکہ غیر مسلم تو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عربی زبان کو سیکھے اور پڑھے۔ اس لئے
از بس ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو تا کہ اس کی دعوت "دعوتِ عام" اور
عالمگیر دعوت" عملی شکل اختیار کرلے، بیشک یہ بھی لازم ہے کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل نظم قرآنی
باقی رہے۔

اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کسی زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں حقیقی روح اور مکمل مفہوم کے
ساتھ نہیں ہو سکتا تاہم اس حد تک ضرور ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے کہ نفسِ مفہوم و مراد سمجھ میں آجائے

اور معنی و مراد میں تغیر و تبدل واقع نہ ہو چنانچہ مذہبی اور دینی تراجم کے علاوہ اسی اصول پر علوم
فنون کا اہم ذخیرہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو کر اپنی مسلمہ افادیت کیلئے شاہد عدل
زیر بحث مسئلہ کی حقیقت کا یہی رخ روشن ہے جس کی نقاب کشائی "ولی اللہ دہلوی"
مقدس ہاتھوں نے اس وقت کی جب سب سے بڑی مسلم مملکت ٹرکی کے علماء کے مابین ہنوز
مسئلہ غیر منفصل مباحث کی صورت میں تھا اور خود ہندوستان میں بھی "ترجمۃ القرآن" کا علمی پہ
نمایاں اور روشن نہیں تھا۔

حضرات اہل علم اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہیں کہ شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہ
پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کر لی تھی اور مطالعۂ کتب اور مہارت کاملہ
حصول میں اسی وقت سے سرگرم عمل تھے۔ ابھی حج بیت اللہ کا عزم نہیں ہوا تھا کہ امام امت
قرآن حکیم کے ترجمہ کا ارادہ فرمایا، چونکہ اس زمانہ میں حکومت کی سرکاری زبان "فارسی" تھی اور اکثر
ذخیرۂ علوم دینیہ فارسی زبان ہی میں رائج تھا اس لئے شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان ہی کو ترجمہ
کے لئے انتخاب فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ ۱۱۴۳ھ میں عازم حج بیت اللہ ہوئے۔ اس وقت
سورۂ آل عمران تک ترجمہ پہنچ چکا تھا۔ چند سال حرمین الشریفین میں علوم حدیثیہ و قرآنیہ کے مطالعہ
و حصول میں گذارنے کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے اور ۱۱۵۱ھ میں ترجمہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا
اور اس کا نام فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن تجویز فرمایا۔

یہ ترجمہ صرف ترجمہ نہیں ہے بلکہ ترجمہ کے رنگ میں مختصر تفسیر اور حقائق و عجائب قرآن
عدیم النظیر ذخیرہ ہے۔

چنانچہ اردو زبان کا مایۂ ناز اور مستند ترجمہ جو حضرت شاہ عبد القادرؒ کے قلم حکمت رقم کا
تحریر ہے بھی فتح الرحمٰن کے استفادہ سے خالی نہیں ہے بلکہ اس کی اساس پر زیر قلم آیا ہے اور آج
بھی اہل علم کی نگاہ میں یہ فارسی ترجمہ "مدار" اور "مرجع" کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ قرآن فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن

"فتح الرحمن" حضرت شاہ صاحبؒ کی وہ مشہور علمی خدمت ہے جو اپنے تعارف میں کسی
…وش قلم کی محتاج نہیں ہے اور اس لئے میں بھی اس کے اور اس کی خصوصیات کے متعلق کچھ زیادہ
…نہیں چاہتا مگر بہت کم اہلِ علم ہیں جن کے علم و خبر میں یہ بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ
…قرآنِ حکیم کا ترجمہ شروع کرنے سے قبل چند صفحات کا ایک مقدمہ بھی تصنیف فرمایا ہے۔

اس مقدمہ کا نام "مقدمہ فی قوانین الترجمہ" ہے اور جلی قلم سے درمیانی سائز کے تقریباً بارہ
…فحات پر مشتمل ہے۔ نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر یہ مقدمہ ترجمہ کے ساتھ شائع نہ ہوسکا اور آج تک
…ی مخطوطات میں شامل ہے۔

اس مقدمہ کے پڑھنے سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اگر ایک
…انب اس راہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں کہ قرآن حکیم کے ترجمہ میں کونسا اسلوب اختیار کرنا
…ہے تو دوسری جانب یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے اس مبحث اور اس مسئلہ میں شمع ہدایت
…کھانا اور قولِ فیصل دینا چاہتے ہیں جس کا ذکر سطورِ بالا میں ہو چکا ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں
…ہ جس طرح دینِ اسلام خود راہِ وسط اور افراط و تفریط کے درمیان کی مستقیم راہ ہے۔ اسی طرح
…رآنِ حکیم کے ترجمہ سے متعلق بھی یہی راہِ وسط صحیح راہ ہے۔ یہاں نہ انکار و ممانعت کی گنجائش ہے
…ور نہ آزادروی کی بالکل صحیح راہ ان دونوں کے درمیان ہے "ان ھذا صراطی مستقیما"

ہم کو یہ مقدمہ اپنے ایک محب صادق کے ذریعہ حاصل ہوا ہے جن کو مخطوطاتِ علمی کا
…بے حد ذوق ہے اور جو خود بھی اہلِ علم اور اہلِ مطالعہ حضرات میں سے ہیں۔

یہ رسالہ اغلاط سے پُر ہے بلکہ بعض جگہ عبارات کا تسلسل تک مفقود ہے مگر ان باتوں کے
…وجود افادیت کا حامل ہے اور قرآن حکیم کے ترجمہ سے متعلق اصول و قوانین کے لئے بہترین
…مشعلِ ہدایت اور باوجود اختصار کے اہم نکات و حقائق سے پُر داماں ہے اس لئے اربابِ ذوق
…قرآنی کی خاطر یہی مناسب معلوم ہوا کہ بعجلت برہان کے ذریعہ اس کو روشناس کرایا جائے اور
…ِ اصل رسالہ کو کتابت کے نقائص و معائب کے باوجود منصۂ شہود پر لے آیا جائے اور ساتھ ہی اس کا ایسا ترجمہ بھی
…پیش کردیا جائے جو لفظی پابندیوں سے آزاد اس کے مفہوم و مراد کو پوری طرح آغوش میں لئے ہو۔ اس کے بعد انشاء اللہ جلدی
…ی نقل … کا مقابلہ کر کے سہو ترجمہ اور مختصر نوٹوں کے ساتھ مستقل رسالہ کی شکل میں پیش کیا جائیگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ واہب العطیات ملہم الحکم والخیات والصلوٰۃ والسلام الاتمان علی سیدنا المحجۃ معلم اہل المدر والوبر مبین الکتاب بفصل الخطاب وعلی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین اما بعد فیقول الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبد الرحیم ایں رسالہ ایست در قوانین ترجمہ مسماۃ بالمقدمہ فی قوانین الترجمہ کہ وقت تسوید ترجمہ قرآن قلم بضبط آں جاری شد واللہ الهادی الی الحق۔

فصل مترجمین در ترجمہ نویسی طرق مختلفہ دارند بعضی زیر ہر کلمہ ترجمہ آں نویسند و انتقال کنند بکلمہ دیگر و ترجمہ آں نیز نویسند وعلی ہذا القیاس کردہ میروند تا آں کلام آخر شود و آنرا ترجمہ تحت اللفظ گویند و جمعی کلام تام را تامل کنند و تقدیم و تاخیر در مجاز و کنایہ لشناسند و معنی آں در ذہن خود محصل نمایند پس بہر لغتی کہ خواہند آں معنی محصل را ادا نمایند و ایں را بیان حاصل المعنی گویند در طریق اول خللے ہست زیرا کہ بسیار است کہ نظم ترجمہ مختل شود و ترکیبی پیدا آید کہ در لغت ترجمہ آنرا صحت نباشد ولا اقل رکاکت و تعقید و ارتکاب قلیلہ لازم شود و سبب آں اختلاف لغات است

خدائے کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہؒ بن عبد الرحیمؒ کہتا ہے "قرآن کریم کے ترجمہ کے اصول و قواعد میں یہ ایک رسالہ ہے جس کا نام "المقدمہ فی قوانین الترجمہ" ہے، یہ اسوقت ضبطِ قلم میں آیا جب میں ترجمہ قرآنِ حکیم کا مسودہ کر رہا تھا" واللہ الہادی الی الحق"

فصل۔ کسی بھی زبان کے ترجمہ سے متعلق ترجمہ کرنے والوں کی راہیں مختلف نظر آتی ہیں۔ بعض کا طریق یہ ہے کہ وہ جدا جدا ہر ایک کلمہ کا ترجمہ کرتے جاتے اور تا آخر مضمون تک اسی کے پابند رہتے ہیں کہ ہر ایک کلمہ کا ترجمہ تحت اللفظ رہے اور اس کو "لفظی ترجمہ" کہتے ہیں اور مترجمین کی دوسری جماعت پسندیدہ اسلاف ہے کہ وہ اول پورے کلام میں غور و تامل سے کام لیتے، "مجاز" و "کنایہ" میں تقدیم و تاخیر

در تقدیم بعض اجزاءِ کلام بر بعض ودر تالیف کلمات و استعمال کنایات واطلاق صلات ودر بعض لغات انتقال از لازم بملزوم وآں استعارہ لفظی بجائے لفظے صحیح نباشد ودر لغت دیگر اصلاً صحیح نبود در عربی گویند فلاں عظیم الرماد وآنرا بسخاوت انتقال کنند واگر در فارسی فلاں بزرگ خاکستر ست فارسیاں بآں معنی انتقال نمایند ودر لغت عربیہ گاہی خصوصیتی

کی معرفت چاہئے، اور اس ترتیب کے ساتھ عبارت کے معنی کو ذہن نشین کرتے ہیں۔ بعد ازاں اپنی صوابدید پر ان معانی کو موزوں اور مناسب الفاظ اور بندش کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اور اس ترجمہ کو "بیان حاصل معنی" (آزاد ترجمہ یا معنوی ترجمہ) کہا جاتا ہے۔ لیکن ترجمہ کا طریقِ اول نقص وخلل سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ لفظی ترجمہ میں اکثر وبیشتر ترجمہ کا نظم درہم وبرہم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اصل مضمون میں ایسی ترکیب ہوتی ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے لغت میں اس ترکیب کا ترجمہ صحیح طور پر ناممکن ہوتا ہے اور کم از کم کلام میں رکاکت، تعقید (گنجلک) اور اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے ارتکابات تو ضرور ہی پیش آجاتے ہیں، اور اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں بعض اجزار کلام کی بعض پر تقدیم کا اسلوب قطعاً الگ الگ ہے، اور کلمات کی ترکیب، کنایات کے استعمال اور صلات کے اطلاق میں بھی جدا جدا نہج پائے جاتے ہیں۔ نیز بعض زبانوں میں لازم سے ملزوم کی جانب یا ملزوم سے لازم کی جانب منتقل ہونا اور ایک خاص لفظ کا دوسرے خاص لفظ کو استعارہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور دوسری زبان میں اصل وحقیقت کے لحاظ سے ہی وہ لفظ (اس جگہ) درست نہیں بیٹھتا مثلاً عربی زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص "عظیم الرماد" ہے اور یہ کہہ کر اس شخص کی "سخاوت" مراد لیتے اور اس مفہوم میں منتقل کرلیتے ہیں، پس اگر فارسی زبان داں اس کا ترجمہ "بزرگ خاکستر" کرکے معنی "سخاوت" کو ادا کرنا چاہیں تو یہ قطعاً نادرست ہوگا۔ اسی طرح

لہ بہت راکھ رکھنے والا۔ عظیم الرماد یا کثیر الرماد۔

ملحوظ باشد کہ در فارسیہ کلمہ باں خصوصیتی یافتہ نشود مانند رعار الابل وخوار البقر وصہال الفرس ونواح التیس ویعار المعز ونہق الحمار ونباح الکلب وہدیر الحمام و مانند جرو الکلب وجرالفشا شبل الاسد وفصیل الابل وجدی البقر وعناق الشاۃ در لغت فارسیہ لفظے کہ بازائے ایں خصوصیات مستعمل نباشد بے تکلف یافتہ نمی شود وہمچنیں در اصلہ افعال اختلاف بسیار واقع است الی غیر ذلک ممالا یخفی علی المتفطن اللبیب ودر طریق ثانی نیز خللے ہست بسا است کہ کلام محتمل دو وجہ باشد مترجم متفطن نشود بگر توجہی کہ مراد متکلم واگر حقیقت امر برسی اکثر تحریف در کتب سابقہ

عربی زبان میں ایک ہی لغت کے لئے ایسی خصوصیات ملحوظ ہوتی ہیں جن کا فارسی زبان میں فقدان ہے مثلاً حیوانات کی آوازوں کے لئے عربی زبان میں یہ امتیازات ہیں۔ رعار الابل، (اونٹ کا بلبلانا) خوار البقر (گائے بیل کا رینکنا) صہال الفرس (گھوڑے کا ہنہنانا) ثواج التیس (مینڈھے کا بولنا) یعار المعز (بکری کا میں میں کرنا) نہق الحمار (گدھے کا ہینچنا) نباح الکلب (کتے کا بھونکنا) ہدیر الحمام (کبوتر کا غٹرغوں کرنا) اور اسی طرح جرو الکلب (کتے کا پلا) شبل الاسد (شیر کا بچہ) فصیل الابل (اونٹ کا بچہ) جدی البقر (گائے کا بچھڑا) عناق الشاۃ (بکری کا بچہ)

اور فارسی لغات میں چونکہ ان خصوصیات وامتیازات کے لئے علیحدہ علیحدہ لغات مستعمل نہیں ہیں اس لئے ان عربی لغات کے ترجمہ میں جدا جدا خصوصی اور امتیازی لغت بے تکلف حاصل نہیں ہو سکتے۔ پھر ان اختلافات کے علاوہ اصل افعال میں بھی بہت سا اختلاف موجود ہے غرض اس قسم کے اختلافات ہیں جو مختلف زبانوں اور لغتوں میں پائے جاتے ہیں اور ایک عاقل وذہین انسان پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہے۔

دوسرا طریقہ بھی خلل وفساد سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ اکثر وبیشتر یہ ہوتا ہے کہ کلام میں دو مستقل وجوہ کی گنجایش ہے اور مترجم اس درجہ حاذق اور ماہر نہیں ہے کہ ان ہر دو وجوہ میں سے متکلم کی مراد کو پا سکے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ مترجم مرادِ متکلم کے خلاف ترجمہ کردے گا اور اگر

ازیں سبب راہ یافت۔ پس لازم در ترجمہ کلام الٰہی بقاء آں نظم است کہ اگر مترجم را در بعض مواضع لغزشی پدید آمدہ باشد من بعد کسی تدارک آں نماید، فرب مبلغ اوعی لہ من سامع ودر توجیہ مواضع مشکلہ وتاویل منشار ابہامات وامثال آں علمار مذاہب مختلفہ دارند واگر بنظر تحقیق بنگری ایں ہمہ مذاہب اصل شرع نیست بلکہ نوعی از موشگافیست در شرع باستعانۃ عقل پس اگر ہر یکے حسب فہم تاویل میکردو آں نظم باقی نمی ماند اصل شرع کم می شود نیز چوں قرآں بلغت عرب نازل شدہ وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ لغتِ عرب سخنی فرمودہ اند امراست بدون معرفت لغت عرب مستقیم نشود پس برامت مرحومہ معرفت لغت عرب واجب

حقیقت امر پوچھتے ہو تو کتب سابقہ میں تحریف نے اکثر اسی سبب سے راہ پائی ہے۔ پس کلام الٰہی کے ترجمہ میں یہ ازبس ضروری ہے کہ کتاب الٰہی کا نظم بحالہ باقی رہے (یعنی کلام الٰہی کے ترجمہ میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل کلامِ الٰہی کا مکتوب ہونا فرض ولازم ہے تاکہ تحریف سے محفوظ رہے) اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر اصل "نظم کلام" باقی ہے اور مترجم سے بعض مواقع میں لغزش ہوگئی ہے تو دوسرا شخص بفحوائے حدیث "فرب مبلغ اوعیٰ لہ من سامع پس بسا وہ شخص جس تک بات پہنچائی گئی ہے براہِ راست سننے والے کے مقابلہ میں اس بات کو محفوظ رکھنے اور اس کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ محافظ و آب ہوتا ہے"۔ اس غلطی کا تدارک کر سکتا ہے پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مشکل مواقع اور ابہامات و مجملات کے منشار کی توجیہ اور اسی قسم کے دوسرے امور میں علمارِ اسلام مختلف مسلک رکھتے ہیں اور اگر بہ نظرِ تحقیق دیکھا جائے تو علمار کے یہ تمام مسلک "اصل شرع" نہیں ہیں بلکہ عقل وخرد کی استعانت سے شرع کے مسائل میں ایک قسم کی موشگافی ہے پس اگر ہر ایک عالم اپنے فہم وتدبر کے مطابق توجیہ بیان کرے اور "اصل نظمِ کلام الٰہی" باقی نہ رہے تو اصل شرع میں کمی آتی چلی جائے گی۔

نیز چونکہ قرآن عظیم لغت عرب پر نازل ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی

بالکفایہ شد و ہر کسے را معرفت آں مسنون و مندوب آنکہ بہ لغت عربی آشنا نیست، باعتبار معرفت دین محمدی اور ادر عداد زندگانی نتواں شمرد و در حساب مردہاں نتواں آورد ملحق بجمادات و داخل در عداد اموات و عجزی بر خود لازم کردہ است کہ شرع آنرا مرحوم نکرد و ہوائے بر خود تجویز نمودہ است کہ شرع آنرا سر بلند نہ ساخت ولہذا در تلاوت قرآن و ذکر خدا تعالیٰ و خطبہ عید و جمعہ لغتِ فارسیہ جائز نداشتند ہر چند مقصود ازیں تدبر و احفاظ است نہ خصوصیت الفاظ پس مقصو اہم از ترجمۂ قرآن عظیم آنست کہ خوانندہ را اندر نے حاصل شود در معرفت

لغت عرب ہی میں گفتگو فرمائی ہے۔ پھر امتِ مرحومہ کا معاملہ (دینی و دنیوی) لغتِ عرب کی معرفت کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے امتِ مرحومہ پر لغتِ عرب کی معرفت واجب بالکفایہ ہوئی اور ہر فرد مسلم کے لئے اس کی معرفت مسنون و مستحب قرار پائی۔

جو شخص لغتِ عرب سے ناآشنا ہے دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کے پیشِ نظر اس شخص کا شمار زندہ انسانوں میں بلکہ انسانوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو جمادات کی طرح سمجھا جاتا اور اس کا مردوں میں شمار ہوتا ہے، اس نے خود پر اس عجز کو لازم کر لیا ہے کہ شرع نے اس کو رحمت سے محروم رکھا اور اپنے لئے اپنی خواہشِ نفس سے یہ تجویز کر لیا ہے کہ شرع نے اس کو سربلندی نہ بخشی

بہرحال لغتِ عرب کی معرفت کا لزوم ہی اس حقیقت کا سبب بنا کہ تلاوت قرآنِ عظیم ذکرِ خدائے برتر، اور خطبۂ عید و جمعہ میں لغتِ فارسی کو جائز نہیں رکھتے۔ اگرچہ ان امور کا مقصد تحصیل عبرت و بصیرت اور پند و نصیحت ہے خصوصیتِ الفاظ نہیں تھے۔ پس قرآنِ عظیم کے ترجمہ کا اہم مقصد یہ ٹھیرا کہ پڑھنے والے کو نظمِ قرآن کی معرفت میں "ندرت" اور کلام اللہ کی عبارت میں غور و خوض سے "ملکہ" حاصل ہو تا کہ اس کی بدولت وہ قرآنِ عظیم کے فوائد عالیہ تک پہنچ سکے اور یہ معنی ترجمہ کے اس دوسرے طریق "بیان حاصل معنی" میں مفقود ہیں۔

آن و ملکہ بدست آید از خوض در عبارت آں و ایں معنی در بیان حاصل المعنی مفقود است
ین خلل ہر دو وجہ ملاحظہ نمودند جمع کردند در ترجمۂ تحت اللفظ و تقریر حاصل معنی تا اگر تعقید
لتے در تحت اللفظ حاصل شدہ باشد متدارک گردد بکلام دیگر کہ تقریر مدعا نماید بغیر تعقید
لتے و اگر در تقریر معنی باختیار احد الوجہیں یا بتاویل متشابہ خلل راہ یافتہ باشد باطلاق تحت
علاج آں کردہ و ایں طریق نیز بر مذاق اصحاب ذوق سلیم بشاعتے دارد تشویش بمتدی میدہد
را بکار نمی آید و تطویل لازمش میشود و سخن از نسق طبیعی خود بر می آید و اگر نیک بنگاف منشار

پھر ایک جماعت نے ان دونوں راہوں سے جدا ایک تیسری راہ اختیار کرلی۔ انھوں
ب دیکھا کہ مسطورہ بالا دونوں اسالیب میں خلل اور نقص پایا جاتا ہے تو ان دونوں کو ملا دیا
ب سے دوسری وجہ کا جبر نقصان ہو کر مطلب و مقصد حاصل ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے
ی ترجمہ" اور "بیان حصول معنی" دونوں کو اپنا لیا تاکہ جس وقت تحت اللفظ ترجمہ کی وجہ سے
(گنجلک) اور رکاکت پیدا ہو جائے تو دوسرے طریق یعنی مفہوم و مراد کے بیان و تقریر کے
س کا تدارک کر دیا جائے اور اگر جملہ اور عبارت میں موجود دو وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کو
ہ کی کسی خاص توجیہ کو اختیار کر کے مفہوم و مراد بیان کرنے میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے
کا علاج تحت اللفظ ترجمہ سے کر دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسرا طریقہ بھی اصحاب ذوق سلیم کے مذاق کو قطعاً خلاف اور معیوب ہے
طریقہ بتدی کے لئے تشویش کا باعث اور منتہی کے لئے بے کار اور غیر مفید نیز تطویل لاطائل
ب ہے اور اس طرح کلام اپنے نسقِ طبعی سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور اگر اس طریقہ کے اختیار کرنے کی حقیقت تک رسائی مقصود ہے تو صاف بات
ہ اس طریقِ کار کے اختیار کرنے کا مقصد ہر دو لغات و زبان کے رسم کلام سے درماندگی اور
ہے (یعنی وہ ترجمہ کی زبان اور عربی زبان دونوں کے رسم کلام اور فروقِ لغات کے

آں عجز است وجہل از رسمِ تکلم ہر دو لغت ایں فقیر چوں بریں طرقِ ثلاثہ مطلع شد و خللے کہ درمیان
آنہاست ملاحظہ نمود حریص شد بر اختراع طریقِ رابع کہ جامع باشد میان منافع طرق ثلاثہ و خالی
بود از خلل آنہا ترجمہ تحت اللفظ را بیک دست گرفت و خللہا را یاد داشت و تصرف در فنون آں
منظور نظر نمود و بیانِ حاصل معنی را بدست دست دیگر گرفت د مواضع صعوبہ فہم مراد و طریق مخلص
از آنہا بسہولت ادراک اضبط کرد پس نخست بترجمہ تحت اللفظ مقید شد بہماں نظم کہ در قرآن مذکور
است و اختلاف صلات فعل را بر خود ہموار نمود و در آنجا کہ تعقید و رکاکت آں ترجمہ فارسیہ

فہم سے عاجز و درماندہ ہونے کی وجہ سے بہ طویل راہ اختیار کرنے پر مجبور رہے)۔

غرض ترجمہ کے لئے یہ تینوں طریقے خلل و فساد اور نقص و عیب سے خالی نہیں ہیں
یہ فقیر جب ان ہر سہ طریق پر مطلع ہوا اور ان میں جو خلل و فساد پایا جاتا ہے اس کو دیکھا تو جی
چاہا کہ ان راہوں سے جدا ایک چوتھی راہ ایسی پیدا کی جائے کہ جس میں مسطورہ بالا ہر سہ طرق کے
فوائد کے لئے جامع ہو اور ان میں جو خلل و فساد کی صورتیں ہیں ان سے محفوظ ہو چنانچہ میں نے
ایک ہاتھ میں تو ترجمہ لفظی لیا اور ساتھ ہی اس کے مفاسد کو بھی پیشِ نظر رکھا اور اس سلسلہ میں مختلف
طریقہائے تصرف کو زیر نظر لایا اور بیان حاصل معنی (حاصل ترجمہ) کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور فہمِ
مراد کے مشکل موقعوں کو اور بسہولت ان سے رستگاری کے طریقوں کو منضبط کیا اور یہ سب کچھ
پیشِ نظر رکھنے کے بعد ترجمہ کی داغ بیل اس طرح ڈالی کہ اول اس طرح لفظی ترجمہ کیا کہ نظمِ
قرآنی کے ساتھ پوری طرح مطابقت قائم رہے اور ساتھ ہی لحاظ رکھا کہ افعال کے صلات کا
جو اختلاف ہے اس کو اپنے فہم سے درست کیا جائے اور جس جس مقام پر فارسی کے ترجمہ لفظی میں
رکاکت اور تعقید و گنجلک لازم آ گئی یا لغتِ عربی میں ایسی ترکیب واقع ہوئی ہے کہ اس کے
نظیر لغتِ فارسی میں نہیں پائی جاتی ہے تو ان مواقع میں عربی زبان ہی سے ایسے مرادف الفاظ
و کلمات کے ذریعہ ترجمہ کر دیا ہے جو اصل کی قائم مقامی کر سکیں۔ مثلاً اسم فاعل استقبال کے لئے

لازم آمد یا در لغت عربیہ ترکیبی واقع شدہ است کہ نظیر آں در لغات فارسیہ یافتہ نمی شود حرف مساوی آں از حروف عرب بجائے او اقامت نمودہ ترجمہ آں نوشت مثلاً اسم فاعل برائے استقبال باشد حرف مساوی او فعل مستقبل معلوم است و اسم مفعول کہ برائے استقبال باشد حرف مساوی او فعل مستقبل مجہول است مثلاً قل یا ایہا المومنون یا ھؤلاء المومنین در یک حالست فما لھم من ناصرین فما لھم من ناصر بیک نسق است زیرا کہ از ناصرین این جا عموم جموع مراد نیست بلکہ افراد است، لہذا در دین ما رخصت حاصل شد در قرأت قرآن بہفت حرف وصحابہ تفسیر لفظی بحرف موافق تجویز نمودند و بلاحظہ تقدیم ما حقہ التقدیم وتاخیر ما حقہ التاخیر و اظہار مقدر و ترک مفخم وتبئین نحو از دست ندا دند اگر صعوبۃ فہم مراد لازم آید مہما امکن قصد نمود کہ بادنی تصرفے از تقدیم وتاخیر و زیادۃ حرفی یا اظہار مقدری یا اعادہ عامل

آتا ہے تو فعل مستقبل معلوم اس کا مساوی ہوتا ہے نیز اسم مفعول جو استقبال کے لئے لایا جاتا ہے تو اس کا مساوی فعل مستقبل مجہول ہوتا ہے جیسا کہ قل یا ایہا المومنون یا ھؤلاء المومنین بلحاظ معنی ایک حال میں ہیں (یعنی اے ایمان والو! یا اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو) دونوں جملے ہم معنی ہیں۔ اور اسی طرح .... فما لھم من ناصرین اور فما لھم من ناصر دونوں کا ایک ہی نسق ہے اس لئے کہ اس جگہ ناصرین سے عموم جمع مراد نہیں بلکہ افراد مراد ہیں (یس ناصر اور ناصرین ہم معنی ہوئے)۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے دین حقہ میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ ہم سات حروف (لغات عرب) میں سے جس حرف (لغۃ) میں چاہیں قرآن حکیم کی قرارت کر سکتے ہیں اسی بناپر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تفسیر لفظی موافق لغت کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ میں نے ترجمۂ قرآن حکیم میں اس بات کو بھی بلحوظ خاطر رکھا ہے کہ جس لفظ یا جملہ کا حق مقدم یا موخر ہونے کا ہو وہ مقدم و موخر ہی رہے اور یہ کہ مقدرات کو ظاہر کر دیا جائے اور ترخیم کا ترک اور تبئین

بر سر معطوف یا با اظہار مضمری و اضمار مظہری آں صعوبت را حل نمود و اگر طبیعت کلام ازیں تص
ابا می کند بعد ادائے ترجمہ لفظ حاصل معنیٰ را بلفظ یا مراد آنست معلم نمودہ مذکور کرد و اگر ذکر قید
یا مجمل کلامے یا حل کنایتے یا کشف تعریفی یا تسمیہ مبہمی ضرورست آنرا نیز بلفظ یعنی مراد آنست
معلم نمود خواندہ۔ سعادتمند را باید کہ بعد ذکر آنچہ در چیز یعنی واقع است اعادہ کند کلمۂ سا
را با کلام مربوط نمایند بالجملہ مواضع اختلاف لغتین بسیار است از انجملہ آنکہ رسم عرب است
کہ نخست معنی را بنوعی از اجمال واختصار بیان کنند بعد ازاں تفصیل و تبیین آں کنند و ایں تفصیل
بعد اجمال پیش ایشاں لذتے کم از ذکر کلام بنہج تفصیل یافتہ نشود مثلاً گویند ضربت زیداً ر
سہ حسن زیدداراً ان احداستجارک زیداً ضربت پس در ضربت زیداً راسہ وسلبت زید

(اظہار) جیسے نحوی مسائل کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور اگر فہم مراد میں مشکل پیش آگئی تو حتی الا
یہ قصد وارادہ کیا کہ تقدیم وتاخیر اور مقدرات کے اظہار میں ایک لفظ کا اضافہ یا معطوف پر عامل ک
اعادہ یا مضمر کا اظہار یا مظہر کا اضمار اس قسم کے ادنی تصرف کے ذریعہ سے اس صعوبت کو حل
کردیا جائے اور اگر کلام کا مزاج اس قسم کے تصرف سے ابار (انکار) کرتا ہے تو لفظی ترجمہ کے
بعد حاصل معنی کو لفظ "یا مراد آنست" یا "یہ مراد ہے" کا نشان دیکر ذکر کردیا ہے۔ اور اگر کسی لفظی
قید کا ذکر، کسی کلام مجمل کی تفصیل، کسی کنایہ کا حل، کسی لفظ کے معرفہ ہونے کا کشف، یا کسی مبہم
کا ازالۂ ابہام ضروری معلوم ہوا تو ان کو بھی "یا مراد آنست" کہکر بیان کردیا ہے اس لئے
سعادتمند صاحبِ مطالعہ کے لئے ازبس ضروری ہے کہ ترجمہ کے جب اس مقام پر پہنچے جہاں
لفظ "یعنی" مذکور ہے تو کلمہ سابق کا اعادہ کرکے اصل کلام کے ساتھ اس کو مربوط کرلے (اور معنی کو
شرح ووضاحت کی حیثیت میں مطالعہ کرے)

غرض عربی اور فارسی لغات (زبان) کے مابین مواقع اختلاف اکثر و بیشتر ہیں منجملہ ان کے
ایک یہ ہے کہ اہلِ عرب کا دستور ہے کہ اول کسی مطلب کو اجمال واختصار کے ساتھ بیان کرتے

ثوبہ مبادرت کنند باثبات حکم زیدرا ودر حقیقت ثبوت حکم زیدرا بحال متعلق باشد پس عود کنند
وتدارک آں تسامح نمایند، وہمچنیں حسن زیدرا اثبات کردند، وبحقیقت حسن زید ثابت است
بواسطۂ متعلق او پس عود کردند وآں را درصورۃ تمیز تدارک نمودند ولہذا گفتہ اند کہ تمیز از نسبت محول
است از فاعل یا مفعول ودراں احد اضمار نمودند استجار را ودر زیداً ضربت اضمار نمودند
ضربت را بعد ازاں تدارک خللی کہ در اضمار حاصل شدہ بود بتقدیم رسانیدہ اند وایں تصرف در زبان
عجم مالوف نیست و ازاں جملہ آنکہ عرب قصد کنند بجملہ وآں را تغیری دہند واز سنن طبعی معدول

اور بعد ازاں اس کی تفصیل وتبیین کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان کی نظر میں یہ تفصیل بعد از
اجمال اس سے کم لذت اندوز نہیں ہے کہ ابتدا ہی میں وہ تفصیل کے ساتھ کلام کو بیان
کردیں مثلاً وہ کہا کرتے ہیں "ضربت زیداً راسہ - میں نے زید کے سر پر مارا" حَسُنَ زیدٌ دارًا - زید کا
گھر اچھا ہے" "ان احد استجارک، اور اگر کوئی تجھ سے پناہ چاہے" پس "ضربت زیداً راسہٗ اور وسلبت
زیداً ثوبہٗ" میں بعجلت اول زید پر حکم ثابت کرتے ہیں اور درحقیقت مقصد یہ ہوتا ہے کہ زید کے متعلقات
پر حکم صادر کریں اس لئے اس تسامح کا تدارک کرنے کے لئے ہر اس متعلق کو بیان کرتے ہیں اس
طرح حُسنِ زید کا اول اثبات کرتے ہیں اور حقیقت میں حسنِ زید کا اثبات اس کے متعلق یعنی
دارِ زید کے ذریعہ مقصود ہوتا ہے اس لئے پھر رجوع کرتے ہیں اور تمیز نحوی کی شکل میں اس کا تدارک
کرتے ہیں یعنی جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زید کا گھر بہت خوبصورت ہے تو اس کی تعبیر یوں کرتے
زید حسین ہے اپنے گھر کے اعتبار سے) اور اس بنا پر (اہلِ لغت) یہ کہتے ہیں کہ تمیز از نسبت محول ہے
فاعل یا مفعول سے اور "ان احد" میں "استجار" کو مضمر اور پوشیدہ اور "ضربت زیداً" میں
"ضربت" کو مضمر تسلیم کرتے ہیں اور بعد ازاں اضمار کی وجہ سے کلام میں جو خلل پیدا ہوجاتا ہے اس
کا تدارک اس طرح کرتے ہیں کہ کلام کے شروع میں اس مقدر کو ملحوظ مان لیتے ہیں اور ظاہر
ہے کہ اس قسم کا تصرف عجمی زبان میں مانوس نہیں ہے۔

نمایند چنانکہ وعداللہ وسبح اللہ وسقاک اللہ بود و دروی تصرفی کردند بجائے فعل مصدر را قائم
نمودند وآنرا بمعمول فعل خواہ فاعل یا مفعول باشد بواسطہ حرف جر خواہ بیواسطہ مضاف نمود
پس گفتند وعداللہ حقاً وسبحان اللہ وسقیا لک وزبان عجم بنظر ایں تصرف آشنا نیست وازا
جملہ آنست کہ منکر را در صورت معرف گویند ومفکوک من الاضافہ را در صورت مضاف برا
حصول تخفیف در لفظ وغرض ایشاں ہماں معنی اصلی بود وازاں جملہ آنست، کہ خواہند کہ یک
مضمون را دوبار عرضہ دہند بنوعے از سہولت ادا پس آن تکرار را از اول منوت سازند گو

ازانجملہ اہلِ عرب جب ایک جملہ بولنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں ایک خاص قسم کا
تغیر کرتے ہیں اور جملہ کو اس کے اصل مزاج سے ہٹا کر استعمال کرتے ہیں مثلاً "وعداللہ" "
"سبح اللہ" "وسقاک اللہ" (اللہ نے وعدہ کیا ہے، اللہ پاک ہے، اللہ تجھکو سیراب کرے) ہے۔ پس
اس میں وہ تصرف کرتے ہیں اور فعل کی جگہ مصدر کو قائم مقام بنا دیتے ہیں اور پھر اس کو فعل کے معمو
کے ساتھ خواہ وہ فاعل ہو یا مفعول بواسطہ حرف جر یا بلا واسطہ مضاف کر دیتے ہیں اور یوں کہتے
ہیں "وعداللہ حقا" "سبحان اللہ" "سقیا لک"۔ مگر عجمی زبان اس قسم کے تصرف سے مطلق آشنا
نہیں ہے۔ اور منجملہ دوسرے تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ لفظ منکر کو (نکرہ) معرف (معرفہ)
کی صورت میں بولتے ہیں اور جس جملہ سے اضافت محو کر دی گئی ہو اس کو مضاف کی صورت
میں۔ اس لئے بولتے ہیں کہ لفظ میں تخفیف حاصل ہو جائے دراں حالیکہ ان تصرف کرنے والوں کی
غرض ان تصرفات کے باوجود وہی معنی ہی ہوتے ہیں۔

اور منجملہ تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ کبھی وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایک مضمون
کو دو مرتبہ پیشِ نظر لائیں۔ اور سہولت ادا بھی ہاتھ سے نہ جائے پس یہ کرتے ہیں کہ اس تکرار
کو اول کے ساتھ متفق کر دیتے ہیں۔ مثلاً بعض کہتے ہیں ھو اعلمھم علما واحلمھم حلما
وزین ابولہ عطوفا وتبسم ضاحکا وقام قائما والذاریات ذروا، والصافات

اعلمهم علما واحلمهم حلما وزید ابولک عطوفا وتبسم ضاحکا وقام قائما۔ و
اریات ذروا، والصافات صفا۔ وایں چیز ہا در عجم مستعمل نیست وازاں جملہ آنست کہ قصد
بجملہ تامہ وصورت آنرا تغیر دہند بتسلیط فعلی یا حرفے براجزائے آں جملہ گویند ما کان زید
عل ہذا وانما ضرب زید وظننت زیداً قائماً ودر فارسی آں عامل را براجزائی جملہ مسلط نکنند
روی جدا تقریر کنند گویند دانستم کہ زید قائم است نگویند دانستم زید را ایستادہ وجزیں نبود
زید زدہ ہرگز نیست کہ زید چنیں کند وازاں جملہ کہ در عربی گویند قام زید ودر فارسی گویند
زید ایستادہ واگر گویند ایستادہ زید رکیک باشد وازاں جملہ آنست کہ در فارسی حکایتہ حال
ضی بداخل کردن حرف می بر ماضی متحقق شود گویند می کرد می زد ودر عربی بدون استعا کان

صفا اس قسم کا تصرف عجمی زبان میں مستعمل نہیں اور منجملہ تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ اہل
رب جملہ تامہ کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس کی صورت کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ کسی فعل یا حرف
اجزار جملہ پر مسلط کر دیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں ما کان زید لیفعل ھذا وانما ضرب زید و
ظننت زیداً قائماً۔ اس کے برعکس فارسی زبان میں اس قسم کے عامل کو جو عربی زبان میں
عل یا وقت کی زبان میں نمودار ہوتا ہے۔ اجزار جملہ پر مسلط نہیں کرتے بلکہ اس کو جدا لاتے ہیں
ور یوں کہتے ہیں " دانستم کہ زید قائم است " اور یوں نہیں کہتے " دانستم زید را استادہ "
اور ازانجملہ یہ کہ عربی میں " قام زید " کہتے ہیں اور فارسی میں زید استادہ کہتے ہیں پس اگر
قام زید کی طرح فارسی بھی ایستادہ زید کہے۔ تو یہ جملہ رکیک ہو جائے گا۔ اور ازانجملہ یہ کہ
فارسی میں حال ماضی کی اگر حکایت کریں تو ماضی میں " می " داخل کرنے سے معنی متحقق ہو جاتے
ہیں اور یوں کہتے ہیں میکرد، میزد۔ مگر عربی زبان میں جب تک لفظ کان کو اپنے اصل حقیقت سے
ٹا کر مستعار نہ لیا جائے حکایت حال ماضی کے معنی درست نہیں ہو سکتے۔ مثلاً یوں کہیں گے
کان یفعل۔

راست نیاید کان یفعل واز آں جملہ آنست کہ فعل مضارع در عربی خبرمی تواند واقع شدہ
از جعل وکاد ومثال آں بخلاف زبان عجم وہمچنیں در عربی جملہ خبر اسمی واقع شود۔ گویند
زید قام ابوہ در فارسی بدون تکلف راست نباید۔

اسی طرح یہ کہ عربی میں فعلِ مضارع جعلَ اور کادَ کی خبر واقع ہو سکتا ہے برخلاف
فارسی کے کہ اس میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی عربی میں جملہ اسم کی خبر واقع ہوتا ہے چنانچہ
کہتے ہیں زید قام ابوہ اور یہ صورت، فارسی میں تکلف کے بغیر درست نہیں ہوتی۔

(باقی آئندہ)

ادبیات

گلِ رنگیں

جناب الم مظفرنگری

اے گلِ رنگیں ازل سے گلستاں پرور ہے تو — کائناتِ رنگ و بو کا دل کشا منظر ہے تو
ہے فضائے گلستاں معمور موجِ نور سے — تیرا جلوہ کم نہیں ہے شمع بزمِ طور سے
ری رنگینی کا منظر جلوۂ عامِ چمن — ہے تری خوشبو سے قائم مستیٔ شامِ چمن
را ہر اک برگِ رنگیں اس طرح ہے جلوہ زا — کوئی شہ پارہ ہو جیسے برقِ طورِ حسن کا
ندگی بخشِ گلستاں ہے تری جلوہ گری — تو فضائے باغ کو دیتا ہے ہردم تازگی
ہے شفق کی سرخیوں میں اخترِ روشن جبیں — دامنِ رنگیں میں تیرے گوہرِ شبنم نہیں
زِ حسن و عشق کا غماز ہے جلوہ ترا — مظہرِ خونِ شہیدِ ناز ہے جلوہ ترا
ست رکھتا ہے تجھے صہبائے الفت کا خمار — جھومتا ہے یوں سرِ شاخِ چمن جو بار بار

لے رہا ہے لطف زخم غمزۂ قاتل سے تو
آگہی رکھتا ہے شاید درد کی منزل سے تو

ر تری نظروں میں کیوں اے حاصلِ صد خامشی — بلبلِ شیدا کے نالے ہیں فقط اک دل لگی
یۂ تو، سوزِ وفا سے کون ہے اندوہ گیں — حسنِ کامل کیلئے اتنا بھی کیا لازم نہیں
ہ ذرہ ملتفت ہے جانب فریادِ عشق — عبرت آموزِ چمن ہے نالۂ بربادِ عشق
نا پتی ہے زبانِ حال سے گرمِ سخن — باغ کی خاموشیاں ہیں حاصلِ صد انجمن
ں ہے آئینِ چمن سے تجھکو اتنی بے رخی — تو شریکِ بزم بھی ہے بزم سے بیگانہ بھی

ہے یہاں جو بھی وہ سرگرمِ سخن ہے برمحل

ایک تو ہے صرف پابندِ سکوتِ مستقل

اس سے ہیں واقف بھلا اے جانِ چمن جانِ بہار — پردہ دارِ رازِ ہستی ہے خموشی کا وقار

بزمِ عالم میں ہے جو ضبط و سکوں سے آشنا — کامیابِ زندگی ہے وہ یہاں صبح و مسا

ہیں تحمل کے نتیجے شرحِ تقدیرِ حیات — صبر و استقلال سے ہوتی ہے تعمیرِ حیات

یہ تو سب سچ ہے مگر اے نو بہارِ زندگی — وقت پر خاموش رہنا بھی تو ہے بے دانشی

قطرہ قطرہ، بحرِ ہستی کا سکوں آمیز ہے — جب اٹھا طوفان تو پھر ہر موج طوفاں خیز ہے

چپ ہی رہتی ہے کلی اس کو صبا چھیڑے ہزار — وقت پر لیکن صدا اس کی ہے اعلانِ بہار

مطربِ شام و سحر کے راگ ہیں سب بے خلل — کیونکہ ہر آوازِ سازِ دہر کی ہے برمحل

تو بھی اک تقریر کر ایسی چمن میں صاف صاف — جس سے ہو رازِ حقیقت کا سراسر انکشاف

التجا دارم کہ اے بیگانۂ ذوقِ سخن
شو حریفِ نالہ ہائے زارِ بلبل در چمن

نغمۂ جاوید

جناب فرید جاوید

جنوں نے چھیڑ دی شاید حدیثِ رندانہ — مچل رہی ہے رگ و پے میں روحِ میخانہ

برس رہی ہے فضاؤں سے مستقل مستی — نہ میکدہ ہے، نہ ساقی، نہ مے، نہ پیمانہ

نگاہ کھیل رہی ہے اک اور عالم سے — نگاہ میں ہے یہ عالم تمام افسانہ

نہ دیکھ یوں مری جانب اداس آنکھوں سے — گزارنی ہے تجھے زندگی جداگانہ!

ندیم تجھکو مرا احترام لازم ہے — مرا شعارِ محبت ہے بے نیازانہ

ابھارتا ہوں وہ جذبے کہ دلبری آ جائے — سنوارتا ہوں خد و خالِ حسنِ جانانہ

نزولِ رحمتِ پروردگار ہے جاوید — غزل سرا ہے سرِ شام کون دیوانہ

تبصرے

ہمارے بینک از جناب محمد احمد صاحب سبزواری ایم۔اے۔ تقطیع متوسط ضخامت ۵۸۱ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ۲/ آر غیر مجلد عمر۲/ آر پتہ:- انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱ دریا گنج دہلی۔

فنِ معاشیات میں جو چند چیزیں بڑی پیچیدہ اور غور طلب ہیں ان میں سے ایک بینک کا مسئلہ بھی ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ جنھوں نے اقتصادیات کا مطالعہ بحیثیت فن کے نہیں کیا ہے ان کے لئے اس کا سمجھنا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ حالانکہ ہماری روزمرہ کی زندگی سے اب اس کا جتنا قریبی تعلق ہوگیا ہے ظاہر ہے۔ اس بنا پر انجمن ترقی اردو نے اردو میں اس اہم موضوع پر ایک ایسی عمدہ کتاب شائع کرکے ہمارے ملکی اور قومی ادبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اس کتاب میں بینک کی تعریف، ان کے مختلف کام، ان کی ابتدا اور ترقی کی تاریخ، ہندوستان کے مشہور بینکوں کے نام اور ان کے حالات، مرکزی بینک کا مفہوم اور اس کی ہندوستان میں ضرورت وغیرہ مسائل پر سلیس اور عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اصل مباحثِ کتاب کے علاوہ ضمیموں میں رزرو بینک اور امپیریل بینک وغیرہ کے گوشواروں کا جو ذکر آگیا ہے وہ خود ایک مستقل افادی حیثیت رکھتا ہے۔ چوتھے اور پانچویں ضمیمہ میں انگریزی اصطلاحات کے اردو تراجم اور امدادی کتابوں کا تذکرہ ہے جو اقتصادیات کے طالب علم کے لئے بڑے کام کی چیز ہے کتاب پُراز معلومات اور مفید ہے اور اس لائق ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے۔

مقالات جمال الدین افغانی از سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔اے۔ تقطیع خورد ضخامت ۲۶۷ صفحات۔ طباعت وکتابت بہتر قیمت قسم اول ۸/ ہے، قسم دوم عہ۲/ پتہ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن۔

سید جمال الدین افغانی ..... انیسویں صدی عیسوی کے نہایت پرجوش اور سرگرم انقلابی مفکرِ اسلام تھے۔ آپ کے حالات میں اردو میں ایک نہایت عمدہ کتاب "آثار جمال الدین" کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اب اس کتاب میں ان کے چند فارسی مقالات اردو ترجمہ کے قالب میں یکجا شائع کردئیے گئے ہیں۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ بقول قاضی صاحب کے یہ مقالات جناب سید مرحوم کے طوفانی سمندر کی چند موجیں یا ان کے فولادی افکار کی آتشیں چنگاریاں ہیں۔"

ان مقالات کے ساتھ ..... شیخ کے بعض خطوط بھی شریک اشاعت ہیں جو نہایت دلچسپ اور اسلامی غیرت وحمیت کو ابھارنیوالے ہیں۔ ترجمہ کی زبان سہل سلیس اور زور کے اعتبار سے اصل سے ملتی جلتی سی ہے۔

تسنیم | از جناب قیسی رامپوری۔ تقطیع خورد ضخامت ۲۹۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر

قیمت للعہ پتہ:۔ عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزلِ اردو گلی حیدرآباد دکن

یہ ایک دلچسپ ناول ہے جو بیک وقت رومانی ہے اور جاسوسی بھی پلاٹ بہت کچھ فیاض علی صاحب لکھنوی کے دو مشہور ناولوں "شمیم" اور "انور" سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن اس میں ٹکنیک اور زبان کی متعدد خامیاں ہیں جو اگر نہ ہوتیں تو ناول بحیثیت فن بھی بہت کامیاب ہوتا۔ رفعت کا اختر کے متعلق یہ یقین ہوجانا کہ اول درجہ کا بدمعاش اور خونخوار انسان ہے اور اپنے بھائی حمید کی گم شدگی کی حقیقت سے اس کا باخبر ہونا اور اس کے باوجود ایک مدت تک اس کا اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ پھر اختر کے زخم خوردہ ہوکر گرفتار ہونے پر اس کے ساتھ اس کی پرانی محبت کے جذبہ کا بیدار ہوجانا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے ناول کو ایک بڑی حد تک افکار مافوق العادت کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ پھر آخر کا حصہ تو اچھا خاصہ طلسم ہوشربا کا کوئی باب ہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم قیسی صاحب میں کامیاب ناول نویس ہونے کی پوری صلاحیت نظر آتی ہے۔ اگر انھوں نے اپنے ناولوں میں "دہشت انگیزی" اور

"حیرت آفرینی" کے بجائے "واقعہ نگاری اور حقیقت بیانی" کا لحاظ رکھا اور زبان کی بھی اصلاح کر لی تو ایک دن وہ یقیناً اردو زبان کے شرر ثانی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال بحیثیت مجموعی ناول دلچسپ اور فرصت کے اوقات میں پڑھنے کے لائق ہے اور مصنف کا پرواز تخیل قابل داد۔

دکن کی سیاسی تاریخ | از سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی تقطیع خورد ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ؔ پتہ:۔ دار الاشاعت سیاسیہ اشاعت منزل۔ اردو گلی۔ حیدر آباد دکن۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں دکن کی حکومتِ آصفیہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ اس خاندان کے جدامجد نظام الملک آصف جاہ کون تھے، ان کے خاندانی حالات کیا تھے۔ بادشاہ عالمگیرؒ اور اس کی وفات کے بعد مختلف شاہانِ مغل کے زمانہ میں دکن کے سیاسی حالات کیا رہے۔ اور آخر کار کس طرح دربارِ دہلی سے تعلق منقطع کر کے دکن میں ایک مستقل حکومت قائم کی گئی اور اس کے اسباب و وجوہ کیا تھے۔ ایک عام قاری کے لئے کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ لیکن مورخانہ حیثیت سے اس کے بعض مباحث پر گفتگو اور بحث و نظر کی کافی گنجائش ہے۔ لائق مصنف نے ہر باب کے آخر میں ماخذ کی فہرست بھی دیدی ہے لیکن اچھا یہ تھا کہ وہ ہر واقعہ کے متعلق کتاب کا حوالہ بقید صفحہ دیتے تاکہ اس کی سند معلوم کرنے میں آسانی ہوتی اور کتاب علمی حیثیت سے بھی وقیع ہو سکتی۔

مشاہیر چین۔ | از میر عابد علی خاں بی۔ اے۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۴۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:۔ دار الاشاعت سیاسیہ اشاعت منزل اردو گلی۔ حیدر آباد دکن۔

اس مختصر کتاب میں چین کی نو مشہور شخصیتوں کے حالات، ان کے کمالات، اور کارناموں کا تذکرہ ہے جو مختلف حیثیتوں سے چین کی تاریخ میں اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ شخصیتیں چین کی قدیم تاریخ سے لیکر اس کی موجودہ زمانہ کی تاریخ تک سے منتخب کی گئی ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ میں چین کے حکمراں خاندانوں کی ایک فہرست مع ان کی

حکومت کی مدت کے بیان کے ہے۔ اور دوسرے ضمیمہ میں چینی جمہوریت کے مختلف ادوار کا ایک نقشہ ہے۔ اس کے بعد کتاب کے ماخذ کی ایک فہرست ہے۔ کتاب عام معلومات کے اعتبار سے دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے لیکن زبان بہت کچھ اصلاح طلب ہے۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کے لئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت: مسئلۂ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ہے مجلد للعہ

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت: اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم: تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو ازسرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد ہے

غلامانِ اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفہ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط محققانہ کتاب۔ جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے قیمت صہ مجلد ہے

۱۹۴۱ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت صہ مجلد ہے

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے۔ قیمت عہ

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

سنہ ۴۲ء قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام:۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن زیر طبع قیمت للعہ مجلد صہ

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ۔ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳ مجلد للعہ

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن زیر طبع قیمت عہ مجلد ۵

سنہ ۴۳ء مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب عہ مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ ورفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپے مجلد سات روپے۔

خلافت بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات ۳ مجلد ۳ ۱۲/

سنہ ۴۴ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب۔ اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد ثانی۔ قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم:۔ کتاب کے اس حصہ میں انبیا علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کی مکمل تشریح وتفسیر کی گئی ہے۔ قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی۔ قیمت عہ مجلد للعہ

سنہ ۴۵ء کی کتابوں میں "قرآن اور تصوف" مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی طبع ہو چکی ہے جو رفتہ رفتہ حضرات محسنین ومعاونین کی خدمت میں روانہ کی جا رہی ہے

قصص القرآن جلد چہارم پریس کو جا چکی ہے باقی دو کتابوں کا اعلان بعد کو کیا جائیگا۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

[illegible] قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ۔ تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہدِ خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات [illegible] وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت ہے مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

[illegible] مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن [illegible] مثل کتاب ہے مجلد للعہ

[illegible] کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص [illegible] [illegible] قیمت [illegible]

اسلام کا نظامِ حکومت۔ صدیوں کے قانونی [illegible] تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت [illegible] روپیہ مجلد سات روپے۔

خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخِ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے [illegible] امیہ کے مستند حالات وواقعات ے مجلد [illegible]

[illegible] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب۔ اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت [illegible] مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

[illegible] قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقامِ عبدیت مع الاتوسنت نسبت کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اسی طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیا کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد ے

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنّفین دہلی

(۱) محسنِ خاص:- جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبّا:- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتّبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کے لئے دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت: مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ۳ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام: اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد سے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت: اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیہل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ عہ

۱۹۳۹ء نبی عربی صلعم: تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن: جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بےمثل کتاب قیمت عہ مجلد سے

غلامانِ اسلام: اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت عہ مجلد عہ

اخلاق اور فلسفہ اخلاق: علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے قیمت عہ مجلد عہ

۱۹۴۰ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایہ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت عہ مجلد سے

بین الاقوامی سیاسی معلومات: یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی: مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ۳

تاریخ انقلاب روس: ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد پنجدہم شمارہ (۵)

ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ مطابق نومبر ۱۹۴۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

کہتے ہیں دنیا کی سب سے بڑی جنگ ختم ہو چکی ہے جو فاتح اقوام کے دعوی کے مطابق اس لئے لڑی گئی تھی کہ دنیا میں سچائی کا بول بالا ہو، سب لوگ امن وعافیت کی زندگی بسر کریں۔ اور کوئی طاقتور قوم اپنی قوت کے بل پر کسی کمزور اور بے وسیلہ و ذریعہ قوم پر ظلم و زیادتی نہ کر سکے، لیکن اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ جنگ کے ختم ہو جانے اور عدل و مساواتِ انسانی کے علمبرداروں کی غیر مشتبہ جیت کے بعد بھی دنیا میں سرمایہ دار و مزدور۔ اور طاقتور اور کمزور کی کشمکش جاری ہے۔ اور خدا کے بندے جس طرح پہلے ظلم اور ناانصافی کا شکار تھے۔ اب بھی ہیں۔ فلسطین کی مقدس سرزمین پر دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار قوم جابرانہ قبضہ کر کے غریب عربوں کو اُن کے کعبۂ اول سے اور اُس ارضِ مبارک سے جس کو ان کے پیغمبر برحق کے سفرِ معراج کی منزلِ اولیں بننے کا طبعی اور قدرتی شرف حاصل ہے بے دخل کر دینے پر تلی ہوئی ہے اور اس ناپاک مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے سرمایہ کی مدد سے ہر قسم کی ناجائز اور انتہائی تشددانہ اور سفاکانہ حرکات کر رہی ہے۔ فلسطین کی اصل آبادی کے دل کی دھڑکن آج عالمِ اسلام کے ہر گوشہ میں سنی جا رہی ہے، ہر طرف احتجاج پر احتجاج ہو رہا ہے۔ اسکندریہ اور قاہرہ اور شام و عراق کے بام و در ان فغاں سنجیوں سے گونج رہے ہیں۔ لیکن جس فولادی پنجہ نے جاپان و جرمنی جیسے طاقتور حریفوں کو جنگ کے اکھاڑہ میں پچھاڑ دیا وہ فلسطین کے معاملہ میں اب تک زیرِ بغل ہی ہے۔ البتہ حریف پنجہ شکن کی نگاہیں صاف بتا رہی ہیں کہ بجلی کدھر گرنے والی ہے۔ اب ٹرسٹی شپ کا معاملہ درپیش ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانانِ عالم کا یہ بقعۂ مقدس حریفانِ بادہ پیما کی ہوسِ اقتدار پسندی کا آماجگاہ بنکر پھر تیسری جنگ کے شعلوں کو نہیں بھڑکا دے گا۔ اور انبیاء کرام کی یہ پاک آرام گاہ توپوں اور مشین گنوں کی رعد آسا گرج سے دخان زار نہ بن جائے گی۔ اب غالباً پہلی جنگِ عظیم کے فریب خوردہ عربوں پر بھی یہ حقیقت ظاہر ہو گئی

...گی جس کا اظہار عہدِ اکبری کے مشہور شاعر عرفی نے ان بلیغ لفظوں میں کیا تھا ؎

من از فریب امارت گدا شدم ورنہ

ہزار گنج بویرانۂ دل افتادہ است

پہلے مصرع میں بجائے "امارت" کے "ریاست" کا لفظ رکھدیجئے تو یہ شعر ہو بہو عربوں کی حالتِ زار کا ترجمان بن جاتا ہے۔

فلسطین اور مصر کے علاوہ جزائر شرق الہند اور چین کو دیکھئے تو وہاں بھی یہی کشمکش جاری ہے ...ایک جگہ آزادی اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی جنگ لڑی جارہی ہے اور دوسری طرف خانہ جنگی کی آگ نے بھڑک کر سارے ملک کو پھر از سرِ نو اپنے شعلوں میں لپیٹ لیا ہے۔ غریبی اور بھوک کا اب تک وہی تسلط ہے۔ سرمایہ دار کی جوع البقری کا بھوت اب بھی اسی طرح اپنا بھیانک اور ڈراؤنا منہ کھولے کھڑا ہے۔ رنگ اور نسل کا اختلاف اب بھی قوموں کے لئے منافرت باہمی کا سبب بنا ہوا ہے۔ آہ کاش! انسان غور کرتا کہ اپنی عافیت اور امن کے لئے اس نے بار بار کتنے خوشنما اور دلفریب نقشے بنائے ہیں اور ہر مرتبہ اس نے خود ہی ان نقشوں کو مٹایا ہے اور جان سکتا کہ امن کے آبِ حیات کا سرچشمہ سکندری صولت و شوکت سے نہیں بلکہ صرف خضرِ حقیقت کی پیروی سے ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔

پچھلے دنوں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ سید پور وغیرہ بعض مقامات پر جو انتہائی نازیبا اور ناشائستہ معاملہ کیا گیا ہے اس کی تفصیلات اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں، ان کو پڑھکر کوئی مسلمان تو کیا، ایک شریف انسان بھی ایسا نہ ہوگا جو رنج و افسوس اور شرم و ندامت سے اپنی گردن جھکانے پر مجبور نہ ہو۔ مولانا کی سیاسی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ لیکن ورع و تقویٰ، علم و عمل، ایثار کاری و ایثار پیشگی تو مولانا کی وہ روشن صفات ہیں جن سے ان کے بڑے سے بڑے شدید مخالف کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی وہ بے شبہ ہندوستان کے علماءِ اسلام میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے

بس. اس بنا پر جن لوگوں نے مولانا کی توہین اور ایذا رسانی کر کے اپنی وحشت و بربیت کا ثبوت دیا
کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے اس فعل سے پوری قوم کو رسوا اور ذلیل کرنے کی کوشش کی۔
ہر جماعت اور ہر شخص کو اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کا پورا حق حاصل ہے. لیکن لاٹھیوں
حملہ کرنا، اور ٹوپی سر سے اتار کر اسے جلا ڈالنا تو ایک ایسی کمینہ حرکت ہے جو کسی ایک معمولی درجہ کے
انسان کے حق میں بھی روا نہیں رکھی جا سکتی، چہ جائیکہ ایک عالمِ جلیل القدر اور وارثِ علوم
کے لئے "اگر اخلاقی حس کی آخری رمق بھی ہندوستان کے تیرہ نصیب مسلمانوں سے سلب
کر لی گئی ہے تو انھیں سوچنا چاہئے کہ جس قوم کو حالتِ غیظ و غضب میں بھی بدگوئی اور زشت کا
سے منع کیا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی سر برآوردہ رہنما کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرتی ہے تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور شرافتِ انسانی سے بیزاری کا ہی اعلان نہیں کرتی. بلکہ دو
قوموں کو اپنے اوپر ہنسنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ اور جب کوئی قوم اخلاقی اعتبار سے اس درجہ
پست سطح پر اتر آئے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس کے فوز و فلا
کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ دوسری قوموں کے بڑے آدمیوں کا بھی اعزاز و اکرام
پھر مسلمانوں کے لئے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنی ہی قوم کے کسی بزرگ کے حق میں
وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، سب و شتم کریں اور اس کی توہین و اذیت رسانی کے درپے ہوں
مسلمانوں نے موجودہ بحرانی دور میں اگر اس ارشادِ نبوی کا پاس اور لحاظ رکھا تو وہ دوسروں کے لئے
اخلاق کا ایک اچھا نمونہ بن سکتے اور بہت سے آفات و مصائب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

توحیدِ الوہیت

(۳)

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی، بیرسٹریٹ لار
صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

کیا غضب ہے یہ اموات کے پرستار زندہ خدا کو چھوڑ کر مُردوں سے استعانت کرتے نہیں شرماتے اور اپنی بے شرمی کو رفع کرنے کے لئے کتاب وسنت سے دلائل تلاش کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں! لیکن کتاب وسنت سے توبس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مالکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر (البقرہ ۱۰۷) دیکھو حضرت جامی نے اسی بات کو کس خوبی سے ادا کردیا ہے:-

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود — تاثیر ز آلت از محالات بود
ہستی کہ موثر حقیقی ست یکیست — باقی ہمہ اوہام وخیالات بود

ندا اور استعانت کی تائید میں اہلِ استمداد ایک اور حدیث (لاقوۃ الاباللہ) پیش کرتے ہیں، سوال خود پیش کرکے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے "یارسول اللہ! یاغوث، پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابنِ خزیمہ، حاکم، بیہقی نے یہ دعا روایت کی ہے: اللھم انی اسئلك واتوجہ الیك بحبیبك المصطفیٰ عندك یا حبینا یا محمد انا نتوسل بك الی ربك فاشفع لنا عند المولی العظیم یا نعم الرسول الطاھر- اللھم شفعہ فینا بجاھہ عندك- اس دعا میں یا محمدؐ کی ندا ہے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی" تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یارسول، یاغوث پکارنا شرک نہیں جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کرکے اہل استمداد نے اپنی دانست میں ثابت کردیا ہے کہ یا خواجہ یا بدوی، یا شاذلی، یا نقشبند پکارنا جائز ہے! (دیکھو ص ۲۳)

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے۔

(۱) مروی ہے کہ ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرے لئے حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینا ہی پر صبر کر کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے لئے دعا ہی کیجئے۔ آپ نے خود دعا نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:۔ اللھم انی اسئلك واتوجہ الیك بنبیك نبی الرحمۃ یا محمد انی اتوجہ بك الی ربی فی حاجتی ھذا لتقضی لی فشفعہ فی[1] (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی) اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابلِ استدلال نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہا و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابلِ حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے۔

(۳) اگر ہم اس حدیث کو بفرضِ محال قابلِ استدلال بھی مان لیں تو اس سے محض توسل ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ جب کوئی اس ندا اور خطاب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہے تو آپ اس کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ اہلِ استمداد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ توسل میں کیا ہوتا ہے؟ متوسل کرتا کیا ہے؟ وہ طلب حاجت کرتا ہے اسی ذات سے جو عطا و منع میں منفرد ہے جو صاحب امر و نہی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا "ملکوت" ہے اور طلب سے پہلے ایک سبب اجابت کو آگے کر دیتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں قصہ ان تین آدمیوں کا آیا ہے جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے سب سے اچھے عمل کے ساتھ توسل کیا اور وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اگر یہ توسل بہ اعمالِ فاضلہ جائز نہ ہوتا یا شرک ہوتا تو حق تعالیٰ ان کی دعا کو قبول نہ فرماتے اور نہ حضور انورؐ اس حکایت کے بعد سکوت فرماتے۔

---

[1] یا اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعہ سے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں وہ حاجت روائی کی جائے۔ الٰہی تو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

لیکن اگر متوسل یہ سمجھے کہ انبیار یا ملائکہ ایسا واسطہ اور وسیلہ ہیں کہ جن کو پکارنا اور ان پر بھروسہ کرنا ضروری ہے اور جلبِ نفع اور دفع ضرر کے لئے ان کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور ان کی تعظیم بجالانا چاہئے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کے رد میں بہت ساری آیتیں نازل فرمائیں۔ کفار و مشرکین مکہ نے اللہ کے سوا اوروں کو اپنا شفیع اور حمایتی قرار دے رکھا تھا، نفع کے حاصل کرنے اور ضرر کے دفع کرنے کے لئے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مشرکین یہود و نصاریٰ مسیحؑ اور عزیرؑ اور ملائکہ کو پکارتے تھے، استغاثہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کے متعلق صاف طور پر صراحت فرمادی کہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا۔

دیکھو بادشاہ اور رعایا کے درمیان عرض معروض کے لئے چوبدار اور عرض بیگی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے کانوں تک رعایا کا درد دکھ پہنچاتے ہیں، اگر کوئی انبیار و اولیار کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی جناب میں خلق کی حاجتوں کو پہنچاتے ہیں، ان کے درد دکھ کو سناتے ہیں اور حق تعالیٰ خلق کی جو حاجت روائی کرتے ہیں، ان کو رزق دیتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں تو ان ہی کے واسطے سے لہٰذا خلق کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان ہی سے حاجت طلب کریں اور وہ حق تعالیٰ سے عرض کریں جیسے کہ عرض بیگی بادشاہوں سے کرتے ہیں۔

ایسا عقیدہ رکھنے والا بالاتفاق اہل اسلام کافر و مشرک ہے۔ بعینہٖ یہی دین مشرکین کا ہے۔ جو بت پرست ہیں، وہ اپنے بتوں کو انبیار و صالحین ہی کی صورتوں پر بناتے تھے اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے جو ان کو حق تعالیٰ سے قریب کرسکتے تھے۔ (کما صرح ص ۸ و ۱۵) اور یہی وہ شرک ہے جس کی وجہ سے نصاریٰ معتوب ہوئے۔ ان کے متعلق قرآنِ مبین نے صراحت کی ہے۔ تخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا

اللہ من جعل بینہ وبین اللہ وسائط یتوکل علیھم ویدعوھم کفر اجماعاً لان ذلک کفعل عابدی الاصنام قائلین ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ)

(اقناع اور اس کی شرح دیکھو)

لا الٰہ الا ھو سبحٰنہ عما یشرکون (پ۱۰ ع۱۱) غرض حق تعالیٰ نے اس توحید کو قرآنِ کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور شرک کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے اور نہ کسی سے امید رکھے اور نہ کسی کو ان کے سوا اپنے کاموں میں کافی جانے ؎

موحد کہ در پای ریزی زرش دگر آرہ می نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد ز کس ہمیں است بنیاد توحید و بس

ذرا اس واسطہ یا وسیلہ کے مسئلہ پر عقلی پہلو سے بھی غور کر لو، عالم خارجی کی بادشاہت پر نظر ڈالو، یہاں بادشاہ اور رعایا کے درمیان وسائط تین ہی قسم کے ہوتے ہیں (۱) چونکہ خود بادشاہ اپنی تمام رعایا کے احوال کی خبر نہیں رکھ سکتا اس کو ایسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو رعایا کے حال کی خبر دیتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی واسطہ خدا اور بندوں کے درمیان فرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حق تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے، زمین و آسمان کا کوئی ذرہ ان کے علمِ محیط سے باہر نہیں، وہ "سمیع" و "بصیر" و "علیم" ہیں اور بفحوائے ھو بکل شیء علیم ہر شے سے واقف!

(۲) چونکہ بادشاہ اکیلا سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، لہٰذا اس کو اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو نہ کسی ناصر و مددگار کی ضرورت ہے اور نہ کسی معین، ظہیر کی، وہ کائنات کے تمام اسباب و آلات کے خالق، رب، مالک ہیں، ان کی ذات تمام اشیاء سے غنی و بے نیاز ہے، سارا عالم ان کا فقیر و محتاج ہے، مملوک و مربوب ہے۔

(۳) چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کی نفع رسانی اور خبر گیری میں سستی اور غفلت کر سکتا ہے، لہٰذا اس کو کسی ایسے محرک کی ضرورت ہے جو اس کو اپنے فرائض کی ادائی پر آمادہ کرے لیکن اس قسم کے کسی محرک کی حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خلق پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔

عقائد کے ان بدیہات کے ماننے کے بعد اگر کوئی یہ خیال کرے کہ حق تعالیٰ اور ان کے بندوں کے

لے انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابنِ مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود کی عبادت کیا کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

یان ان وسائط کی ضرورت ہے جو سلاطین اور رعایا کے درمیان ضروری ہیں اور وہ وسائط انبیار، اولیار،
لک یا اور موجودات ہیں تو وہ کھلا بت پرست ہے جو اپنے اصنام اور اولیار کو حق تعالیٰ کے دربار میں شفیع، وکیل
یں، مقرب، سمجھتا ہے اور اسی خاطر ان کی عبادت کرتا ہے، وہ خالقِ اکبر کو مخلوقِ اصغر کے مشابہ سمجھتا ہے جو بغیر
پنے اعوان وانصار کے، بغیر اپنے معین وظہیر کے کائنات کا انتظام ہی نہیں کر سکتا۔ فلا تضربوا للہِ
مثال، تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا۔ ؎۱

اعت | اسی سلسلہ میں شفاعت کا صحیح طور پر علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنی ہیں سفارش
یا میں سفارش یا شفاعت کئی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) شفاعتِ وجاہت:۔ بادشاہ کے دربار کا ایک امیر، بادشاہ کے پاس ایک چور کی سفارش کر رہا ہے
س کی چوری ثابت ہے، بادشاہ سزا دینا چاہتا ہے لیکن اس امیر کی سفارش سے دب کر اس چور کی تقصیر کو معاف
دیتا ہے تاکہ امیر کی ناخوشی کی وجہ سے امورِ سلطنت میں خلل نہ پڑے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص کہ کسی فرشتے یا نبی یا ولی کو حق تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھتا ہے
سخت جاہل اور کھلا مشرک ہے۔

(۲) شفاعتِ محبت:۔ اس چور کی سفارش بادشاہ کا کوئی معشوق یا منظورِ نظر کرتا ہے اور بادشاہ
س کی محبت سے ناچار ہو کر چور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنا غصہ پی جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بھی شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تصور نہیں کی جا سکتی۔ بندہ اپنی عبودیت
حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا!

(۳) شفاعت بالاذن: اس چور کی سفارش بادشاہ کی مرضی پا کر اس کی اجازت سے کی جاتی ہے
اس وجہ سے کہ سفارش کرنے والا اس کا قرابتی ہے یا آشنا یا حمایتی۔ بس یہی ایک شفاعت حق تعالیٰ کی
رگاہ میں ممکن ہے۔ اسی کا ذکر قرآن کریم واحادیثِ نبوی میں آیا ہے۔ شفاعت بالاذن کے متعلق

؎۱ ان امور کی مزید توضیح کے لئے دیکھو ابن تیمیہؒ کا رسالہ قاعدہ واسطیہ جو توسل پر ایک بے نظیر رسالہ ہے۔
اس سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔

مندرجہ ذیل چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) شفاعت نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کے اذن سے! ان آیات سے اس کی توضیح ہوتی ہے:۔

(ل) یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا لمن اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولا (پ۱۶ ع ۱۵) "اس روز سفارش نفع نہ دیگی مگر اس شخص کے لئے جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو"

(ب) من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ (پ۳ ع ۲) ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔

(ج) لا تغنی شفاعتھم شیئا الا من بعد ان یاذن اللہ لمن یشاء ویرضیٰ (پ۲۷ ع ۶) یعنی ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ شفاعت حق تعالیٰ کے حکم واجازت سے ہوگی نہ شفیع کی مختاری و خود رائی سے کہ اپنے جس دوست کے حق میں چاہا بغیر مرضیٔ حق کے معلوم کرنے اور بدون اجازت سفارش کردی۔ کفار ومشرکین یہی سمجھتے تھے کہ ان کے معبود ان کی سفارش کریں گے اور عذاب سے بچالیں گے یعنی اس سفارش کو حق تعالیٰ باطل کر رہے ہیں اور جس سفارش کو ثابت کر رہے ہیں وہ اس بندۂ محکوم کی شفاعت ہے جو اپنے مالک ومولیٰ کے سامنے بدون اس کی اجازت وامر کے پیشقدمی نہیں کرتا۔ پہلی قسم کی شفاعت "شریک" کی شفاعت ہے اور حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، دوسری قسم کی شفاعت بندۂ محکوم کی ہے وشتان بین ذالک! جب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے اسی کے واسطے سفارش کا حکم دیں گے تو یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ واقع میں سفارش حق تعالیٰ ہی کی ہوئی اور جو شخص ان کے سامنے سفارش کرے گا وہ ان کے امر واجازت سے کرے گا۔ ابن قیم کے الفاظ میں "وہ ذات پاک خود اپنے نفس سے سفارش کریگی یعنی اپنے آپ ہی بندہ پر رحم کرنا منظور ہوگا۔ یہی معنی ہیں "قل للہ الشفاعۃ جمیعا" کے اور نیز اس آیت کے مالھم من دون اللہ من ولی ولا شفیع" اللہ کے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع" اور جس نے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی وشفیع ٹھیرایا، اس کی مثال ایک مکڑی کی سی ہے

جس نے ایک گھر بنایا جو سب سے زیادہ بودا اور کمزور ہے!! تھوڑی دیر کے لئے اس آیت پر غور کرو، شرک فی التصرف اور شفاعت کو کس خوبی سے رد کیا جا رہا ہے۔

قُلِ ادعُوا الَّذِینَ زَعَمتُم مِن دُونِ اللّٰہِ لَا یَملِکُونَ مِثقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الاَرضِ وَمَا لَھُم فِیھِمَا مِن شِرکٍ وَمَا لَہٗ مِنھُم مِن ظَھِیرٍ وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِندَہٗ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہٗ یعنی آپ فرما دیجئے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے اور خدا کے سامنے سفارش کسی کی کام نہیں آتی مگر اس کے لئے جس کی نسبت وہ اجازت دیدے (سبا ع ۹) مشرک نے جس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اس سے وہ نفع کی امید کرتا ہے اور نفع اسی سے پہنچ سکتا ہے جس میں ان چار صفات میں سے کم از کم ایک صفت ہوتی ہے۔

۱۔ یا تو وہ اس شے کا مالک ہو جس کی امید عابد کر رہا ہے اور جس کے لئے وہ دعا کر رہا ہے۔

۲۔ اگر مالک نہ ہو تو مالک کا "شریک" ہو۔

۳۔ اگر شریک بھی نہ ہو تو کم از کم اس کا معین و ظہیر یعنی مددگار رہو۔

۴۔ اگر معین و ظہیر بھی نہ ہو مالک کے نزدیک شفیع ہو۔ (ابن قیم)

ان ہی چار صورتوں میں عابد کو اپنے معبود سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب حق تعالیٰ ان چاروں کی ترتیب وار نفی فرما رہے ہیں، اعلیٰ صفت سے شروع کر کے ادنیٰ صفت کی طرف رجوع فرما رہے ہیں، ملک و شرکت و مظاہرت (مددگاری) و شفاعت کی کلی نفی فرما رہے ہیں اور اس شفاعت کا اثبات کیا جا رہا ہے جس سے مشرک کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے اذن سے ہوگی۔ یہ آیت ایک نور ہے؛ برہان ہے، اس سے توحید کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور شرک کی ساری جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

(۲) اذن نہ ہوگا مگر اس شخص کے لئے جس کے قول و فعل کو حق تعالیٰ پسند فرمائیں گے۔

حق تعالیٰ شفاعت کا حکم اسی شخص کی نسبت عطا فرمائیں گے جو قول و فعل کے لحاظ سے ان کا پسندیدہ ہوگا۔ لَا یَشفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارتَضٰی (پ۱۷ ع ۲) یعنی جن کو شفاعت کا اذن دیا گیا ہے وہ بجز اس کے جس کے لئے

خدائے تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔

(۳) کسی کا قول و عمل پسند نہ ہوگا مگر توحید و اتباعِ رسول۔

ابوالعالیہ فرماتے ہیں کلمتان یسئل عنہما الاولون والاخرون، ماذا کنتم تعبدون وما ذا اجبتم المرسلین یعنی دو باتوں کا تمام اولین و آخرین سے سوال کیا جائے گا: تم کس کی عبادت کرتے تھے اور تم نے رسولوں کی کن کن باتوں پر عمل کیا؟ حدیث ابوہریرہ میں آیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ من اسعد الناس بشفاعتك یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا من قال لا الٰہ الا اللہ خالصا من قلبہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اہل اخلاص کے لئے ہوگی جنھوں نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بخاری نے ابوہریرہؓ سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ شفاعتی لمن قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا یصدق قلبہ لسانہ ولسانہ قلبہ۔ اس کو امام احمد نے صحیح کہا ہے۔ مسلم نے جو روایت ابوہریرہ سے کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ انی اختبات دعوتی شفاعۃ لامتی یوم القیامۃ فھی نائلۃ ان شاء اللہ، من مات لا یشرك باللہ شیئا۔

شفاعت کے متعلق ان تین اصول کو سمجھ جانے کے بعد شرک کا استیصال ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس نے یہ سمجھ لیا کہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے حکم و اجازت سے ہوگی اور اسی کے لئے ہوگی جس کے قول و فعل کو وہ پسند کرتے ہوں گے اور وہی قول و فعل ان کے پسند ہوگا جو شرک، و بدعت سے منزہ اور توحید و سنت کے مطابق ہو تو اب وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا شفیع کیسے ٹھیرا سکتا ہے اور مشرکین کی طرح ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ کا کب قائل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف کس طرح اپنے قلب کو رجوع کر سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ افضل ترین مخلوقات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہوں گے، اپنے رب، اپنے مولی و مالک کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوں گے۔ لیکن سجدہ سے سر نہ اٹھائیں گے اور شفاعت کے لئے اس وقت تک زبان نہ کھولیں گے جب تک کہ حق تعالیٰ کی اجازت نہ ہوگی کہ قل تسمع واشفع تشفع وسل تعطہ[1]۔ پھر آپ نے تصریح فرما دی کہ فیحد لی حدا کہ میرے لئے ایک حد

---

[1] متفق علیہ۔ کہ سنا جائے گا۔ شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ مانگ دیا جائے گا۔

مقرر کردی جائے گی، یعنی آپ شفاعت ان ہی کی فرمائیں گے جن کا قول و فعل حق تعالیٰ کو پسند ہوگا، یعنی جو مشرک نہ ہوگا، جس نے صدق دل سے توحیدِ الوہیت کا اقرار کیا ہوگا! اسی کی شفاعت کا اذن ہوگا اور اسی کی شفاعت کی جائے گی اور اسی پر حق تعالیٰ رحم کرنا منظور فرمائیں گے!! اسی کی بالآخر نجات ہوگی! جب اذنِ شفاعت دینے والے حق تعالیٰ ہی ہیں، اور قبول کرنے والے بھی وہی ہیں، مشفوع لہ کو ایسے کاموں کی توفیق دینے والے بھی وہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مستحق شفاعت ٹھیرتا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ شفاعت درحقیقت حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے! قل للہ الشفاعۃ جمیعا کے یہی معنیٰ ہیں! یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے اپنے اللہ ہی کو معبود ٹھیرایا، اسی کے لئے اذنِ شفاعت ہوگا، اور جس نے غیر اللہ کو معبود ٹھیرایا اس کی نہ کوئی شفاعت کرے گا اور نہ کوئی شفاعت اس کے لئے مفید ہوگی۔ ان ہی "متخذین شفعاء" کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السموات ولا فی الارض سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ یعنی کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے (پ۱۱ ع۷) اس طرح ان کے افرادِ شرک کو ظاہر فرمادیا!

نذر لغیر اللہ مشرکین کی عبادت کا آخری عمل جس پر ہمارے مقالہ میں بحث کرنی باقی ہے وہ "نذر لغیر اللہ" ہے۔ مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، ان کے لئے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے: وجعلوا للہ مما ذرأ من الحرث والانعام نصیبا فقالوا ھذا للہ بزعمھم وھذا لشرکائنا (پ۸ ع۳) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مواشی پیدا کئے ہیں، ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعمِ خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ویجعلون لما لا یعلمون نصیبا مما	یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان کا حصہ لگاتے
رزقناھم تاللہ لتسئلن عما کنتم	ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں قسم ہے خدا کی تم سے
تفترون (پ۱۴ ع۱۳)	تمہاری ان افترا پردازیوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ کافر اپنی کھیتی اور مواشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے، جنہیں وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالک نفع وضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ ان کے اس ظلم اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرمارہے ہیں۔

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہوگیا ہے کہ ہمیں یہاں اس کی تحقیق ضروری نظر آتی ہے۔ ہر زمانہ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے، وہ وہی بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کہی تھی اور اس پر عمل کیا تھا "کذالک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم! (پ ۱ ع ۱۴)

نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرنا ہے نیکی کا ہو یا بدی کا اور شرع میں لازم کرلینا ہے ایک ایسی بات کا جو لازم نہیں۔ نذرت نذرًا اذا اوجبت علی نفسک شیئًا تبرعًا من عبادۃ او صدقۃ او غیر ذالک (نہایہ) تمام فقہاء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے، چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی، اور سوا ان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وما انفقتم من نفقۃ او نذرتم من نذر فان اللہ یعلمہ (پ ۳ ع ۵) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے۔

سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابوالسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ او نذرتم "النذر عقد الضمیر علی شئی والتزامہ" یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کرلینا ہے۔

جب نذر عبادت ہوئی تو غیر اللہ کے لئے اس عبادت کا بجالانا صریح شرک ہے[۱]۔ عوام الناس بزرگوں کی جو نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں یا تو کسی مقصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا۔ گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں، اس خیال سے تو

---

[۱] مقابلہ کرو شامی ج ۲ ص ۱۳۹: والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون للمخلوق۔

تعالیٰ کی نذر بھی روا نہیں کہ وہ ذاتِ مقدس بھی اخذِ رشوت سے پاک ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تنذروا فان النذر لا یغنی من القدر شیئاً وانما یستخرج بہ من البخیل (متفق علیہ) یعنی نذر نہ مانو اس لئے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں بدل سکتی، اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے، طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کی ہے کہ "جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے جس کا ماننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچالیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پاتے ہیں۔"

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

(۱) تقرب اور عبادت؟ - یہ تو صریحاً شرک ہے۔

(۲) مقصود یابی اور حاجت براری؟ - یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

(۳) ایصال ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے، غور کرو تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیے اس کو چھوڑ کر تمہیں دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامن گیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباء واجداد اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم انھیں ثواب پہنچاؤ، اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا، پیروں اور شہیدوں کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو، ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو، کیا تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور عافیت سے رہیں گے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا، زمانہ کے آشوب سے نجات ملیگی - اگر تم اس غرض سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیرہ کی صحنکیں یا کنڈوری دسترخوان یا سر منی) تو مشرکین کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا معبود بنا رہے ہو، ان کو نفع وضرر کا مالک سمجھ رہے ہو، اور یہ کھلا شرک ہے!! اس کی تصریح قرآن وحدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے، علامہ قاسم شارح درر کے اس بیان پر غور کرو:-

"النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان لیغنی بہ ولیاً اودنیاً ان ردغائبی

او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلك من الذهب او الفضة او الطعام والشراب او الزیت کذا فھذا باطل بالاجماع لانہ نذر مخلوق وھو لا یجوز، لان النذر عبادۃ والعبادۃ لا یکون لمخلوق والمنذور لہ میت والمیت لا یملك وانہ ان ظن ان المیت یتصرف فی الامر کفر الا ان قال: یا اللہ انی نذرت لك ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بباب السیدہ النفیسۃ او الامام الشافعی ونحوہ فیجوز حیث یکون فیہ نفعاً للفقراء والنذر للہ۔

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ (کسی ولی یا نبی کو مخاطب کرکے) اگر میرا غائب واپس آجائے یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت برآئے تو آپ کے لئے اتنا سونا یا چاندی یا طعام و شربت یا تیل بطور نذر پیش کروں گا۔ سو یہ باطل ہے بالاجماع، اس لئے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں، جس کے لئے نذر مانی ہے وہ میت اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماننے والا یہ بھی خیال کرے کہ میت کو کاموں میں اختیار حاصل ہے تو وہ کافر ہو جائے، ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سیدہ نفیسہ والے فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا، یا امام شافعیؒ کے دروازے والوں کو کھانا دوں گا" تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور اور نذر ہے اللہ عزوجل کی۔

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے سامنے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں۔

(۱) عوام کالانعام جو نذر اپنے پیروں بزرگوں کی حاجت برآری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجماع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ

(۲) مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں اس لئے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کیلئے روا نہیں

(۳) عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں، مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں، انھیں ایمانداری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہئے۔

(۴) یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے بلکہ انھیں یہ کہنا چاہئے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی نبی یا ولی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی کیونکہ لاوفاء لنذر فی معصیۃ[1] یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصیہ" جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہئے کہ اطاعت کے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے"۔

توحید الوہیت کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ دعوتی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ہی ہمارے الٰہ قرار پاتے ہیں، الٰہ کے معنی ہیں معبود و رب، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہمارے معبود ہیں اور ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا نہ کوئی معبود ہے اور ہمارا نہ کوئی رب یا مستعان، توحید الوہیت میں ہی "توحید معبودیت" و "توحید ربوبیت" شامل و داخل ہیں۔ شرک واقع ہوتا ہے عبادت و استعانت ہی کی راہ سے، یعنی اگر غیر اللہ کی عبادت کی جائے، یا اس سے استعانت کی جائے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ دیکھو قل انما ھو الٰہ واحد واننی بری مما تشرکون (پ ع ۸) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرک الوہیت ہی کی راہ سے پیدا ہوتا ہے۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور قل انما ادعو ربی ولا اشرک بہ احداً سے واضح ہوتا ہے غیر اللہ کو پکارنا (دعا و ندا) شرک ہے ایاک نعبد وایاک نستعین کی تعلیم دے کر عبادت و استعانت کو بطریق حصر حق تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور اس طرح توحید الوہیت کی کامل حفاظت کر دی گئی۔

توحید الوہیت کے اس معنی کو پیش نظر رکھ کر مشرکین عرب کی عبادت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و شفیع جان کر ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے اور اپنے

---

[1] یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے۔

مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، قرآن کریم واحادیث صحیحہ کی روشنی میں
گیا کہ استغاثہ، استعانت، دعا و ندا، نذر و نیاز سب افعال عبادت ہیں، لہٰذا ان افعال کا تعلق صر
حق تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے۔ مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اسی لئے انھیں تہدید
گئی کہ "فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون" پس ان کا شرک بھی غیر اللہ کی عبادت اور اس سے استعان
سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ حق تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ ہی ان کی ذات میں کسی غیر کو شریک کرتے تھے۔

غیر اللہ کی عبادت ہی شرکِ محض اور کفرِ بحت ہے، یہ شرکِ اکبر انسان کے خون و مال کو حلال کر
ہے اور اس کو "مخلد فی النار" بنا دیتا ہے، جب کسی کے کانوں تک توحید کی دعوت پہنچ چکی اور اس پر حج
کا قیام ہوگیا اور اس کے باوجود وہ شرک پر جما رہا اور کفر کا اعلان کرتا رہا تو وہ کافر مشرک ہوگیا، اب
اس کے نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے اور توحید پر ایمان لا
اور اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔

احادیثِ نبویہ میں کلمۂ توحید کے چند قیود و شرائط بیان کئے گئے ہیں، مثلاً کسی قسم کا ش
الوہیتِ الٰہی میں نہ کرے، متکبر نہ بنے، جائر نہ ہو، یہ کلمہ اس کو گناہوں سے روکے وغیرہ۔ انسان جب
ان پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوتا ہے[1]۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو غیر اللہ کی عبادت
بجا لاکر کھلے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ ائمہ اربعہ نے تارکِ صلوٰۃ، مانعِ زکوٰۃ، یا تارکِ اذان یا نمازِ عید سے قتال ک
واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اہلِ شرک و کفر سے قتال کا کیا ذکر، بعض نے تو اس پر اجماع بھی
نقل کیا ہے۔ جب نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کے ترک کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ترکِ توحید و اخلاص سے کس
طرح شرک لازم نہیں آئے گا۔ امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول
ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام
وحسابھم علی اللہ!

---

[1] اسی کو پیشِ نظر رکھ کر شاید اقبال نے کہا ہے ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را۔ (ارمغانِ حجاز)

مقالہ کے دوران میں جو آیتیں شرک وکفر کے رد میں پیش کی گئیں ان کو عرب ہی کے مشرکین و
عابدین اصنام واوثان کے حق میں سمجھنا غلطی ہے۔ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے مشرکین پر ہوتا ہے،
. . . . . . ہر زمانہ کے مشرکوں کے درمیان ایک ہی جامع ملتا ہے اور وہ شرک باللہ ہے
ایک ہی ہوگا کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم، چنانچہ اصول فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ
بعموم الالفاظ لا بخصوص الموارد" یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا، سارے
شرعیہ کا مدار اسی اصول پر ہے اور حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ "حکمی علی الواحد کحلمی علی الجماعة"
انکار سے یہ بات لازم آئے گی کہ جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر کسی گزشتہ واقعہ کے سلسلہ میں نازل
وہ اسی کی حد تک محدود ہے اور متعدی نہیں، یہ قطعاً باطل ہے۔ اس سے احکام شرعیہ کا تعطل
تا ہے۔ کیونکہ جتنی آیات حدود وجنایات ومواریث ہیں وہ سب خاص خاص واقعات ہی کے
میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا حکم عام ہے اور قیامت تک باقی ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضؓ نے ان
کی بابت جو بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں فرمایا تھا: ھذا نزل علی بنی اسرائیل وانہ علینا
ردوما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔ اسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کسی نے کیا خوب کہا ہے
لاخوۃ بنی اسرائیل اذا کان کل حلوۃ لکم وکل مرۃ لھم ا اور ائمہ ثلاثہ نے تو اس امر کی صراحت
ہے کہ شرائع ماقبل ہمارے لئے بھی شرع ہیں اور امام شافعیؒ بھی اسی اصول کو تسلیم کرتے ہیں،
سی صورت میں جب کہ اس کی توضیح ہماری شرع میں بھی آچکی ہو۔ اب ہماری شریعت نے بھی ان
کی توضیح کردی ہے۔ اور کتاب وسنت ان پر ناطق ہیں۔ ان کا تعلق امم سابقہ اور مشرکین عرب
ساتھ سمجھنا کس قدر فاحش غلطی ہے۔

پھر ذرا غور تو کرو کہ جس چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کو منع فرمایا؟
وزی پر ان سے مقاتلہ فرمایا، جس پر قرآن مبین نازل ہوا وہ شرک ہی تو تھا اور کفر، ان کے
ساری آیتیں محکم ہیں اور غیر منسوخ۔ اول وآخر ہر ایک کے لئے یکساں ہیں، علاوہ ازیں قرآن کریم
آیتیں بھی ہیں جو خاص انبیا بلکہ افضل انبیا اور مومنین کے حق میں اتری ہیں، ان میں شرک کو

محبطِ اعمال قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر ارشاد ہوتا ہے کہ ولو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون، کسی جگہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے لئن اشرکت لیحبطن عملک ایک جگہ اہلِ ایمان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون!

ہمارے اس زمانہ کے مومن مشرک بفحوائے حدیث لتتبعن سنن من قبلکم اپنے پیشرو مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر "توحید الوہیت" ہی کا انکار کر رہے ہیں یعنی وہ اس امر کے قائل نہیں رہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائق دعا و عبادت، خوف و رجا، استعانت و استغاثہ نہیں۔ جس کے لئے جانور ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا ان کے انبیاء و اولیاء بھی شداید و مصائب و آفات و بلیات میں ان کی فریاد سُن کر، ان کی حالت سے مطلع اور واقف ہو کر ان کی مدد کر سکتے ہیں، "کشف ضرر" کر سکتے ہیں۔

اسی لئے ان کے اہلِ علم و فضل بھی اس کی علی الاعلان تعلیم کرنے لگے ہیں کہ حالتِ درد و مصیبت میں پکارنا چاہئے، حضرت معروف کرخیؒ کو، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کو، حضرت سالار مسعودؒ کو، حضرت شاہ بدیع الدین مدارؒ کو، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کو، حضرت قطب الدین کاکیؒ کو، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جاہل اور عالم دونوں غیر اللہ سے اس طرح استعانت ہر مصیبت کے وقت کرتے ہیں، ان کے لئے مرغ، بکری، گائے ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز لاتے ہیں، منت مانگتے ہیں، چراغ روشن کرتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اپنے پیش روؤں کی طرح اللہ کی ذات میں شریک نہیں کرتے بلکہ ان کو اللہ کا مملوک و محکوم ہی مانتے ہیں، اللہ ہی کو حاکم و مالک و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے ان بزرگوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر اپنے پیشروؤں کی طرح ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے یہ بزرگ، یہ صلحاء، مقرب الٰہی ہیں وہ ان کی نذر و نیاز ان سے دعا و التجا و استغاثہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت و شفاعت و قرب سے اللہ کے غصے اور خفگی و ناراضی سے نجات پا کر قرب حاصل کر لیں۔

اس مختصر مقالہ میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعینہٖ یہی عقیدہ "شرک فی الالوہیت" ہے

یہی مذہب ابوجہل اور ابولہب کا ہے سوار بسوار! حضرت عیسیٰ وحضرت عزیرؑ و ملائکہ و انبیا کے پکارنیوالے بعینہٖ اسی مسلک پر قدم زن تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی، وقولہ تعالیٰ: ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاءنا عند اللہ!

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے دینِ حق کا پیغام لا الٰہ الا اللہ پیش فرما کر افرادِ عبادت للہ کی طرف دعوت دی، ساری عبادت کو اللہ ہی کے لئے مختص کردیا خواہ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، قلبی ہو یا قالبی! مشرکین نے جن وسائط کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا تھا ان کی نفی فرمائی، وضاحت فرمادی کہ توسطان اولیار وانبیار وشہدا و ملائکہ کا اس اعتقادِ فاسد و زعم کاسد کے ساتھ کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے بغیر اذن ومرضیِ حق کے کارآمد نہیں ہوگا، جو چیز کہ نفع دیگی وہ یہی عبادتِ خالص و توحید مفرد ہوگی جو کلمہ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ سے ثابت ہے، جو شخص اس کلمہ کے معنی پر چلا، اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا، وہی مومن موحد اور محسن مخلص کہلایا اور جس کا قول و فعل، حال وخیال اس کے معنی و مقتضیٰ کے خلاف ہوا وہ مشرک کافر ہوا یا مبتدع ضال! قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝

قانونِ کششِ ثقل

نیوٹن اور حکیم ناصر خسرو علوی

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (۱۳-۲)

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اپنی ہستی اور توحید اور بعث وغیرہ کے حق میں ایسی سیدھی سادی اور آسان دلیلیں پیش کی ہیں جن سے ایک ناخواندہ اور سادہ لوح اور جاہل انسان بھی مستفید ہو کر ایمان اور اطمینان کی نعمتوں سے مالامال ہو سکتا ہے۔ قرآن ان دلائل کو آیات (نشانیاں) کہتا ہے اور فی الواقعہ یہ دلائل ایسے نشان ہیں جنھیں دیکھ کر انسان آسانی سے منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔

یہ آیات زیادہ تر مناظرِ قدرت کی نشانیاں ہیں۔ ایسی نشانیاں جو ہر وقت ہمارے سامنے رہتی ہیں۔ اور جن کا وجود ہر وقت ہمارے دلوں اور دماغوں پر اثرانداز ہوتا رہتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے دریا، سمندر، بادل، ہوائیں، درخت، پودے، سبزہ، پھل، پھول اور چرند، پرند وغیرہ ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے تصور کے اندر رہتے ہیں۔ وہ کون انسان ہوگا جس نے روزانہ کسی نہ کسی وقت ان چیزوں کی ماہیت کیفیت اور ان کے تغیرات پر غور نہ کیا ہوگا۔ اور جس کا ذہن اس غور و فکر کے ضمن میں کسی حکیم و علیم اور قدیر و بصیر خالق و مالک کی طرف منتقل نہ ہوا ہوگا۔

خدا کی ان آیاتِ بینات پر ایک جاہل بھی غور کرتا ہے اور اپنی استعداد کے مطابق مستفیض ہوتا ہے اور ایک عالم حکیم اور فلسفی بھی ان نشانیوں میں گہری سوچ بچار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ اپنے فکر کی گہرائیوں میں کھو ہی جاتا ہے۔ لیکن انہی گہرائیوں سے وہ علم و حکمت اور معرفت کے انمول موتی بھی

نکال لانے میں گاہ بگاہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

شرح السنت میں عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کے متعلق فرمایا کہ "لہٗ ظہرٌ وبطنٌ" یعنی قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ قرآن کا ظاہر وہی ہے جس سے ایک سادہ مزاج اَن پڑھ اور معمولی خواندہ آدمی فیض حاصل کرتا ہے۔ اور باطن وہی ہے جس سے ایک عالم اور حکیم علم وحکمت کے بیش بہا نکتے دریافت کرتا ہے۔

اسی طرح ترمذی اور دارمی نے حارث الاعور سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "ھُوَ الذِّکرُ الحَکِیمُ وَھُوَ الصِّرَاطُ المُستَقِیمُ . . . وَلَا یَشبَعُ مِنہُ العُلَمَاءُ . . . وَلَا یَنقَضِی عَجَائِبُہٗ" یعنی قرآن مجید حکمت والا ذکر ہے۔ سیدھا راستہ ہے۔ علم والے لوگ اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے اور اس کے عجائب کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ مطلب یہ ہے کہ عوام کے لئے، قرآن مجید ایک سیدھی راہ ہے جس پر چل کر وہ منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں اور خواص کے لئے اس میں حکمت و معرفت کے اتنے بڑے خزانے ہیں کہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ہر صاحب بصیرت پر یہ امر روزِ روشن کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا صرف ایک بطن نہیں بلکہ بطن در بطن اور بطن در بطن در بطن دور تک چلے جاتے ہیں ایک آدمی اس کے ظاہر سے فیضیاب ہوتا ہے، دوسرا اس کے بطن سے تیسرا اس کے بطن در بطن سے اور چوتھا بطن در بطن در بطن سے اور اسی قیاس پر یہ بطون سلسلہ در سلسلہ غیر محدود بلندیوں اور بے نہایت گہرائیوں تک چلے جاتے ہیں۔

یقیناً یہ بات بارہا بار آپ کے تجربے میں آئی ہوگی کہ انسان قرآن مجید کی پے در پے تلاوتوں کے دوران میں ہر بار کوئی نہ کوئی نیا نکتہ دریافت کر لیتا ہے۔ ہم نے کئی دفعہ ایک آیت کو پڑھا ہوتا ہے لیکن جب پھر ہم اسی آیت کو پڑھتے ہیں تو ایک عجیب وغریب اور دلچسپ نئی بات ہمارے ذہن میں آجاتی ہے۔

مثلاً دیکھئے کہ قرآنِ کریم اختلاف اللیل والنہار کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہتا ہے اور اسی طرح جا بجا یولج اللیل فی النہار ویولج النہار فی اللیل کہہ کر خدا کی آیاتِ بینات کا ذکر کرتا ہے۔ ان آیات کا ظاہر

تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے معمولی آدمی بھی دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ لیل ونہار کے یہ اختلافات کیا ہیں سورج نکلتا ہے۔ دوپہر ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، سورج غروب ہوتا ہے، اندھیرا ہو جاتا ہے اور پھر صبح ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے چل رہا ہے اور چلا جا رہا ہے۔ ان مناظر کے اوقات میں کبھی ایک لمحہ یا ایک لمحہ کے ہزارویں حصے کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ کبھی دن بڑھتے چلے جاتے ہیں اور راتیں گھٹتی چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی اس کے برعکس راتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور دن گھٹتے چلے جاتے ہیں لیکن اس بڑھنے اور گھٹنے کے موسم اور اوقات ایسے منظم اور مرتب اور باضابطہ ہیں کہ ان پر غور کرتے ہوئے بے ساختہ اور ناخواستہ کسی حکیم قادر مطلق کا خیال دل میں آجاتا ہے۔

یہ تو ان آیات کا ظاہر تھا۔ لیکن طبیعیات اور ہیئت کے ایک طالب علم کو ان آیات میں ایک باطن بھی نظر آتا ہے وہ دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ دن اور رات کے گھٹنے اور بڑھنے میں بھی بعض اختلافات اور اختلافات در اختلافات موجود ہیں۔ وہ اِن اختلافات میں خدا کی قدرت کی رنگا رنگ کرشمہ طرازیاں دیکھتا ہے اور ان میں غور و فکر کرتا ہے اور خداوند کریم کے عجیب و غریب ازلی اور ابدی قوانین سے روشناس ہوتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ خطِ استوا کے تمام مقامات پر دن اور رات ہمیشہ برابر رہتے ہیں۔ سال بھر روزانہ بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات، نہ ایک سیکنڈ اِدھر اور نہ ایک لمحہ اُدھر، وہ دیکھتا ہے کہ مدراس میں بڑے سے بڑا دن ۱۲ گھنٹے ۵۲ منٹ کا اور چھوٹے سے چھوٹا دن ۱۱ گھنٹے ۱۸ منٹ کا ہوتا ہے۔ پشاور میں بڑے سے بڑا دن ۱۴ گھنٹے ۲۳ منٹ کا اور چھوٹے سے چھوٹا دن ۹ گھنٹے ۴۸ منٹ کا ہوتا ہے پیٹروگراڈ میں بڑے سے بڑا دن ۱۸ گھنٹے ۴۶ منٹ کا اور چھوٹے سے چھوٹا دن ۵ گھنٹے ۴۴ منٹ کا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ یہ اختلاف اور تفاوت بعض مقررہ اور کبھی نہ بدلنے والے قوانینِ الٰہی کے ماتحت ہو رہا ہے۔

پھر اس بطن کے اندر ایک اور بطن در بطن یہ کہ انہی خدائی قانونوں کے ماتحت قطبِ شمالی پر چھ ماہ کا دن ہوتا ہے اور چھ ماہ کی رات۔ اسی طرح قطبِ جنوبی پر بھی چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے اور جب قطبِ شمالی پر رات ہوتی ہے تو قطبِ جنوبی پر دن ہوتا ہے اور جب

قطب شمالی پر دن ہوتا ہے تو قطبِ جنوبی پر رات ہوتی ہے۔ پس ہر ایک آدمی کے لئے اس کی استعداد کے مطابق اختلاف اللیل والنہار کی یہ آیات کئی بطون رکھتی ہیں۔

ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن مجید میں انہی آیات اللہ میں سے خدا کی ایک نشانی اس طرح بیان ہوئی ہے

وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس کے ذریعے

بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۲۰-۵۳) اقسامِ مختلف کے نباتات پیدا کئے۔

اس نشانی کا ظاہر تو یہی ہے جو ترجمے سے ظاہر ہو رہا ہے، ہر کہ ومہ ہر خاص وعام، ہر عالم وجاہل اور ہر ناقص وکامل انسان وقتاً فوقتاً دیکھتا رہتا ہے کہ بادل اٹھتے ہیں اور بارش برستی ہے۔ خشک اور مردہ زمین میں پھر سے تازگی اور زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور قسم قسم کے نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دیکھکر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور یقیناً ان خیالات میں ایک خیال احسن الخالقین کے متعلق بھی ہوتا ہے۔ پس قدرت کا یہ منظر بھی خدا کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔ لیکن یہ اس آیت کا ظاہر ہے اور فقط ظاہر۔ اس آیت میں ہم ازواج کا لفظ دیکھتے ہیں تو معاً ہمارا ذہن اس لفظ کے عام اور اصطلاحی معنیٰ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن ہم ڈرتے ڈرتے اس آیت کا ترجمہ یونہی کرتے ہیں کہ" ہم نے مختلف قسموں کے نباتات پیدا کئے"۔

لیکن نباتات کا ایک طالب علم جب قرآنِ کریم کی یہ آیت پڑھتا ہے اور اس میں نباتات کے متعلق لفظ ازواج لکھا دیکھتا ہے تو علمِ نباتات کے عجیب وغریب حقائق اس کے سامنے آجاتے ہیں، وہ جانتا ہے کہ جس طرح انسانوں اور حیوانوں میں نر ومادہ ہوتے ہیں، اور ان کے جمع ہونے سے سلسلۂ تولید جاری ہوتا ہے۔ اسی طرح نباتات میں بھی نر ومادہ کے جوڑے (ازواج) ہوتے ہیں اور اسی طرح ان میں بھی تولید وتناسل کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ نباتیات کی کوئی ٹکسٹ بک اٹھالیں۔ اور اس کی ورق گردانی کریں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ نباتات میں بھی ازواج ہوتے ہیں۔ اور ان میں بھی اعضائے تولید موجود ہیں۔ نباتات کے انہی اعضائے تولید سے بیج پیدا ہوتا ہے۔ جن پھولوں میں نر اور مادہ دونوں اعضا موجود ہوتے ہیں۔ ان کو دو عضوی (یا دوجنسی) کہا جاتا ہے۔ بعض حالتوں میں یہ اعضا مختلف

پھولوں میں ہوتے ہیں۔ یعنی ایک پھول میں عضوِ مذکر اور دوسرے پھول میں عضوِ مونث، ان پھولوں کو یک عضوی (یا یک جنسی) کہا جاتا ہے جس پھول میں عضوِ مذکر ہوتا ہے اُسے نر اور جس میں عضوِ مونث ہوتا ہے اسے مادہ کہتے ہیں۔ بعض درخت ایسے ہوتے ہیں جن پر نر اور مادہ دونوں پھول موجود ہوتے ہیں۔ بعض درخت اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ایک درخت پر نر پھول ہوتا ہے اور دوسرے درخت پر مادہ پھول۔ کھجور اور اسی نوع کے کئی اور درخت اسی آخری قسم کے درخت ہیں جن پھولوں میں عضوِ مذکر اور عضوِ مونث دونوں تباہ ہو گئے ہوں انھیں مخنث کہتے ہیں۔

نباتات میں تناسل کے کئی طریقے ہیں۔ لیکن سب سے اہم طریقہ وہ ہے جو بیج کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس طریقے سے نوع کی طاقت قائم رہتی ہے اور سلسلۂ تناسل بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اس طریقِ تناسل میں عملِ تولید کے تمام ضروری مراتب حیوانات کے عملِ تولید کے مراتب کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ تناسل کے اس جنسی طریقے میں اجزائے مذکر اور اجزائے مونث علیحدہ علیحدہ کوئی تولید نہیں کر سکتے۔ جب وہ جمع ہو جاتے ہیں تو تولید عمل میں آتی ہے۔

یہ آیتِ مذکورہ کا بطن ہے۔ اور اس بطن کے اندر کئی بطن در بطن ہیں۔ لیکن میں چونکہ علمِ نباتات سے بے بہرہ ہوں اس لئے افسوس ہے کہ میں ان بطون کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نباتی آیات کے انہی بطون کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

آیاتِ خداوندی میں سے جس آیت کے متعلق میں خاص طور سے لکھنے بیٹھا تھا اس کے متعلق ابھی تک میں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ لیکن یہاں تک جو کچھ میں لکھ چکا ہوں وہ مضمونِ زیرِ کار کے تعارف کا کام ضرور دے گا۔ آیتِ زیبِ عنوان کو ایک دفعہ اور پڑھیے۔ اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونھا۔ بغیر ایک آدھ استثنا کے تمام مترجم اور مفسر اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ اللہ وہ ہے

جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے

(۱) اللہ تو وہ ہے کہ جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کرکے تمہیں دکھا رکھا ہے۔

(۲) خدا آں است کہ برداشت آسمانہا را بے ستون مے بینید آنہارا۔

(۳) اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بن ستون دیکھتے ہو۔

(۴) خدا آں است کہ برداشت آسمانہا را بے ستونے، نے وشمامے بینید آسمانہارا مرفوع بے ستون۔

(۵) یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کردیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انھیں تھامے ہوئے نہیں ہے۔

(۶) اللہ ایسا ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اونچا کھڑا کردیا چنانچہ تم ان کو دیکھ رہے ہو۔

(۷) اللہ وہ ذات ہے جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستون کے دیکھتے ہو تم اس کو۔

(۸) اللہ ایسا ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اونچا کھڑا کردیا۔ چنانچہ تم ان آسمانوں کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو۔

(۹) اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو۔

ان ترجموں کا ماحصل یہ ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدا نے آسمانوں کو بغیر ستون کے کھڑا کر رکھا ہے اب اس آیت کا وہ ترجمہ دیکھئے جو میں نے مضمون کے عنوان پر لکھا ہے۔ اس ترجمے کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آسکیں۔ کھڑا کر رکھا ہے یعنی آسمان ایسے ستونوں پر کھڑے ہیں جو نظر نہیں آسکتے۔ ستون ہیں تو ضرور لیکن وہ غیر مرئی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ترجمہ اس آیت کا کیا ہے وہ عام ترجموں سے الگ اور عنوانِ مضمون والے ترجمے کے نزدیک ہے، شاہ صاحبؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔ "خدا آں است کہ برداشت اسمانہارا بغیر ستون ہا کہ بینید آں را"۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ستونہا کے بعد جو لفظِ "کہ" لگا دیا ہے۔ اس نے اس ترجمے کو تمام عام ترجموں سے الگ کردیا۔ یہ ترجمہ مبنی ہے بعض روایات پر جن کا ابنِ کثیر وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ، حسنؒ اور قتادہ کا قول ہے کہ آسمانوں کے ستون تو ہیں لیکن ہمیں نظر نہیں آتے۔ ان ستونوں کے متعلق کہ وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں بعض روایات میں عجیب وغریب قصے بیان ہوئے ہیں لیکن وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ البتہ

فوائد السلوک میں ان ستونوں کے متعلق ایک بامعنی بات لکھی گئی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "کہ حضرت باری تعالیٰ سقوفِ عالیہ و سطوحِ مرتفعہ سماوات را بے قائمہ کہ ادراک توانید نمود برافراشت و بے ستونے کہ مشاہدہ توانید فرمود بلند برداشت۔ یعنی ستونے ہست اما مخفی ہست و قائمہ موجود است ولیکن غیر مرئی ست و آن عدالت تواند بود کہ بالعدل قامت السماوات والارض۔ یعنی آسمان و زمین بعدل برپا ہستند۔"

فوائد السلوک کا یہ بیان کہ آسمان اور زمین عدل کے ستونوں پر قائم ہیں۔ بہت پُر معنی ہے۔ اس مضمون میں یہ دکھانا مطلوب ہے کہ اِن عدل کے ستونوں کی حقیقت کیا ہے۔

اس حقیقت کا انکشاف حکیم ناصر خسرو علوی نے ایک نہایت دلچسپ اور حکیمانہ مقالے میں کیا ہے۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے حکیم صاحب کی تحقیق موجودہ یورپین نیچرل فلاسوفی کی تحقیق سے کسی صورت میں کم درجے پر نہیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ قانونِ کشش ثقل کی دریافت بیں اولیت کا سہرا نیوٹن کے سر پر غلطی سے رکھا گیا ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

"اب ہم کہتے ہیں کہ تمام اجسام کی حرکت ایک جانب ہوتی ہے یعنی مرکزِ عالم کی جانب۔ لیکن یہ اجسام اپنی صورت کی وجہ سے جو انھیں ملی ہے۔ مرکزِ عالم سے دور اپنی اپنی حد پر اور اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہیں۔ وہ جسم جو صرف ایک ہی جانب حرکت کرتا ہو حالانکہ اور کئی جانبیں بھی اس کی حرکت کے لئے کھلی ہوں اور وہ کسی دوسری جانب حرکت نہ کرے تو پھر ظاہر ہے کہ وہ جسم اس حرکت پر مجبور ہے اور مقہور ہے اور کسی چیز پر قہر بغیر کسی قاہر کے نہیں ہوتا۔ پس اجسام اپنی حرکت میں مقہور ہیں۔ اور اس قول کی درستی پر دلیل یہ ہے کہ پتھر زمین پر ہی گرتا ہے اور اس کی حرکت صرف مرکزِ زمین ہی کی طرف ہوتی ہے اور کسی طرف وہ میل نہیں کرتا، حالانکہ تمام جانبیں اس پر کھلی ہیں وہ کسی اور طرف حرکت نہیں کرتا۔

زمین کا ہر ایک جزو زمین کے ہر دوسرے جزو کو جو اس کے اوپر ہے مرکزِ زمین تک پہنچنے سے روک رہا ہے۔ پس زمین کا ہر ایک جزو دوسرے جزو کے لئے ستون بنا ہوا ہے کہ اپنے سے اوپر والے جزو کو نیچے جانے سے روک رہا ہے۔ پس زمین کے تمام اجزا اس جزو نا متجزی

پر جو مرکزِ زمین میں ہے سہارا کئے کھڑے ہیں۔

طبیعی فلسفیوں کا یہ قول کہ ہوا ہلکی ہے اور مرکزِ عالم کی طرف نہیں بلکہ حاشیۂ عالم کی طرف جانا چاہتی ہے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوا بھی مرکزِ زمین کی طرف حرکت کرتی ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہوا بھی زمین پر پڑی ہے۔ ہوا کی وہ سطح جو زمین پر پڑی ہے۔ ہوا کی اوپر والی سطح کو نیچے آنے سے روکتی ہے۔ اگر ہوا کی اوپر والی سطح نیچے آجائے تو نیچے والی سطح کو اوپر دھکیل دیتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تمام کی تمام ہوا یہ ارادہ رکھتی ہے کہ زمین پر آجائے لیکن ہوا کے اجزا ایک دوسرے پر پڑے ہیں۔ اور نیچے والے اجزا اوپر والے اجزا کو نیچے آنے سے روک رہے ہیں جس طرح زمین کے وہ اجزا جو مرکزِ زمین کے نزدیک تر ہیں اپنے سے اوپر والے اجزا کو نیچے نہیں جانے دیتے۔

طبیعی کہتے ہیں کہ آگ (آتش۔ اثیر یا ایتھر) کے وہ اجزا جو اوپر والی سطح پر ہیں۔ مقہور نہیں ہیں اور دوسرے اجزا جو اس سطح کے اوپر ہیں آگ سے مقہور ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جہاں جسمِ کلی ہے۔ اور ان تمام اجسام کی رغبت مرکزِ عالم کی طرف ہے اور اثیر کی نیچے والی سطح کے اجزا مرکز کے نزدیک تر ہیں۔ انھوں نے ہوا پر تکیہ لگایا ہے اور اثیر کے ان اجزا کو جو ان سے اوپر ہیں نیچے آنے سے روک رہے ہیں۔ پس نچلی سطح سے اوپر جتنے اجزا ہیں تمام مقہور ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ تمام اجسام کی حرکت ان کی موجودہ صورت کے اندازے پر ہے۔ خاک اپنی صورت کی وجہ سے اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ وہ مرکزِ عالم کے نزدیک تر ہو۔ پانی اپنی صورت کی وجہ سے خاک کے مقابلے میں مرکز کے نزدیک پہنچنے کی کم لیاقت رکھتا ہے اس لئے خاک اُسے مرکز کے نزدیک تر جانے سے روک رہی ہے۔ ہوا اپنی صورت کی وجہ سے بمقابلہ پانی کے بھی مرکز کے نزدیک جانے کی کم لیاقت رکھتی ہے۔ اس لئے پانی ہوا کو مرکز کے نزدیک تر ہونے سے روک رہا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جہاں کہیں زمین میں سوراخ ہوتا ہے وہاں ہوا جا پہنچتی ہے لیکن

جب پانی اس سوراخ میں جاتا ہے تو ہوا کو نکال کر اسے مرکزِ زمین سے دور تر پھینک دیتا ہے۔ اثیر ہوا سے بھی نالائق تر ہے۔ اس لئے ہوا اسے نیچے آنے سے روک رہی ہے۔"

یہاں تک ناصر خسرو نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام اجسام (خاک، پانی، ہوا اور آگ یعنی اتھر یا اثیر) مرکزِ عالم (یعنی مرکزِ زمین) کی طرف جانا چاہتے ہیں، لیکن بعض کو نیچے جانے سے روک رہے ہیں۔ یعنی زیادہ طاقت والا جسم اپنے سے کم طاقت والے جسم کو پیچھے دھکیل کر خود اپنی منزلِ مقصود کے نزدیک تر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں گویا بقائے اصلح کا قانون کارفرما ہے۔

آگے چل کر حکیم صاحب کہتے ہیں کہ

"وہ پتھر جو اوپر سے نیچے گرتا ہے اور ہوا کو چیرتا ہوا زمین پر آرہتا ہے۔ اور وہ ہوا جسے گہرے پانی کی تہ میں آپ اپنے منہ سے نکالتے ہیں۔ اور وہ پانی کو چیرتی ہوئی اوپر آرہتی ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کی حرکت میں ایک ہی اصول اور ایک ہی قانون عمل کر رہا ہے یعنی پتھر ہوا کو چیرتا ہوا مرکزِ زمین کی طرف جا رہا ہے اور پانی ہوا کو اوپر دھکیلتا ہوا خود مرکز کی طرف جا رہا ہے۔ فرض کرو کہ ہم زمین میں ایک سوراخ اتنا گہرا کھودتے ہیں جو مرکزِ زمین تک جا پہنچتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہوا اس سوراخ کی تہ تک جا پہنچے گی اس لئے طبیعی فلسفیوں کا یہ قول کہ ہوا حاشیۂ عالم کی طرف جانا چاہتی ہے غلط ہے۔

زمین کے مرکز کا نقطہ عالم کا مرکز ہے۔ اور یہی نقطہ تمام کائنات کا ستون ہے زمین کے وہ اجزا جو اس نقطے کے نزدیک تر ہیں اوپر والے اجزا کا ستون ہیں۔ زمین پانی کے لئے ستون کا کام کر رہی ہے اور اسے نیچے نہیں گرنے دیتی۔ پانی ہوا کا ستون بنا ہے اور اسے نیچے نہیں جانے دیتا۔ ہوا اثیر کے لئے ستون ہے اور اثیر کو نیچے آنے سے روک رہی ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جسمِ کلی یعنی عالم کے تمام اجزا بیقرار ہیں اور مضطرب کیونکہ ہر وقت ان کے اندر مرکز تک جا پہنچنے کی رغبت کارفرما رہتی ہے لیکن وہ وہاں پہنچ نہیں سکتے صرف وہ ایک جزِ نامتجزی جو مرکز کے نقطے پر ہے قرار میں ہے اور آرامیدہ ہے۔

اب ہم کہتے ہیں کہ اجزائے خاک کا زمین کے تمام اطراف پر ایک دوسرے پر تکیہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ خاک کے تمام اجزا مرکز کی طرف حرکت کر رہے ہیں۔ اسی طرح پانی کا بلندی سے نشیب میں بہ کر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ پانی مرکز زمین کی طرف حرکت کرتا ہے اور ہوا کا زمین اور پانی کے گرد لگا رہنا بھی اسی امر کی دلیل ہے کہ ہوا کا تکیہ بھی مرکزِ عالم پر ہے اور آگ (یعنی ایثر یا ایتھر) کا بصورتِ قبہ ہوا کے گرداگرد بندھے رہنا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایثر بھی مرکزِ عالم پر تکیہ لگائے ہوئے ہے۔

اسی طرح تمام افلاک بھی ان امہات کے گرداگرد قائم ہیں اور مرکز کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ جھکنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی مرکز کا قصد رکھتے ہیں لیکن یہ ستون جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ افلاک کو مرکز تک پہنچنے سے روک رہے ہیں۔"

یہاں تک حکیم صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس کو مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ مرکزِ زمین سے لے کر آسمانوں تک جتنے اجسام ہیں وہ ایک دوسرے کے لئے ستونوں کا کام کر رہے ہیں

آگے چل کر حکیم صاحب افلاک کی حرکت کی وجہ بتاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ

" افلاک کی حرکت جو بصورتِ دائرہ ہے۔ صانعِ حکیم کی قدرت کا کرشمہ ہے، سکون کا مقام سوائے اس نقطۂ وہمی کے جو مرکز زمین میں ہے۔ اور کہیں نہیں، عالم کے تمام اجسام اسی نقطۂ مرکز کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ یعنی سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اجزائے عالم کی تمام حرکات اسی سکون کی تلاش میں ہیں۔ پس جو چیز نقطۂ مرکز کے نزدیک تر ہے اس کی حرکت کمتر ہے اور جو چیز نقطے سے دور تر ہے اس کی حرکت بیشتر ہے اور فلکِ اعظم کہ جس کی حرکت تمام افلاک کی حرکت کا باعث ہے مرکزِ عالم سے دور تر مقام پر ہے اور جو چیز سکون کے خزانے (یعنی نقطۂ مرکز) سے دور تر ہوتی ہے وہ قطعاً سکون پذیر نہیں ہوتی اور جو چیز سکون سے محروم ہو وہ ہمیشہ متحرک رہتی ہے) جب یہ معلوم ہو گیا کہ تمام اجسام کی حرکت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ سکون کے مقام پر پہنچ جائیں تو پھر

افلاک کی حرکت بھی اسی سبب سے ہے۔ اس لئے ناچار آسمان معدنِ سکون کے گرد یعنی نقطۂ مرکز کے گرد گردش کرتا ہے ایک بیقرار بے آسائش گردش۔ آسمان کی یہ حرکتِ مستدیر اس لئے ہے کہ وہ مرکز پر پہنچنے کا راستہ ڈھونڈھ رہا ہے لیکن یہ ستون جو اس کے نیچے ہیں۔ اسے نیچے نہیں آنے دیتے۔ اور چونکہ یہ ستون لطیف ہیں اور ہموار ہیں اور ان میں کوئی کمی بیشی نہیں۔ اس لئے آسمان کی حرکت مستدیر ہو جاتی ہے یعنی دائرے کی شکل (یا بیضوی شکل) اختیار کر لیتی ہے۔

اسی طرح حکیمِ مطلق کی تدبیر سے یہ عالم قائم ہے۔ اکثر آدمی اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ اور ان ستونوں کو جو خداوند کریم نے اس قبۂ عظیم اور گنبدِ بلند کے نیچے کھڑے کئے ہیں۔ نہیں دیکھتے۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ کہتا ہے۔ اللہ الذی رفع السموات بغیر عمدٍ ترونھا۔"

ناصر خسرو کے ان بیانات کو سامنے رکھکر نیوٹن اور سیب کے درخت والی کہانی کو یاد کیجئے دنیا بھر میں یہ کہانی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز نیوٹن نے سیب کے ایک درخت سے سیب گرتا دیکھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جب یہ سیب شاخ سے علیحدہ ہوا، تو اس کے لئے شش جہات میں سینکڑوں رستے کھلے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اس نے اور کوئی رستہ اختیار نہیں کیا سیدھا بخطِ مستقیم زمین پر آ پہنچا۔ کہتے ہیں کہ اس خیال نے نیوٹن کے دل میں اتنی گہری جگہ بنالی کہ وہ دن رات اسی سوچ میں لگ گیا۔ اور آخر کار اس نے کششِ ثقل کا راز دریافت کر لیا۔ یہ ۱۶۶۶ء کی بات ہے جبکہ نیوٹن چوبیس سال کا تھا سیب کا یہ درخت ۱۸۳۰ء تک کھڑا رہا۔ جب کہ بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے وہ کاٹ لیا گیا اور اس کی لکڑی بڑی احتیاط سے محفوظ رکھ لی گئی۔

نیوٹن انگلستان کا مشہور ریاضی دان منجم اور فلاسفر تھا۔ وہ ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں فوت ہوا۔ ناصر خسرو علوی ۱۰۰۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۰۶۰ء میں فوت ہوا۔ کششِ ثقل کا قانون جو کہا جاتا ہے کہ نیوٹن نے دریافت کیا۔ فی الواقعہ نیوٹن سے ساڑھے چھ سو سال پہلے پوری طرح سے دریافت

تھا بلکہ اپنی ابتدائی صورت میں حکیم صاحب سے بھی پہلے کا دریافت شدہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قانون کے متعلق نیوٹن نے مزید بہت سی مفید اور ضروری معلومات
کیں۔ اور اس قانون کے متعلق تجربی اور حسابی اندازے معین کئے۔ لیکن جہاں تک اصول کا
ہے حکیم ناصر خسرو نے قانون کششِ ثقل کو بتمامہ منضبط کر لیا تھا۔ نیوٹن کی اور اس کے بعد
تحقیقات نے اس قانون کو ایک باضابطہ سائنس کی صورت میں مرتب کر لیا ہے۔ ذیل میں اس قانون
موجودہ معلومات جو ہمارے مضمون کے متعلق ہو سکتی ہیں اختصار کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) زمین کی سطح سے اوپر کسی نقطے سے اگر کوئی چیز گرائی جائے تو وہ بخطِ مستقیم زمین کے مرکز
رخ پر زمین پر گر جاتی ہے۔

(۲) کششِ ثقل کے عمل سے ہر ایک جسم ہر دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے خواہ وہ جسم
چیز کا بنا ہو۔

(۳) اس کشش کا ظاہری اثر اسی صورت میں نظر آتا ہے کہ ان دو کھینچنے والے جسموں میں سے ایک
بڑا ہو، مثلاً کرۂ زمین اور دوسرا بعید چھوٹا ہو مثلاً پتھر کا ٹکڑا۔

(۴) کارک کا ایک ٹکڑا اور سیسے کی ایک گولی اگر ایک ہی بلندی سے ایک ہی وقت گرائی جائیں تو یہ
چیزیں ایک ہی وقت زمین پر پہنچیں گی۔

(۵) ہر ایک سیارہ (بشمولِ زمین) سورج کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ لیکن کشش کی طاقت فاصلے کے
کی نسبت سے معکوس ہوگی۔ یعنی اگر فاصلہ تین گنا ہو تو کشش کی طاقت $\frac{1}{9}$ حصہ رہ جائے گی۔ اسی
کھینچنے والے جسم کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی کشش کی طاقت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

(۶) سورج چاند زمین، سیارے اور ستارے سب ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔

(۷) چاند، زمین کے مرکز کی طرف کھینچا جا رہا ہے۔ اور اسی لئے وہ زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا
کششِ ثقل کی وجہ سے چاند ہمیشہ اپنے مدار پر قائم رہتا ہے۔ اور زمین سے ہمیشہ ایک ہی فاصلے
تا ہے۔ زمین پر آ نہیں گرتا۔

۸۔ زمین اور نظامِ شمسی کے دوسرے سیارے سورج کے مرکز کی طرف کھینچے جاتے ہیں اس
وہ سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اور کششِ ثقل کی وجہ سے ہمیشہ اپنے اپنے مدار پر قائم رہتے ہیں
سورج پر نہیں جا گرتے۔ (وہی بات ہے کہ اگر طالب کی رسائی اپنے مطلوب کے گھر تک نہ ہو سکے تو
اس کے گھر کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے)

بیاناتِ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ سماوات اور افلاک یا بالفاظِ دیگر اجرامِ سماویہ سورج، چ
ستارے سیارے اور زمین وغیرہ سب کے سب قانونِ کششِ ثقل کی وجہ سے اپنے اپنے مقام او
اپنے مدار پر قائم ہیں۔ اور ان کی حرکات بھی اسی قانون کے تحت ہیں۔ یہی جذب و انجذاب جو ہر ایک جسم
مختلف اطراف سے عمل کر رہا ہے۔ اجسام کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھتا ہے۔ اگر کششِ ثقل کا یہ قانون
نہ ہو تو چاند زمین پر آگرے۔ زمین سورج پر جا گرے اور سورج کسی اور چیز پر جا گرے۔ اور تمام نظام
درہم برہم ہو کر تباہ ہو جائے۔

وہ کون انسان ہوگا۔ جو ان چیزوں پر غور کرے اور یہ چیزیں اس کے لئے خداوندِ علیم و حکیم
قدیر و خبیر کی نشانیوں کا کام نہ دیں۔

ان اللہ یمسک السموٰت والارض | اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو روکتا ہے کہ وہ اپنے رستہ
ان تزولا۔ ولئن زالتا ان امسکھما من | سے ہٹ نہ جائیں، اور اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے
احد من بعدہ، انہ کان حلیما غفورا (۳۵-۴۱) | بعد کوئی انھیں روک نہیں سکتا)

اس آیت سے ایک اور نہایت دلچسپ اور پُرلطف نکتہ نکلتا ہے۔ آیتِ عنوان سے تو ص
یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورج چاند اور ستارے غیر مرئی ستونوں پر قائم ہیں اور نیچے نہیں گرتے۔ لیکن ان
یمسک والی آیت میں زمین بھی شامل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بھی انہی غیر مرئی ستونوں
قائم ہے اور اس لئے سورج پر نہیں جا گرتی۔ جیسا کہ قانونِ کششِ ثقل کے متعلق موجودہ زمانے کی نئی
سے ثابت ہوتا ہے۔

آیت زیبِ عنوان کا ظاہر بھی آپ نے دیکھا۔ یہ اس کا باطن تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ

کے اندر ابھی اور کتنے بطن پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے کہ علوم کی روز افزوں ترقی آنے والے زمانہ میں اس کے اور بطون کا بھی انکشاف کرے۔

عربیت میں اپنی کم سوادی کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے اس معاملے میں میری رائے کسی وقعت کی مستحق نہیں۔ لیکن یہ امر واقع ہے کہ لڑکپن سے لیکر آج تک سرسری تلاوت کے دوران جب کبھی میں نے اس آیت کو پڑھا۔ میں نے اس کا یہی مطلب سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو غیر مرئی ستونوں پر قائم کر رکھا ہے۔ کبھی ایک دفعہ بھی میرا ذہن دوسری طرف نہیں گیا۔ پانچ چار روز کی بات ہے کہ میں نے اس مضمون پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو از روئے احتیاط ایک ترجمے والے قرآن مجید سے اس آیت کا ترجمہ پڑھا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب میں نے یہ معلوم کیا کہ ترونہا کا مطلب تو کچھ اور ہی ہے دوسرا ترجمہ دیکھا۔ تیسرا دیکھا اور اسی طرح کئی ترجمے دیکھے۔ سب میرے خیال کی تردید کر رہے تھے۔ تسلی نہ ہوئی تو اور ترجمے اور تفسیریں دیکھنی شروع کیں، بالآخر معلوم ہوا کہ میرا خیال بالکل بے بنیاد نہ تھا۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے (اور ممکن ہے کہ میرا یہ خیال بالکل غلط ہو) کہ عام مترجم اور مفسر غیر مرئی ستونوں والی بات کو بعید از قیاس سمجھ کر دوسرا ترجمہ کرنے پر مجبور ہوئے، چنانچہ ان میں سے بعض نے تو ان ستونوں والی روایت کی بالفاظِ صریح تردید بھی کردی چنانچہ ایک مفسر لکھتے ہیں کہ

"خدا نے اپنی قدرتِ محضہ سے بے کسی ستون کے آسمانوں کو اوپر اٹھا رکھا ہے جو ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے موجود ہیں۔

بعض مفسر اس جملہ کے یہ معنی بھی بیان کرتے ہیں کہ اس نے تمہارے دیکھنے میں بے ستون آسمان اونچے کئے۔ یعنی آسمانوں کے ستون تو ہیں مگر نظر نہیں آتے اور بعض تفسیروں میں اگرچہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے یوں معنی بیان کئے گئے ہیں کہ قاف پہاڑ پر ایک لمبا ستون ہے جس پر آسمان اس طرح قائم ہیں جس طرح خیمہ چوب پر کھڑا کیا جاتا ہے مگر وہ ستون اہل دنیا کو نظر نہیں پڑتا۔

لیکن حدیث شریف کے رو سے نیز مناسبتِ مقام سے یہی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ تمہاری

آنکھوں دیکھنے کی بات ہے کہ خدا نے آسمانوں کو بدون کسی ستون اور ٹیک کے اتنا اونچا بلند کر رکھا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ستون ہوتا تو آخر تمہیں نظر ہی آتا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباس وغیرہ کو اس آیت کے کسی دوسرے ترجمے کی گنجائش ہی نظر نہ آئی۔ اس لئے وہ کوہِ قاف والی تعبیر پر مجبور ہوئے۔ جس طرح دوسرے مفسر غیر مرئی ستونوں والی بات کو غیر ممکن سمجھ کر دوسرے ترجمے پر مجبور ہو گئے۔ واللہ اعلم۔ موجودہ زمانے کے مترجمین و مفسرین میں سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولوی محمد علی لاہوری نے اس آیت کی تفسیر میں قانونِ کششِ ثقل کی طرف صریح اشارے کئے ہیں۔

نوٹ:۔ قانونِ کششِ ثقل کی تحقیق کے سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کششِ ثقل کشش کرنے والے جسم کے مرکز کی طرف ہوتی ہے۔ مثلاً کششِ ثقلِ ارضی میں کرۂ ارض کا ہر جزو اور کرۂ ارضی کے مضافات کی تمام چیزیں زمین کے مرکز کی طرف کھنچی جاتی ہیں۔ گویا زمین کا وہ جزو جو زمین کے مرکز پر ہے۔ باقی تمام اجزا و اجسام کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ حالانکہ عملی طور سے بہت بڑے جسم والی چیز بہت چھوٹے جسم والی چیز کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

مرکزِ زمین ایک نقطہ ہے۔ ایک وہی نقطہ، جس کا نہ عرض ہے نہ طول نہ گہرائی۔ حکیم ناصر خسرو کہتے ہیں کہ اس نقطے میں خاک کے ایک جزوِ نامتجزی (یعنی ایک ایٹم یا اس سے بھی کمتر) کے سوا اور کسی کی گنجائش ہی نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ خاک کا وہ جزوِ نامتجزی یعنی وہ حقیر ناچیز موہوم (یا معدوم) جزو جو نقطۂ مرکز پر ہے۔ جہاں بھر کے تمام جسیم جسموں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ حکیم صاحب اس مشکل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس جزوِ نامتجزی کا کارنامہ نہیں بلکہ کسی قاہر کا قہر ہے یعنی خدا کا حکم ہے جو ہر جسم کو اس نقطۂ مرکز کی طرف کھینچ رہا ہے۔

یہی مشکل نیوٹن کے ذہن میں بھی آئی۔ دیکھئے اس نے اس مشکل کو کس طرح حل کیا۔ وہ کہتا ہے کہ "کسی کرہ کی کشش بیرونی اجسام پر اس طرح عمل کرتی ہے گویا اس کرے کا کل مادہ مرکز پر جمع ہے۔" نیوٹن نے کرۂ ارضی کے تمام مادے کو مرکز کے نقطۂ موہوم پر جمع کر دیا۔ لیکن قہرِ قاہر کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان فلسفی اور ایک یورپین فلسفی کی ذہنیتوں میں کتنا فرق ہے۔
ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

یورپ کے علماء و فضلاء سوائے الٰہیات کی کتابوں کے اور کسی علم و فن کی کتاب میں خدا کا نام تک نہیں لیتے۔ برعکس اس کے حکیم ناصر خسرو اپنے تمام فلسفیانہ مقالات میں خواہ وہ طبیعیات کے متعلق ہوں۔ یا مابعد الطبیعیات کے متعلق، جابجا اور موقعہ بموقعہ قرآنِ کریم کی آیات کو اپنے نظریات کی تائید میں بطور سند پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہم لوگ اگر حکیم صاحب کی طرح علوم جدیدہ کے قطعی اور یقینی اصولوں کی روشنی میں قرآن مجید کی آیات پر غور کیا کریں تو یقین ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کے بطون اور بطون در بطون کے متعلق روزانہ نئے نئے انکشافات ہوتے رہا کریں البتہ اس کے لئے قرآنِ کریم کے مسلسل اور متواتر مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ما طفلِ کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی

اور

مقدمہ ترجمۃ القرآن

(۲)

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

بالجملہ مواقع اختلاف لغتیں بسیار است و مترجم دریں صورت مضطر است باقامۃ حرفے والضرورات تبیح المحظورات۔ فصل لفظ است علامت ربطی است کہ درمیان حاشیتیں جملہ ہا اسمیہ وظرفیہ باشد زید قائم است زید کجا است و علامت اسناد فعل بفاعل تقدیم فاعل متصل آوردن فعل زید اسناد عند الضرورت اسناد زید میتواں گفت و مفعول بہ ناب مناب فاعل باشد یا بحرف مقرون

الحاصل، دو زبانوں کے مواقع اختلاف بہت ہیں اور اس لئے مترجم مضطر ہو جاتا ہے کہ (ادارِ مفہوم کے لئے) کسی حرف (لفظ) کو اپنی جانب سے پیش کرے چنانچہ مشہور مقولہ ہے۔ "الضرورات تبیح المحظورات۔ ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں"۔

فصل۔ (چونکہ یہ ترجمہ بزبانِ فارسی ہے اس لئے چند باتیں فارسی تراکیب سے متعلق بھی گوش گذار رہنی چاہئیں) فارسی میں لفظ "است" ربط کی علامت ہے جو جملہ اسمیہ و ظرفیہ کے ہر دو اطراف کے درمیان رابطہ کو ظاہر کرتا ہے مثلاً "زید قائم است" "زید کجاست" درحقیقت یہ علامت ہے فاعل کی جانب انتسابِ فعل کی اس شرط کے ساتھ کہ فاعل کو مقدم کرتے ہوئے فعل کو اس کے متصل لاتے

می شود زدم زیدرا وزدہ شد زیدرا وبنوعی از تسامح می تواں گفت زید زدہ شد اگر قرینہ قائم باشد حذف راجائز است ومفعول مطلق اگر برائے عدد باشد بیک بار گردن ودو بار کردن می تواں تقریر کردن واگر برائے نوع باشد یک نوع کردن ویک طور کردن واگر غیر مصدر بجائے مصدر قائم کردہ باشند گویند ضربت سوطاً زدم یک چابک واگر غیر لفظ فعل باشد قرأت سرداً خواندم بطریق پے درپے خواندن واگر برائے مجرد تاکید باشد یا از قبیل سبحان اللہ وغلہ اللہ از قبیل لغتین است بدون تکلف وارجاع بحرف دیگر میسر نہ شود واگر مفعول لہ بمعنی غرض باشد بلفظ برائے یا بلفظ تا وتصویر مصدر

اور علامت "است" کو آخر میں بیان کرتے ہیں، گویا "زید قائم ست" کی مثال میں ضرورت کے وقت "است" کو اسنادِ زید کہا جا سکتا ہے۔

اور "مفعول" قائم مقام فاعل کے ساتھ ہوتا یا کسی حرف (علامت) کے ساتھ مقرون ہوتا ہے مثلاً "زدم زیدرا" یا "زدہ شد زیدرا" اور تسامح کے طور پر اس دوسرے جملہ کو یوں بھی ادا کر دیتے ہیں۔ "زید زدہ شد" اور اگر قرینہ موجود ہو تو (مفعول کا) حذف بھی درست ہے۔

اور مفعول مطلق اگر عدد کے لئے ہو تو یہ ظاہر کرنا چاہئے کہ ایک مرتبہ یا دو مرتبہ کیا مقصود ہے اور اگر اظہار نوع کے لئے ہو تو "نوع" اور "طور" کو بیان کرنا چاہئے اور اگر غیر مصدر کو مصدر کی جگہ رکھیں مثلاً ضربت سوطا" تو اس طرح ترجمہ کریں گے "زدم یک چابک"

اور اگر مفعول، فعل کے لفظ سے جدا لفظ میں ادا کیا جائے، مثلاً "قرأت سرداً" تو یوں کہیں گے "خواندم بطریق پے درپے خواندن۔ میں نے مسلسل پڑھنے کے طریق پر پڑھا۔

اور اگر صرف تاکید ہی کی غرض سے مفعول کو لایا جائے یا مفعول کا ذکر اس طرح ہو جیسا کہ (عربی زبان کے استعمالات میں) "سبحان اللہ" میں ہے تو یہ ہر دو لغات (عربی وفارسی) کے اختلاف کے قبیل سے ہے اور بغیر تکلف اور دوسرے حرف کے لوٹائے بغیر صحیح ترجمہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

واگر مفعول لہ "غرض" کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو لفظ "برائے" یا لفظ "تا" لاتے ہیں اور جملہ

بصورت جملہ ضربتہ تادیباً زدمش برائے دادن ادب یا تا ادب وہم واگر بمعنی حاصل باشد بلفظ بعلت و بحکم و بمقتضائے وامثال آں قعد جبناً نشت بعلت نامردی واگر بمعنی احتراز باشد بلفظ احتراز و برائے احتیاط وامثال آں ضربتہ ان یقول الناس ماضربتہ زدمش برائے اجتناب ازانکہ گویند نہ زدمش ومفعول فیہ بلفظ درو مکان باشد یا زمان ومفعول معہ بلفظ با استوی الماء والخشبۃ برابر شد آب با چوب وحال اگر کلمہ مفرد باشد یا اشتقاق لفظے کہ موضوع برائے حال باشد، جئت راکبا سوار آمدم واگر جملہ ملتمہ از فعل ذی الحال باشد با یثار لفظ کردہ وکناں ومثل آں جاء زید یتبختر فی مشیہ زید آمد تبختر کناں در رفتار خود واگر جملہ ملتمہ از فعل غیر ذی الحال باشد ناچار لفظ حال آنکہ زیادہ کردہ شود ہرچند

"ضربتہ تادیباً" میں ترجمۂ فارسی کے اندر مصدر کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے "زدمش برائے دادنِ ادب" یا "زدمش تا ادب وہم"

اور اگر مفعول لہٗ "حاصل" اور "ثمرہ" کے معنی میں مستعمل ہوا ہے تو اس کے لئے فارسی ترجمہ میں لفظ "بعلت" "بحکم" "بمقتضا" جیسے الفاظ لانے ہوں گے مثلاً "قعد جبناً" کا ترجمہ یہ ہو گا۔ "نشست بعلتِ نامردی" (یا بہ سبب نامردی)

اور اگر "احتراز" کے معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے تو اس صورت میں لفظ "احتراز" یا "برائے احتیاط" یا اسی قسم کے الفاظ لائے جائیں گے مثلاً "ضربتہ ان یقول الناس ماضربتہ" کا ترجمہ یوں کرینگے "زدمش برائے اجتناب از آنکہ گویند نہ زدمش"

اور مفعول فیہ کا فارسی ترجمہ ظرف مکان وظرف زمان دونوں حالتوں میں لفظ "درو" کے ساتھ کریں گے۔ اور مفعول معہ کو لفظ "با" کے ساتھ ظاہر کریں گے۔ مثلاً "استوی الماء والخشبۃ" کا ترجمہ "برابر شد آب با چوب" ہوگا۔

اور حال اگر مفرد کلمہ ہو تو فارسی ترجمہ میں ایک ایسے لفظ کا اشتقاق کرنا ہوگا جو حال کے معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو، مثلاً "جئت راکبا" کا ترجمہ "سوار آمدم" ہوگا۔

سل لغتِ فارسیہ نیست حال درزبانِ عربی بمعنی شی نیامد گاہی موکد باشد" جارنی ابوک عطوفاً وگاہی
نی نہیا فادخلوہا خالدین وگاہے بمعنی قصد آید جئت اشکر اللہ ودر فارسی ایں معانی مستعمل نیست تمیز
از عددی یا وزنی یا پیمانہ یا مساحت باشد بصیغۂ تمیز یا باضافہ یا لفظ از بیان کردہ شد بست مرد
رطل گندم یک صاع از جو واگر از اسم اشارہ بلفظ صفت ماذا اراد اللہ بہذا مثلاً چہ چیز ارادہ کردہ است

اور اگر حال جملہ ہے اور ذوالحال کے فعل و عمل پر مشتمل ہو تب لفظ "کردہ" "کنان" جیسے الفاظ کو اختیار کرنا ہوگا۔ مثلاً "جار زید متبختراً فی مشیہ" کا ترجمۂ فارسی "زید آمد تبختر کنان در رفتار خود" ہوگا

اور اگر جملۂ ذوالحال کے فعل کے علاوہ فعل پر مشتمل ہو تو لفظ "حالانکہ" کے اضافہ بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ اگرچہ فارسی کے "اصل لغت" میں اس کا وجود نظر نہیں آتا، یہ بھی واضح رہے کہ "حال" عربی زبان میں "شئے" کے معنی میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔

حال کبھی تاکید کے معنی میں آتا ہے مثلاً "جارنی ابوک عطوفاً" میرے پاس میرے باپ آمد ہمدردانہ آمدہ ہے"۔ اور کبھی "تہیٔ" اور "تیاری" کے معنی میں جیسا کہ "فادخلوہا خالدین" پس داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہنے کی تیاری کرتے رہو"۔ اور کبھی بمعنی قصد آتا ہے مثلاً "جئت اشکر اللہ" میں آیا کہ اللہ کی شکر گذاری کروں"۔

اور فارسی زبان میں یہ معانی مستعمل نہیں ہیں۔

اور تمیز، اگر عدد، وزن، پیمانہ، یا مساحت سے ہو تو فارسی ترجمہ میں یا تمیز کا صیغہ استعمال کریں گے یا اس کو اضافت کے ذریعہ ظاہر کریں گے اور یا لفظ "از" سے اس کا اظہار ہوگا۔ مثلاً "بست مرد"، "یک رطلِ گندم"، "یک صاع از جو"۔

اور اگر اسم اشارہ سے "تمیز" مقصود ہے تو "صفت کا لفظ" ترجمۂ فارسی میں اس کو ادا کرے گا مثلاً "ماذا اراد اللہ بہذا مثلاً" کا ترجمہ یہ ہوگا "چہ چیز ارادہ کردہ است خدا ازیں مثال" یعنی ایسی مثال بیان کرنے سے خدا نے کیا ارادہ کیا ہے۔

خدا ازیں مثال و اگر از نسبت باشد بتحویل فاعل یا مفعول کردہ شد یا از روئے و از جہت و باعتبار فزود
آمد زید حسن دارا زید نیک است از روی خانہ و باعتبار خانہ و گاہی در فارسی مضمون غیر را بنوعی از
تصرف کہ دو کلمہ یک ساختن است ادا کردہ شود ضاق قلباً تنگ دل شد ہو قاسی قلباً وی سخت دل
است و گاہے در عربی مفعول بغیر توسط حرف جیر باشد و در فارسی توسط حرف جیر لازم شود فسیکفیکہم اللہ
کفایت خواہد کرد ترا خدا از شر ایشاں و مثل قالوا اتخذ اللہ ولدا و گفتند فرزند گرفت خدا و مثل اعطیت
زیداً درہما درہم دادم زید را و مثل کان زید قائماً بود زید قائم و بود زید قائم است و جعلت زیدا
عبدی زید را بندۂ خود ساختم در ایں صورت ہا تقدیم و تاخیر را بر خود ہموار باید ساخت و گاہی جملہ را

اور اگر نسبت سے تمیز مطلوب ہے تو اس صورت میں اس کو فاعل یا مفعول میں منتقل کریں گے
اور یا لفظ "از روئے" "از جہت" "باعتبار" اضافہ کرکے معنی بیان کریں گے۔ مثلاً "زیدٌ حسنٌ داراً" کا
ترجمہ ہوگا "زید خوب است از روئے خانہ" یا "زید نیک است باعتبار خانہ"
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوسری زبان کا مضمون فارسی زبان میں اس تصرف کے ساتھ ادا
کرتے ہیں کہ دو کلمات کو ایک کلمہ بنا لیتے ہیں مثلاً "ضاق قلباً" "تنگدل شد" یا "ہو قاسی قلباً۔ وے
سخت دل است" (یعنی ضاق اور قلباً کا ترجمہ تندل یا قاسیٌ اور قلباً کا ترجمہ سخت دل کر دیا گیا)
اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ عربی زبان میں تو مفعول بغیر حرفِ جر کے استعمال ہو جاتا ہے مگر فارسی
زبان میں حرف جر کا لانا ضروری ہوتا ہے مثلاً "فسیکفیکہم اللہ۔ کفایت خواہد کرد ترا خدا از شرِ ایشاں"
اور بعض جملے ایسے ہوتے ہیں جن کے ترجمہ میں زبان کے محاورات کے پیش نظر اپنی جانب
سے تقدیم و تاخیر کو درست کر لیا جائے مثلاً "قالوا اتخذ اللہ ولدا۔ وگفتند فرزند گرفت خدا" اور "اعطیت
زیداً درہما۔ درہم دادم زید را" اور "کان زیدٌ قائماً۔ بود زید قائم یا بود زید قائم است" اور "جعلت زیداً
عبدی۔ زید را بندۂ خود ساختم" (یعنی عربی کے یکساں جملوں کے ترجمہ میں مختلف اسلوب کے ساتھ فعل
و فاعل کی تقدیم و تاخیر کو اختیار کیا گیا ہے۔

بتاویل مصدر ساختہ باشد بمصدر و مفرد تقریر تواں کرد مصدر مفرد را بجملۂ مصدرہ بآں مصدر بہ تفسیر نتواں نمود و
بچنیں موصول باصلہ اش بکلمۂ مفردہ و بالعکس و قال الذی آمن گفت آں مسلماں والذین آمنوا مسلماناں والذین
و توا الکتاب اہل کتاب و ایں در اں صورت است کہ معنی واضح باشد مثل قد افلح المومنون الذین ہم فی صلاتہم
خاشعون ہر آئینہ رستگار شدند آں مسلماناں کہ ایشاں در نماز خویش خشوع کنند کا منوا یعنی اگر موصول صفت اسمی
واقع شد با تقدیم لفظ آں براں موصوف کردہ شد و علامت تخصیصی کہ از تقدیم معمول مستفاد می شود در فارسی نیز
نست کم وہم وہو و ایاہ در بعض مواضع بخود تعبیر کردہ می شود و در فارسی بتواں گفت شما راست گویند یا ایشاں اند

اور کبھی وہ جملہ جس کو بہ تاویل مصدر بنا لیتے ہیں ترجمہ میں مصدر اور مفرد ہی بیان کیا جاتا ہے۔

اور مصدر مفرد کی تفسیر اس جملہ کے ساتھ جو اس مصدر کو شروع میں لئے ہوئے ہو نہیں کر سکتے اور اس طرح
موصول باصلہ اگر جملہ ہو تو اس کی تفسیر کلمۂ مفردہ کے ساتھ اور اگر کلمۂ مفردہ کی صورت میں ہو تو اس کی تفسیر جملہ
کی صورت میں نہیں کی جا سکتی مثلاً "وقال الذی آمن" کا ترجمہ "گفت آں مسلمان" ہوگا اور "الذین آمنو" کی
تفسیر "ایمان والو ہوگی" اور "الذین اوتوا الکتاب" کا ترجمہ "اہل کتاب" کریں گے اور یہ اس صورت میں ہے کہ
معنی واضح اور صاف ہوں۔

اور مثل "قد افلح المومنون الذین ہم فی صلاتہم خاشعون" ہر آئینہ رستگار شدند آں مسلماناں کہ ایشاں
در نماز خویش خشوع کنند" میں "الذین ہم" ایسا ہے جیسا کہ "الذین آمنوا" یعنی اگر موصول صفت اسمی واقع ہوا ہو تو
اس پر لفظ آں کو مقدم کر کے اس کو موصوف بنا دیا جائے گا (جیسا کہ "آں مسلماناں" میں کہا گیا) اور معمول کو مقدم کر کے
جب تخصیص کے معنی حاصل کئے جائیں تو فارسی زبان میں اس تخصیص کی علامت بھی لفظ "آں" مقرر ہے۔

عربی زبان کی ضمائر "کم" "ہم" "ہو" "ایاہ" کا ترجمہ بعض مواقع میں خود بخود تعبیر کر لیا جاتا ہے اور فارسی
زبان میں ان کو اس طرح کہہ سکتے ہیں "شما راست گوئید" یا "ایشاں اند راست گوی" ان جیسے مواقع میں اس
کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ یوں کہا جائے "ایشانند راست گویاں" (یعنی "ایشاں" کے بعد "راست گویاں"
کو جمع لانا ضروری نہیں ہے)۔

است گوی احتیاج آں نیست کہ گویند ایشاں ندراست گویاں واگر مظہر موضع مضمر وضع کردہ باشند لفظ آں زاید کردہ شد نامربوط باشد در فارسی علامت بفعل ملحق کنند ہرچند فاعل مظہر باشد قام ہولار ایستادند ایشاں واو وفا بسیار است کہ زائد باشد و بسیار کہ در فارسیہ معنی آں ربط بغیر ذکر عطف و تعقیب درست شود پس اگر رکاکت لفظ دریں صورت در ترجمہ لازم می آید ترک کردہ شد بالجملہ دقائق فن ترجمہ بسیار است ومقصود من اینجا بیان نموزجی است حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ بحمد اللہ والمنۃ کہ ایں رسالہ متبرکہ بتاریخ بست یکم جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ بخط عاصی پر معاصی محمد علی الحسینی القطبی باختتام رسید اللھم اغفر لکاتبہ۔

اور اگر ایسا موقع ہے کہ وہاں مضمر لانا چاہئے مگر اس جگہ مظہر لایا گیا تو فارسی زبان میں اس مقام پر لفظ "آں" اضافہ کرنا چاہئے تاکہ ربط باقی رہے اور جملہ غیر مربوط نہ ہونے پائے۔

فارسی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ خواہ فاعل مظہر (الفاظ میں ظاہر و موجود) ہو، فعل کے ساتھ علامت مفرد و جمع کو ضرور ملحق کرتے ہیں مثلاً "قام ہولار" کا ترجمہ "ایستادند ایشاں" کیا جائے گا۔

"واؤ" اور "فا" اکثر زائد ہوتے ہیں اور معنی نہیں رکھتے اور فارسی زبان میں یہ طریقہ اکثر و بیشتر رائج ہے کہ عطف اور تعقیب کے ذکر کے بغیر "واؤ" اور "فا" کو ربط کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں۔ پس اگر اس صورت میں ترجمہ کے اندر رکاکتِ لفظی پیدا ہو جائے تو "واؤ" اور "فا" کا ترجمہ ترک کر دینا چاہئے۔

الحاصل۔ فنِ ترجمہ کی باریکیاں بہت ہیں اور اس مقام پر ہمارا مقصود صرف نمونہ کے طور پر چند باتیں بیان کر دینا ہے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

اللہ کا شکر و احسان کہ یہ متبرک رسالہ بخط عاصی پر معاصی محمد علی الحسینی القطبی ۲۱ جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ اختتام کو پہنچا۔ اللھم اغفر لکاتبہ

ڈاکٹر نکلسن

از پروفیسر ڈاکٹر اے جی آربری و پروفیسر ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب دہلی یونیورسٹی

مستشرق شہیر فقید ری نولڈ ایلین نکلسن سابق پروفیسر عربی کیمبرج یونیورسٹی آن معدودے چند منتخب ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی اسلامی فلسفہ و علوم بالخصوص تصوف کے مطالعہ اور خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ گذشتہ اگست میں وہ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

چونکہ راقم کو ان سے ایک علاقہ روحانی اور ان کی شاگردی کا فخر رہ چکا ہے، اس لئے موجودہ مختصر مقالہ میں ان کے سوانح زندگی قلمبند کر کے بظاہر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ گو یہ فرض ایسا ہے کہ اس سے سبکدوش ہونا معلوم۔ اس مختصر مقالہ کا ابتدائی حصہ میرے عزیز اور فاضل دوست اے۔ جے۔ آربری، ایم اے، لٹ ڈی، نائب مدیر کتاب خانہ انڈیا آفس کے قلم سے فارسی زبان میں روزگارِ نو جلد ۳ شمارہ ۲ میں ۱۹۴۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد میں نے بعض اپنے مشاہدات بھی قلمبند کئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مقالہ کی تحریر میں اپنے عزیز دوست کو بھی شریک کیا ہے ورنہ میرے نزدیک یہ بات انصاف سے بعید تھی کہ اپنے مضمون کی بنیاد تو ڈاکٹر آربری کے مضمون کو بتاؤں خود اس کا مصنف بنوں۔

ری نولڈ ایلین نکلسن کی ولادت ۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۸ میلادی کو ہوئی۔ ان کے والد ہنری نکلسن تاریخ طبیعی کے ماہر تھے، اور یکے بعد دیگرے اسکاٹ لینڈ کی تین مختلف یونیورسٹیوں میں کرسی فضیلت پر جلوہ افروز ہوئے، ان کے دادا بھی اپنے زمانے کے جید عالم اور کامل زبان داں سمجھے جاتے تھے، عربی زبان کے متعلق انھوں نے تحقیقاتِ عمیق کی، خوش قسمتی سے ڈاکٹر نکلسن کو اوائل عمر میں ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ اور یہی امران کے السنۂ شرقیہ کے ذوق کا مورث بنا۔ ڈاکٹر نکلسن ابتدا میں

سکاٹ لینڈ کی ابرڈین یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور وہاں سے ادبیات قدیم یعنی یونانی اور لاطینی کے مطالعہ سے فراغ حاصل کر کے کیمبرج تشریف لائے اور وہاں کے مشہور کالج ٹرینیٹی کالج میں داخل ہوئے اور ادبیات قدیمہ شرقیہ کے مطالعہ اور امتحانات میں امتیاز حاصل کیا، تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے اپنی زندگی عربی فارسی کے مطالعہ اور تعلیم و تعلم کے لئے وقف کر دی، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ان زبانوں کے مطالعہ کا ذوق ابتدا سے دامنگیر ہو چکا تھا، اور آپ نے اپنی ذاتی جدوجہد اور مثال سے اس مصرعہ کو سچ کر دکھایا کہ ع

باشیر در دروں شد و باجان بدر شود

کیمبرج میں ڈاکٹر نکلسن کو ایسے فاضل اور جید مستشرقین کی صحبت ملی جن کے شغف کی مثالیں بیرونی ممالک میں کم نظر آتی ہیں۔ مثلاً آپ کے اساتذہ میں میرے نزدیک سب سے مقدم مستشرق شہیر فقید اے، اے، بیون ہیں جن کے سامنے میں نے بھی کچھ عرصہ زانوئے ادب تہ کیا، پروفیسر بیون عربی کے ایسے شیدا تھے کہ آخر عمر بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مرتے دم تک اس زبان کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مقصد اہم شمار کرتے رہے یونیورسٹی کے قواعد کی پابندی کی بنا پر آپ رسمی ملازمت سے سبکدوش ہونے پر بھی کیمبرج ہی مقیم رہے۔ چونکہ ذاتی اثاثہ بھی رکھتے تھے، اس لئے اپنے شوق کو پورا کرنے کی نیت سے ٹرینیٹی کالج کے ارباب حل و عقد کی درخواست پر آپ برابر عربی کا درس دیتے رہے اور کبھی کیمبرج سے باہر جانے کا خیال بھی نہ کیا، میرا ذاتی اندازہ پروفیسر بیون کے متعلق یہ ہے کہ وہ پرانی وضع کے استاد تھے، مزاج میں شاید کسی قدر استبداد بھی تھا بایں ہمہ آپ کے فضل و دانش کی اس سے زبردست اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ آپ صحیح معنی میں اکثر مشہور مستشرقین کے تربیت کرنے والے یا جگت استاد تھے، جن میں پروفیسر براؤن آنجہانی اور ڈاکٹر نکلسن اور میرے عزیز دوست ڈاکٹر آربری بھی شامل ہیں۔[1]

مگر ڈاکٹر نکلسن کے ذوق کو بھڑکانے والے پروفیسر براؤن تھے، یہ خود ایک ایسی جذاب ہستی تھے کہ جو ایک بار ان کے اثر کے تحت میں آجاتا تھا مدت العمر ان کو نہیں بھولتا تھا بلکہ ان کا ادب اور احترام دائمی طور پر

---

[1] یہ جز ڈاکٹر آربری کے مضمون میں نہیں ہے۔

دامنگیر ہو جاتا تھا، چنانچہ یہی حال ڈاکٹر نکلسن کا تھا کہ پینتیس سال براؤن اور ان کا ساتھ رہا اور اس تمام عرصہ میں ادب میں فرق آنا تو درکنار اس میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی رہی۔ خود ڈاکٹر نکلسن کا ان کے بارے میں قول ہے کہ میری پہلی ملاقات پروفیسر براؤن سے ۱۸۹۱ء میں ہوئی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ان کی شکل و شباہت، وضع حالت اور شخصیت نے مجھ پر زبردست اثر کیا کیونکہ وہ خود ایک جذبہ سے پُر تھے، میں نے ان کا جو حلیہ یا شخصیت اپنے ذہن میں قرار دی تھی اس سے بالکل مختلف نکلے، قوتِ تعلیم ان کے ضمیر میں اس درجہ سمائی تھی کہ اپنے شاگردوں میں بھی ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیتے تھے، جب دیکھتے تھے کہ معرفت اندوزی کے سوا ان کا دوسرا مقصد نہیں ہے تو ان کی مشکلات کے رفع کرنے اور کام کو آسان بنانے میں دل و جان سے کوشاں ہوتے تھے۔ پروفیسر براؤن عالی صفات سے آراستہ تھے، اگر دنیا کے بڑے بڑے مستشرقین پر نظر ڈالیں تو میرا عقیدہ یہ ہے کہ وہ سب سے بڑی ہستی تھے جنھوں نے اہلِ مشرق کی زندگی، ان کے افکار اور ادبیات کی تحقیق کے لئے اپنے وجود کو سرتاسر وقف کر دیا تھا۔

جب پروفیسر براؤن پر اپنے شاگرد یعنی ڈاکٹر نکلسن کے جوہر کُھلے تو طالب علمی کے زمانے ہی سے ہر طرح ان کی امداد پر کمربستہ ہو گئے۔ خود صوفیا کی تصانیف اور افکار کے شائق تھے، ڈاکٹر نکلسن کے ذوقِ تصوف سے ان کو مسرت ہوئی، جب ان کی پہلی تالیف "منتخب اشعار دیوان شمس تبریزی" شائع ہوئی تو پروفیسر براؤن بڑے خوش ہوئے کہ ان کا اندازہ شاگرد کی قابلیت اور لیاقت کے بارے میں غلط نہیں نکلا، یہ کتاب ۱۸۹۸ء سنہ میلادی میں طبع ہوئی تھی، اس میں مولانا جلال الدین رومی کے اشعار کا جو انگریزی ترجمہ ہے اس کے متعلق پروفیسر براؤن نے ذیل کے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا:-

> "میں نے مشرقی اشعار کا ترجمہ انگریزی نظم میں ایسا کم دیکھا ہے جو خوبی اور صحت کے اعتبار سے نکلسن کے ترجمہ سے لگا کھا سکے" افسوس ہے تو اس بات کا کہ طباعت کے لئے نسخہ کا تیار کرنا، پروف کا صحیح کرنا، بے معنی جلسوں کی حاضری یا ایسے جھمیلے ہیں کہ ان کے پیچھے وہ یعنی ڈاکٹر نکلسن اور ہم جیسے بہتیروں کو وقت نہیں ملتا کہ جن مناسب ترین راستوں پر چلنے کے ہم خود آرزومند ہیں ان پر چلیں بلکہ ہمارا کام تو اکثر یہی رہتا ہے کہ مطالب معلومہ اور مبرہنہ کی تشریح یونیورسٹی کے لئے کرتے رہیں جو ہر چند کہ

دقیق نکتوں اور جزئیات کے معلوم کرنے کی حریص ہے۔

ان الفاظ کو غور سے دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان کو قلمبند کر کے پروفیسر براؤن نے ان میں ایک ایسا صحیح اشارہ پوشیدہ رکھا ہے جو السنۂ شرقیہ کی تحقیق اور تفتیش کرنے والوں کے لئے سالہا سال تک رہنمائی کا کام دے گا۔ ابھی بہت اہم ادبی تصانیف ہیں علی الخصوص فارسی مخطوطات جو طبع ہونے کی محتاج ہیں اور ایسے فاضل بھی ہیں جو ان آثار ادبیہ کی تشریح تفسیر اور تبیین کو دوسرے کام پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے وہ خواہ مخواہ مجبور ہیں کہ ایسے نسخوں کی طباعت اور نشر کا انتظام بھی اپنے ذمہ واجب جانیں اور نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو کم ایسے نکلیں گے جنھوں نے ڈاکٹر نکلسن کی طرح بے غرض اور ذاتی مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہ زحمت گوارا فرمائی ہو۔ ایسے کاموں کی زحمت کا صلہ کچھ شہرت سمجھ لیجئے یا کسی قدر مالی منفعت جو اس طرح کی زحمت اٹھائے ممکن ہے کہ اس کو صلہ دیر میں ملے لیکن یہ صلہ ناول نویس یا آسان رسالوں اور مقالوں کے مصنفوں کے صلہ سے کہیں زیادہ پائیدار ہوتا ہے جو نسلیں ابھی وجود میں نہیں آئیں وہ اڈورد براؤن اور نکلسن جیسے فاضلوں کی تصانیف کو سراہینگی کیونکہ ایسے علما اور فضلا ذاتی منفعت اور مصلحت کو ترک کر کے اس بات میں کوشاں ہوتے ہیں کہ سابقہ ادبی شاہکاروں کو پردۂ فراموشی سے باہر لائیں اور اس طرح بنی نوعِ انسان کے علم میں اضافہ کریں۔

ڈاکٹر نکلسن کچھ عرصہ لندن یونیورسٹی میں زبانِ فارسی کے استاد رہے لیکن جب ۱۹۰۳ء میلادی میں براؤن کیمبرج یونیورسٹی کی عربی پروفیسری کی کرسی پر رونق افروز ہوئے تو یہ بھی فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے وہاں تشریف لے گئے۔ مالی اعتبار سے ڈاکٹر نکلسن کو نقصان تھا مگر ان کی نظر میں دوسری یونیورسٹی کے بیش قرار مشاہرے کا شغل کیمبرج کے اس شغل کے مقابلہ میں ہیچ تھا۔ کیونکہ ان کو تو یہ لو لگی ہوئی تھی کہ کہ استاد کے ساتھ رہ کر تحقیق اور مطالعہ میں مصروف رہیں۔ ۱۹۲۶ء میلادی میں جب براؤن رحلت کر گئے تو ان کی جانشینی کے لئے نکلسن سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عربی کے پروفیسر بھی منتخب ہوئے اور ۱۹۳۳ء میلادی میں یونیورسٹی کے قواعد کی رو سے ان کے دستکش ہونے کی باری آئی تو ان ہی کے شاگرد سی، اے، سٹوری ان کے جانشین بنے۔ واضح رہے سٹوری وہی صاحب ہیں جو ایک زمانہ میں علی گڑھ

یم۔ اے، اوکالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔ یہاں سے جاکر وہ لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے مدیر
ن گئے تھے۔

ڈاکٹر نکلسن کی تالیفات اور تصانیف کی تشریح کے لئے اس مختصر کوچک میں گنجائش بلکہ
حق تو یہ ہے کہ ان کا اجمالی تذکرہ بھی ایک امر محال ہے کیونکہ ان کی تعداد کثیر ہے اور ان کے علاوہ
سر برآوردہ رسائل اور انجمنوں کے مجموعوں میں ان کے مقالے بے شمار ہیں۔ اس سے پیشتر رسالہ روزگارِ نو
کی ایک اشاعت میں مولانا روم کی مثنوی معنوی کے عمدہ چھاپے اور ترجمے اور شرح کا ذکر آچکا ہے۔
اس اہم تالیف پر ڈاکٹر نکلسن نے بیس سال سے زیادہ محنت کی۔ راقم الحروف جو سالہا سال سے آپ
کی دوستی کی نعمت سے بہرہ ور رہا ہے اس بات کا شاہد ہے کہ یہ فاضل بزرگ کم و بیش بیس سال مثنوی
کی تصحیح و طبع کے کام میں مصروف رہے اس دوران میں ایسا کم اتفاق ہوا کہ نصف شب کے بعد
ڈاکٹر صاحب اپنے کتب خانہ سے ایک گھنٹے سے زیادہ کے لئے باہر تشریف لے جائیں یہ کتاب فضل،
تحقیق، کوشش اور کاوش کا (ایسا) شاہکار ہے کہ تنہا شہرت جاوید کا سبب بن سکتی ہے اس کی طباعت،
ترجمہ اور شرح و تفسیر پر ڈاکٹر نکلسن کے مہم کام ختم نہیں ہوتے، ان کے ابتدائی مطبوعات میں حضرت
شیخ فریدالدین عطار کی مشہور تالیف تذکرۃ الاولیا ہے، جس پر انھوں نے کافی محنت کی یوں گنوانے
کے لئے ہم دو چار اور اہم مطبوعات کے نام درج کرتے ہیں مثلاً ابوالنصر سراج کی "کتاب اللمعہ" شیخ
محی الدین ابن عربی کی ترجمان الاشواق، ادبیات فارسی سے متعلق ان کی اہم تصنیف "تحقیقات در
باب تصوف اسلامی" ایک رسالہ ہے جس کا تعلق حضرت ابوسعید بن ابی الخیر کی ایک تصنیف سے
ہے۔ ان کی دوسری تالیفات "تحقیقات درباب شعر اسلامی" (کیمبرج ۱۹۲۱) عرفاے اسلام (لندن ۱۹۱۴)
تاریخ ادبی عرب (چاپ اول، لندن، ۱۹۰۷) تصنیف و تالیف کے کام کے ساتھ ساتھ نکلسن اعلیٰ فارسی
اور عربی نظم اور نثر کو بھی انگریزی میں ترجمہ کرتے رہتے تھے، ان میں سے اکثر آپ کی تالیف "شعر و نثر شرقی"
(کیمبرج ۱۹۲۲) میں شامل ہیں۔ یہ تالیف ابوسعید بن ابی الخیر عمعق بخارائی، انوری، فریدالدین عطار، باباکوہی
شیرازی، دقیقی، فردوسی، حافظ، جلال الدین رومی، کسائی، جامی، معزی، رواکی، سعدی اور عنصری کے

منظومات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر تحسین آمیز تقریظیں شائع ہوئیں اور ان کی اشاعت سے ایران کی ادبی میراث انگریزی لباس میں اہلِ انگلستان کی نظروں میں جلوہ گر ہوئی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مجھے اس جید فاضل کی دوستی کا فخر حاصل ہے اور انہی کے طفیل میں ادب فارسی و عربی کے بدائع آثار و افکار سے روشناس ہوا۔ ایامِ جوانی میں کیمبرج یونیورسٹی میں ان کا شاگرد ہونے کا بھی مجھے فخر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہوں کہ ایسے عالی مقام استاد اور ذوق و شوق والے فاضل سے میں نے عربی فارسی پڑھی جو کچھ میں نے قلمبند کیا ہے وہ سراسر ناکافی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ استاد نکلسن کے فضل و کمال کے مرتبہ کو تھوڑا سا ظاہر کرے اور ان کی تحقیق اور تتبع کے ذوق کو رونما کرے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ چند کلمے اس بزرگ کے حالات اور صفات کے بارے میں بھی تحریر کروں۔

زندوں کی مدح دقت طلب اور دشوار کام ہے کیونکہ اس سے خواہ مخواہ لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جو شخص مدح کر رہا ہے اس کا کوئی خاص مطلب ہے یا کوئی نفع پیشِ نظر ہے۔ راقم الحروف اپنے آپ کو اس جرم سے بری اور پاک جانتا ہے بلکہ ازراہِ صدق و صفائے کامل اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ یہاں جو کچھ ثبت ہوا وہ حق و حقیقت کی خدمت ہے یا اس نعمت کا شکریہ ہے (جو لطفِ الٰہی سے مجھے حاصل ہوئی) اس کے سوا میرا اور کوئی مقصد نہیں۔

ڈاکٹر نکلسن کی ذات میں انتہائے فضل و کمال کے ساتھ حد درجہ کی سادگی بھی جمع تھی، ان سے ملاقات اور مکالمہ کے دوران میں ان کی جبلی تواضع، انکسار، نیک مردی اور انسانیت کے جوہر ظاہر ہوتے تھے اہلِ انگلستان کم آمیزی اور کنارہ کشی کرنے میں مشہور ہیں، ڈاکٹر نکلسن میں بھی کم و بیش یہ اوصاف تھے مگر حق یہ ہے کہ وہ شرم رو تو تھے مگر جبلاً ایسے نہ تھے کیونکہ ان کی ذات میں مہربانی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جوانی کے زمانے میں نکلسن کو گولف کا صد درجہ شغف اور اس کے ساتھ استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ ورزش کا شوق کونسا انگریز ہے جسے نہیں، چنانچہ اس حیثیت سے یہ باکمال انسانیت کے اس میعار پر پورا اترتا ہے جو انگریزوں میں مروج ہے، مگر ان کے ذاتی جوہر اور صفات پوری تابانی اور درخشندگی کے ساتھ ظاہر ہوتے تھے تو ان کے کتب خانہ

ہیں، یہاں وہ بیٹھتے تھے تو اس شان سے کہ کتابوں میں محصور ہیں پائپ منہ سے لگا ہوا ہے اور قلب وفکر کے اسرار کا چشمہ ہے کہ ابل رہا ہے۔ راقم الحروف نے بارہا کتب خانے میں بیٹھکر ان کے ساتھ خود ان کی اور اپنی تصانیف کے خاکہ اور موضوع پر بحث کی ہے۔ دوسروں کی تالیفات بھی زیر بحث آئی ہیں اور یہی وہ کتب خانہ ہے جس میں معرفت حقیقی کے طریقہ اکتساب کی تہ کو پہنچا اور اس حقیقت سے واقف ہوا کہ وہ ایسی جستجو ہے جس کی انتہا نہیں، جس کی ابتدا جہل ہے۔ جسے انکسار اور فروتنی استقلال بخشتے ہیں جس سے بڑھکر فکر انگیز اور نشاط آور دنیا میں کوئی شے نہیں۔

یہاں تک تو میں نے اپنے عزیز اور فاضل دوست ڈاکٹر آربری کے مقالہ سے استفادہ کیا ہے میری ان کی رائے ڈاکٹر نکلسن کے بارے میں میرے کیمبرج کے دوران قیام میں ایک ہی ہوتی تھی، اب بھی میں ان کی تحریر کے حرف حرف سے اتفاق کرتا ہوں اس لئے نہیں کہ (یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا) ڈاکٹر آربری کی بدولت میری کیمبرج کی زندگی ایسی خوشگوار تھی کہ اس کی یاد میرے دل سے کبھی فراموش نہ ہوگی اور اسکی وجہ سے میں ہمیشہ متمنی رہوں گا کہ انھیں ہمراہ لے کر ان کے کالج یعنی پمبروک کالج اور اپنے کالج، کوئینز کالج میں دو چار مرتبہ ضرور چکر لگا آؤں۔ خود ڈاکٹر آربری کا انکسار، ڈاکٹر نکلسن کے انکسار فروتنی اور تواضع کا آئینہ دار ہے۔ السنہ شرقیہ کے مطالعہ سے بہرہ ور ہو کر ان حضرات نے بعض شرقی خصائص کو اپنی ذات کا لازمہ بنا کر ہمارے کلچر سے محبت کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ پروفیسر بیون کی خدمت میں ایک روز شام کو حاضر ہوا تو رخصت کے وقت باوجود اپنے علم وفضل اور حیثیت استاد ہونے کے پروفیسر بیون آنجہانی ازراہ اخلاق میرے ساتھ بطور مشایعت اپنے کمرے کے باہر تک تشریف لائے میرا اصرار تھا کہ وہ یہ زحمت نہ فرمائیں ادہر وہ ہیں کہ برابر میرے ساتھ گام فرسا ہیں۔ جب ان سے رخصت ہوئے تو میں نے ڈاکٹر آربری سے دریافت کیا کہ آیا بیون صاحب یہی طریقہ سب کے ساتھ مسلوک رکھتے ہیں جب میں نے ان سے نفی میں جواب پایا تو مجھے بیحد شرمندگی ہوئی کہ ایسے مسن اور صاحب فضل و کمال بزرگ کو میری وجہ سے یہ زحمت اٹھانی پڑی چنانچہ آئندہ کے لئے میں نے عزم مصمم کرلیا کہ اب پروفیسر صاحب کی خدمت میں ہفتہ یا اتوار کی شام کی حاضری ایک طرح کا ستم ہے جس کا متحمل میں نہیں ہوسکتا۔

مگر یہ بات ہر ہفتہ ڈاکٹر نکلسن سے ظہور میں آتی رہتی تھی کیونکہ میں ان کی خدمت میں ہفتہ میں ایک روز ضرور جاتا تھا اور وہاں ان کو اپنا کام دکھا کر اس پر بحث کر کے جب رخصت ہوتا تھا تو ناممکن تھا کہ وہ مشایعت نہ کریں چنانچہ جب میں اس کا عادی ہوگیا تو اپنی شرمندگی کا احساس بھی رفتہ رفتہ کم ہوگیا، لیکن ایک شرمندگی ہے جو مدت العمر فراموش نہ ہوگی، ایک مرتبہ ڈاکٹر نکلسن نے یونیورسٹی لائبریری سے اپنے نام سے ایک کتاب لے کر مجھے دی، میرے حافظہ نے وہاں جو جو گل کھلائے ان میں ایک یہ شاہکار بھی ہے کہ میں کتاب واپس کرنا بھول گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لائبریری کے قاعدے کے مطابق کتاب لینے والے کو جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ جب اس کا علم ہوا تو میں نے ہزار منت سماجت کی اور التماس کیا کہ اب جو تلافی میرے ہاتھ میں ہے اس میں ہارج نہ ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب نیکی کی پتلے تھے ہرگز رضامند نہ ہوئے کہ جرمانہ کی رقم جو انھوں نے ادا کی تھی قبول کریں۔

بعض لوگوں کا مسلک یہ ہے کہ وہ کاروبار میں دیانت کو ملحوظ رکھتے ہیں مگر ادبی اور صحافتی امور میں اس کے خلاف ورزی کرنا جائز بلکہ شیر مادر سے بھی زیادہ حلال سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک مستشرق کا مسلک تو یہ تھا کہ ایک دفعہ ان کے ذہن میں ایک خیال آجائے حق و انصاف کو نظر انداز کر کے وہ اس مضبوطی سے اس پر جمتے اور اس کی صحت کے ثبوت بہم پہنچانے میں کوشاں ہوتے تھے کہ بایدوشاید لیکن ڈاکٹر نکلسن کا طریقہ ان سے بالکل مختلف تھا، جس فن یا علم کی شاخ سے وہ ناواقف ہوتے اس کے متعلق کبھی انھوں نے واقفیت کا اظہار نہیں کیا، میں نے جب عبدالرحیم خانخاناں پر مقالہ لکھنے کا فیصلہ ان کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ واقعات اور اعداد و شمار کی صحت کے ذمہ دار تم خود ہوگے، فنی اعتبار سے مدد کرنے کے لئے میں حاضر ہوں۔ معلوم نہیں ان کی نشریات کو کتنے افراد نے غور سے دیکھا ہے کیونکہ ان میں صحت نامہ بھی بالعموم ساتھ لگا رہتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جو غلطی کتاب چھپنے کے بعد آخر وقت میں بھی ان کو نظر آگئی، صحت نامہ بنا کر اس میں درج کردی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی 'صحت' کا جذبہ ہے جس کی بدولت کیمبرج سائنس اور ریاضی کی تعلیم کے لئے مشہور ہے اور یہی 'صحت' ہے جو کیمبرج کے در و دیوار سے رونما ہے۔

ڈاکٹر آربری نے ڈاکٹر نکلسن کے ایک وصف پر روشنی نہیں ڈالی، یعنی ان کی مذہبی گفتگو
بحث سے گریز کو واضح نہیں فرمایا۔ میں نے خود اس بات کا احساس کیا اور تصدیق اس کی ڈاکٹر آربری نے
فرمائی۔ اسی طرح کبھی انھوں نے اپنے بچوں کا بھی ذکر نہیں کیا۔ مذہبی گفتگو سے تو وہ ہمیشہ علیحدہ رہتے
تھے لیکن جس بات سے معلومات میں اضافہ ہوتا تھا اس کے پوچھنے میں وہ چنداں تکلف نہیں برتتے تھے،
مگر دریافت کرتے تھے تو حد درجہ جھجک کے ساتھ، چنانچہ ایک مرتبہ تصوف پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک ہندوستانی
صاحب نے محض ان کی اطلاع کے لئے ظاہر کر دیا کہ وہ ایک سلسلہ میں منسلک ہیں یہ سن کر ڈاکٹر صاحب
نے بہت بے تابی کے ساتھ جھجک جھجک کر استفسار کیا۔ کہ آپ کے ہاں شغل و تعلیم کیا ہے۔ مگر یہاں
وہ صاحب مجبور تھے بہت تاسف کے ساتھ معذرت کی اور عدم اظہار کی اجازت چاہی چنانچہ معاملہ
رفت گذشت ہو گیا، جہاں تک مجھے معلوم ہے ان صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان پھر اس موضوع
پر گفتگو نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب تو شرم و حیا کے پتلے تھے ہی، ان کی اہلیہ محترمہ اس بات میں ان سے بھی بڑھکر
تھیں، چنانچہ جب کبھی وہ باہر چلتی پھرتی نظر آتی تھیں تو اکثر یہی مشاہدہ میں آتا تھا کہ ان کی نظر زمین پر
گڑی ہوئی ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی پردہ نشین ہندوستانی خاتون ہے جو کسی سخت مجبوری
کے ہاتھوں پردے سے باہر نکل آئی ہے اور اپنے ماحول سے حد درجہ پریشان ہے کسی نے ازراہ اخلاق
سلام بھی کیا تو ادھر سے جواب ندارد۔ بعض لوگ گمان کریں گے کہ متکبر ہوں گی جواب نہیں دیا لیکن
انصاف یہ ہے کہ جو ان سے ملا اور واقف ہو چکا ہے وہ کیسے تکبر کا قائل ہو سکتا ہے اس معاملہ میں
ڈاکٹر نکلسن بھی ان کے قدم بقدم تھے، یا یوں کہئے کہ ان سے بڑھکر لوگ ٹوپی اٹھا کر سلام کرتے ہیں،
اور یہ ہیں کہ اپنے خیال میں غرق۔

پطرس البستانی

از جناب مولوی حافظ رشید احمد صاحب ارشد۔ ایم۔ اے

معلم پطرس البستانی کا نام انیسویں صدی کے عربی ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔ اور عربی ممالک اور بالخصوص علاقہ شام میں ان کی قومی اور علمی خدمات آنیوالے ادبا اور رہنماؤں کے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنیں گی۔ وہ عربی ممالک کے سرسید و شبلی تھے، جنھیں مختلف تعلیمی، علمی، ادبی اور معاشرتی تحریکات کی بنیاد ڈالنے کا فخر حاصل ہے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی علوم کے بہترین ثمرات سے اپنی قوم کو لطف اندوز بنایا۔ اور سب سے پہلے عربی صحافت کی بنیاد ڈالی۔ موجودہ زمانے میں شام اور بیروت میں جو علمی چرچا ہے اور مختلف ادیبوں اور فضلاء کی طرف سے جو قابلِ قدر کتابیں شائع ہورہی ہیں ان سب کا سرچشمہ پطرس البستانی تھے۔ جنھوں نے مختلف علمی انجمنوں اور علمی و ادبی تصانیف کے ذریعے وہ علمی بیداری پیدا کی۔ جس کی وجہ سے عربی زبان اور لٹریچر مغربی زبانوں کے ہم پلہ ہوگئے اور بیروت کا نام چار دانگ عالم میں مشہور ہوا۔

پطرس بستانی پہلے شخص تھے جنھوں نے اس "دورِ تنزل" میں سب سے پہلے عربی انسائیکلو پیڈیا کو ترتیب دینے کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور تن تنہا عربی "دائرۃ المعارف" کی کئی ضخیم جلدیں شائع کیں نیز عربی زبان کی جدید طرز پر نہایت آسان اور جامع ڈکشنری تحریر کی۔

اگر ایک طرف ان کے قابلِ قدر علمی کارنامے ہیں تو دوسری طرف ان کے تعلیمی، قومی اور معاشرتی کارنامے بھی کم اہمیت نہیں رکھتے۔ تعلیم نسواں کی حمایت میں انھوں نے اس وقت آواز بلند کی جب عورتوں کی حمایت میں کچھ کہنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے سرسید کی طرح اعلیٰ درجہ کا تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا جو دیگر مدارس کے لئے قابلِ رشک نمونہ ثابت ہوا۔

پطرس، شبلی کی طرح کثیر تصانیف کے مالک تھے، تاریخی مضامین پر محققانہ نظر رکھتے تھے اور انھوں نے "فنافی العلم" ہونے کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

ایسی حالت میں یہ بیجا نہ ہوگا۔ اگر ہم ایسی اعلیٰ شخصیت کے مختصر سوانح حیات قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کریں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے حالات ہمارے علمی اور ادبی حلقے کے لئے قابلِ تقلید ہوں گے اور انھیں عزم و عمل کی دعوت دیں گے۔

ابتدائی حالات معلم پطرس بستانی، جنوبی بستان کے بستانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے مورثِ اعلیٰ کے پاس ایک بڑا باغ تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ "بستانی" کہلانے لگے تھے۔ پطرس کے باپ رومن کیتھولک عیسائی تھے، اور پطرس "دبہ" کے گاؤں میں ۱۸۱۹ئہ میں پیدا ہوئے۔ اور اسی گاؤں کے ایک مدرسہ میں مشہور معلم الخوری فیخائیل بستانی کی زیرِ نگرانی تعلیم پانے لگے۔ انھوں نے حسب دستور عربی اور قدیم سریانی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اور بہت جلد اس مدرسہ میں قابلِ استاد کو دو ہونہار شاگرد ایسے نظر آئے، جن میں ترقی کرنے کے پورے امکانات موجود تھے، ان میں سے ایک پطرس بستانی تھے، جب ان دونوں ہونہار طالب علموں نے گاؤں کے ابتدائی مدرسے کی تعلیم مکمل کرلی تو استاد موصوف نے شام کے علاقہ صور و (صیدا) کے لاٹ پادری عبداللہ البستانی کے پاس ان کی سفارش لکھ بھیجی، تاکہ عیسائی مشن کی طرف سے انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع عطا کئے جائیں۔ چنانچہ ان کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی اور یہ طالب علم عین ورقہ کے ہائی سکول میں داخل کرلئے گئے

تعلیم و تدریس اس اسکول میں پطرس نے عربی صرف و نحو، عروض اور علم البیان کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ، حساب اور عیسائی دینیات کی تعلیم بھی حاصل کی، رومن کیتھولک کلیسا کا مدرسہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے لاطینی، سریانی اور اطالوی زبانیں بھی سیکھیں۔ اس طرح وہ شرقی اور مغربی علوم کے فاضل بن گئے چونکہ ان مدارس کا سب سے بڑا مقصد عیسائی مبلغ اور پادری بنانا ہوتا تھا۔ اس لئے رومن کیتھولک کلیسا کے طریقے کے مطابق مزید مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلیسا نے ان دونوں ہونہار طالب علموں کو اٹلی کے دارالحکومت اور پاپائے روم کے مستقر روم

میں بھیجنے کا ارادہ کیا۔ پطرس کا ساتھی شبلی تو روم چلا گیا اور وہاں سے آنے پر کلیسا کا مشہور پیشوا بن گیا مگر پطرس کی قسمت میں دنیائے علم وادب کی سرداری لکھی تھی۔ اس لئے وہ روم نہیں جاسکے۔ کیونکہ ان کی والدہ کو ان کی مفارقت گوارہ نہ تھی۔ لہذا وہ عین ورقہ کے مدرسہ میں مسند تعلیم وتدریس پر سرفراز ہوئے اور وہاں یہ سلسلہ ۱۸۴۰ء تک قائم رہا۔

بیروت میں ترجمان ۱۸۴۰ء کا سال شام کے لئے نہایت پریشان کن سال تھا۔ اس زمانے میں مغربی طاقتوں کے جہاز سواحلِ لبنان پر منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ اور خاص کر برطانیہ، آسٹریا اور جرمنی کے جہازوں کی آمد ورفت بکثرت ہونے لگی تھی، بیروت لبنان کی زبردست بندرگاہ تھی۔ اور انگریزوں کی کافی تعداد تجارتی اغراض کے لئے وہاں قیام پذیر ہوگئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے پطرس کو اپنا ترجمان مقرر کرلیا اور اس طریقے سے ان کا ربط وضبط انگریزوں سے بڑھ گیا۔ اور انھیں انگریزی زبان کو بآسانی سیکھنے کا موقع مل گیا۔

امریکن مشن سے تعلق اس عرصہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کی تبلیغ واشاعت کے لئے امریکن مشنری بھی آپہنچے اس سے پیشتر شام وفلسطین کے عیسائی زیادہ تر رومن کیتھولک کے کلیسا سے تعلق رکھتے تھے اور خود پطرس بھی اس فرقہ کے پیرو تھے مگر چونکہ اس مشنری گروہ میں کئی فاضل اور مشرقی ادب کے دلدادہ اشخاص بھی شامل تھے۔ اس بنا پر بہت جلد انھوں نے پطرس کو اپنے زمرہ میں شامل کرلیا۔ پطرس بھی ایک آزاد اور روشن خیال عیسائی تھے۔ اس لئے پروٹسٹنٹ فرقہ کے پیرو بن گئے۔

ان لوگوں میں ڈاکٹر کرنیلیوس وانڈیک کی شخصیت اپنے اندر ایسی مقناطیسی کشش رکھتی تھی، کہ بہت جلد انھوں نے پطرس کو اپنا فریفتہ بنالیا۔ درحقیقت ڈاکٹر وانڈیک ایک بڑے قابل مستشرق اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ پطرس کے ساتھ ان کی مخلصانہ دوستی کی ابتدا اسی عرصہ میں ہوئی۔ مگر رفاقت ومحبت کا یہ ایسا پیمان محکم تھا جو تمام عمر استوار رہا۔ اور اس میں کبھی شکست وریخت نہیں ہوئی۔

۱۸۴۶ء میں ڈاکٹر کرنیلیوس وانڈیک نے عبیہ کے مقام پر ایک اعلیٰ قسم کا مدرسہ قائم کیا اور وہاں تعلیم دینے کے لئے پطرس کو بلالیا۔ پطرس نے اس مدرسہ میں دوسال تعلیم دی۔ اس عرصہ میں انھوں نے

علم حساب میں ایسی جامع کتاب تحریر کی جو قدیم و جدید تمام حسابی قاعدوں پر حاوی تھی اور اس قدر قبول ہوئی کہ تمام مدارس میں داخلِ نصاب ہوئی۔ اسی زمانے میں ان کا فرزند اکبر سلیم بستانی پیدا ہوا جوان کے آخر زمانے میں ان کے علمی مشاغل اور صحافت نگاری میں ان کا زبردست معاون بنا۔

اصلاحی تحریکات ۱۸۴۸ء میں پطرس بستانی بیروت میں امریکن سفارت خانے کے مترجم مقرر ہوئے اور ۱۸۶۲ء تک اسی خدمت پر فائز رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے مختلف قومی اور علمی انجمنوں میں کام کیا۔ اور مختلف جلسوں میں اصلاحی اور معاشرتی لیکچر دیئے۔ اس زمانہ میں تعصب اور باہمی نفاق و اختلاف اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ پطرس جیسے شریف دل نے محسوس کیا کہ عوام کی اخلاقی تربیت اور ان کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے تقاریر اور تصانیف کے علاوہ انھوں نے اخبارات سے بھی کام لیا۔

علمی مشاغل ۱۸۶۰ء کے بعد انھوں نے ایک اخبار "نفیر سوریا" جاری کیا۔ اور بائبل کے عربی ترجمہ میں ڈاکٹر عالی سمتھ کی اعانت کی، ان کے آخری سال ان کی عمر کا بیش قیمت حصہ تھے۔ کیونکہ انہی برسوں میں انھوں نے وہ علمی کارنامے سرانجام دیئے جو ہمیشہ ان کی یادگار رہیں گے، اسی زمانہ میں انھوں نے ایک قومی سکول بھی قائم کیا۔

پطرس ساری عمر طالب علم رہے، غیر ملکی زبانوں اور مختلف علوم و فنون کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ آخر میں بھی انھوں نے یونانی اور عبرانی جیسی قدیم اور کٹھن زبانیں سیکھیں ان کا انتقال ۱۸۸۳ء میں حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوا ان کی موت شام اور لبنان کے علمی حلقے میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان ثابت ہوئی اور تمام قوم نے بلا لحاظ مذہب و ملت یہ محسوس کیا، کہ ان کا ہر دلعزیز "قائد علمی" دنیا سے رخصت ہوگیا۔ جنازے پر بے شمار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ شام کے راستے پر مقبرۂ انجابیہ میں ان کو دفن کیا گیا۔

صد سالہ برسی پطرس البستانی شام کے وہ واحد بلند پایہ عالم تھے، جن کی صد سالہ برسی بلاد عربیہ کے تمام عالموں اور ادیبوں کی طرف سے منائی گئی کیونکہ اس تحریک پر جس کی ابتدا، مشہور عربی

مورخ نقولا بازنے کی تھی۔ تمام عربی اخبارات اور ادبا نے صدائے لبیک بلند کی تھی۔ اور ۱۹۱۹ء میں امریکن کالج
بیروت کے ہال میں ان کی صد سالہ برسی منانے کے لئے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں شہر کے
لوگوں کے علاوہ ۶۵ بڑے بڑے عالم اور ادیب شریک تھے۔ جن میں عرب کی ۹ ادیب خواتین بھی
شامل تھیں۔ ان سب فاضلوں نے اپنی تقریر میں انیسویں صدی میں شام کے اس علمی قائد کے
علمی کارناموں کی داد دی۔

اخلاق وعادات

معلم پطرس البستانی کتابوں کے عاشق زار تھے۔ انھیں علم کا اسقدر شوق تھا کہ
ان کے دوست جب ان سے ملنے کے لئے آتے تھے تو ہمیشہ وہ انھیں اپنے کتب خانہ میں کتابوں اور
اوراق کے انبار کے نیچے دبے ہوئے پاتے تھے۔ علم کی محبت میں وہ ہر چیز کو قربان کرنے سے دریغ نہ کرتے
تھے۔ محبت اور مستقل مزاجی ان کے اخلاق وعادات کی دو نمایاں خصوصیات تھیں جو کام وہ شروع کر دیتے تھے
اسے کر کے چھوڑتے تھے۔ وطن کی محبت اور خدمت کو انھوں نے اپنا شیوۂ زندگی بنا لیا تھا۔ وہ اپنی قوم
اور وطن کے سچے اور مخلص خادم تھے۔ سادگی، کفایت شعاری، تواضع، حلم وبردباری اور خوش اخلاقی نے
ابنائے وطن میں ہر دلعزیز اور بارسوخ بنا دیا تھا۔ انہی اوصاف کی بنا پر وہ ہر ایک کو نیک مشورہ دیتے تھے
ان کا دل مذہبی تعصب سے بالکل پاک وصاف تھا۔ اس وجہ سے وہ بلا لحاظ مذہب وفرقہ اپنے
ہم وطنوں کی خدمت اور بھلائی میں کوشاں تھے۔

قومی مدرسہ کی بنیاد

پطرس چونکہ خود بلند اخلاق اور عمدہ کیرکٹر کے مالک تھے۔ اس لئے یہی جذبہ وہ اپنے
قومی مدرسہ کے طالب علموں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہفتہ میں دو مرتبہ وہ صرف "اخلاق وتہذیب"
پر لیکچر دیتے تھے اور ان کی اخلاقی نگرانی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مدرسہ میں ممالکِ مصر
ترکی، یونان، عراق اور عجم سے طالب علم کھنچے چلے آتے تھے۔ یہاں عربی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی
زبان کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ حکومت کے معزز عہدہ دار اس قومی سکول کا معائنہ کرنے کے لئے آتے تھے
چنانچہ خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے ان کی اس حسنِ خدمات پر انھیں ایک تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔ یہاں کے

جرائد و رسائل | پطرس نے جو اخبارات و رسائل شائع کئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) نفیرسوریا۔ یہ دو صفحوں کا چھوٹا سا اخبار تھا جو ۱۸۶۵ء میں جاری ہوا۔ مگر اس پریشان کن دور میں اس کے تیرہ نمبر ہی شائع ہوئے تھے کہ یہ بند ہو گیا۔

(۲) الجنان۔ اس نام سے سیاسی علمی ادبی اور تاریخی پندرہ روزہ رسالہ ۲۲ صفحات میں ۱۸۷۵ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے سرورق پر "حب الوطن من الایمان" لکھا رہتا تھا۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا۔ اور اس کی اشاعت بہت زیادہ ہو گئی۔ اس رسالہ کے اکثر مضامین ان کے بڑے صاحبزادے معلم سلیم کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے تھے اس رسالہ میں عوام کی دلچسپی کے لئے ایک مسلسل کہانی بھی شائع ہوتی تھی۔

(۳) الجنۃ۔ یہ ہفتہ وار اخبار پطرس نے ۱۸۷۵ء میں اپنے بیٹے سلیم کی معاونت میں "نفیر سوریا" کے بند ہونے کے بعد شائع کیا۔ جس میں زیادہ تر سیاسی اور تجارتی خبریں ہوتی تھیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے سہ روزہ کر دیا گیا۔ پطرس کی وفات کے بعد کئی سالوں تک اس اخبار کو ان کے بیٹے سلیم اور نجیب نکالتے رہے۔

(۴) الجنینۃ۔ اس نام سے انھوں نے ایک اور اخبار ۱۸۷۱ء میں جاری کیا۔ یہ ہفتہ میں چار مرتبہ شائع ہوتا تھا۔

تصنیفات | (۱) سب سے پہلے انھوں نے ڈاکٹر عالی سمتھ کے ساتھ مل کر توراۃ (بائبل) کے ایک بڑے حصے کا عربی میں ترجمہ کیا۔

(۲) دو تین کتابیں صرف و نحو میں تحریر کیں۔ جن میں عربی گرامر کے طویل مسائل کو نہایت آسان اور مختصر طریق سے طلبا کو ذہن نشین کرایا گیا تھا۔

(۳) محیط المحیط کے نام سے ایک عربی لغات ۱۸۷۵ء میں دو جلدوں میں شائع کی۔ اس لغت کی ترتیب حروف تہجی پر حروفِ اول کے لحاظ سے رکھی گئی تھی۔ اس میں علوم و فنون کی اصطلاحات معربات اور مروجہ عجمی الفاظ کی تشریح بھی کی گئی تھی۔ عوام کے الفاظ اور علمی اصطلاحات کے الفاظ دونوں نہایت کثیر تعداد میں جمع کئے گئے تھے اور ان سب الفاظ کی تشریح نہایت آسان عبارت میں کی گئی تھی۔

اپنی نمایاں خصوصیات اور امتیازی شان کی وجہ سے خلافت عثمانیہ کی طرف سے مولف کو

مجیدی تمغہ اور ڈھائی سو مجیدی پونڈ بطور اعزاز و انعام عطا ہوئے تھے۔

(۴) قطر المحیط، کے نام سے بڑی ڈکشنری کا اختصار بھی خود انھوں نے کیا تھا۔

(۵) دیوان متنبی کی شرح۔

(۶) "کشف الحجاب فی علم الحساب" کے نام سے...... انھوں نے حساب کے قاعدوں پر ایک نہایت مکمل اور جامع کتاب تحریر کی جو تمام تعلیمی مدارس میں بہت مقبول ہوئی۔

(۷) اسی طرح "بک کیپنگ" پر بھی عربی زبان میں انھوں نے ایک کتاب تحریر کی۔

(۸) رابنسن کروسو کا سفر نامہ۔ اس کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ۔ مصنف اور مولف ہونے کے ساتھ ساتھ پطرس البستانی ایک زبردست خطیب اور لیکچرار بھی تھے۔

عربی انسائیکلوپیڈیا پطرس کا سب سے بڑا کارنامہ عربی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف ہے۔ اس زمانے میں جبکہ انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تبویب کا کام خود یورپ میں بھی ابتدائی حالت میں تھا اور وہاں کی ترقی یافتہ زبانیں بھی اس سے خالی تھیں۔ پطرس کا عربی زبان میں "دائرۃ المعارف" کی ضخیم جلدیں شائع کرنا نہایت اولوالعزمی کا کارنامہ تھا انھوں نے یہ کام اس وقت شروع کیا جبکہ بلاد عربیہ پر جہالت، ادبار و انحطاط کی سیاہ گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اور کوئی شخص ان کا ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام میں انھیں صرف اپنے بیٹے سلیم، سلیمان اور معدودے چند آدمیوں کی اعانت حاصل ہوئی مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری، بلکہ اس کے ابواب کو ترتیب دیکر ۱۸۷۶ء میں اس کا پہلا حصہ شائع کیا۔ اس کے بعد ہر سال آٹھ سو صفحات کی ایک جلد شائع ہوتی رہی۔ مگر افسوس کہ وہ چھ حصے ہی شائع کرنے پائے تھے کہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہا۔ اور ۱۹۰۵ء تک اس کے گیارہ حصے شائع کر دئے گئے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی وفات کے بعد اور کوئی حصہ شائع نہیں ہو سکا چنانچہ اب یہ "کوششِ ناتمام" اس زبردست ادیب کی یادگار بن کر رہ گئی۔ مگر عربی ادب میں اس کے کارنامے مکمل اور غیر فانی رہیں گے۔

ادبیات

نغمۂ توحید

از جناب ماہر القادری صاحب

دعائے شام و سحر لا الہ الا اللہ
یہی ہے زادِ سفر لا الہ الا اللہ

سکونِ قلب و جگر لا الہ الا اللہ
کمالِ فکر و نظر لا الہ الا اللہ

نہ کہکشاں نہ قمر لا الہ الا اللہ
نہ کچھ اِدہر نہ اُدھر لا الہ الا اللہ

تمام ملتیں باطل ہیں صرف اک اسلام
یہی ہے راہگذر لا الہ الا اللہ

اسی میں دولتِ دنیا یہی ہے دولتِ دیں
متاعِ اہلِ خبر لا الہ الا اللہ

ملا رہا ہوں نگاہیں میں کجکلاہوں سے
نہ خوف ہے نہ خطر لا الہ الا اللہ

بتوں کو توڑ تخیل کے ہوں کہ پتھر کے
ذرا بھی دیر نہ کر لا الہ الا اللہ

دیارِ حبیب

از جناب سید وزیر حسن صاحب عابدی، ایم، اے

میں جہاں رہ نورد ہوں اے دوست
نہ زمیں ہے نہ آسماں ہے وہاں

قطعِ منزل نمودِ منزل ہے
کارواں پیشِ کارواں ہے وہاں

اک جہاں ہے جہانِ لامحدود
اک فضا ہے کہ بیکراں ہے وہاں

خیرہ کن ہیں فضا کے نظارے
خیرگیِ دل کی رازداں ہے وہاں

محوِ حیرت نگاہ لب خاموش
خامشی حکمِ جاوداں ہے وہاں

ہاں مگر میرِ کارواں کی صدا — یہ صدا جانِ کارواں ہے وہاں

یہ صدا اس افق سے آتی ہے — جو بااقصائے این وآں ہے وہاں

یہ صدا ہے حیات کی تفسیر — یہ صدا شرحِ دوجہاں ہے وہاں

اک صدا ہے صدائے گوش بگوش — محفلِ ہوش یک زباں ہے وہاں

دفترِ کائناتِ گونا گوں — ایک مربوط داستاں ہے وہاں

ہر نفس شرحِ زندگانی ہے — زندگی ہر نفس جواں ہے وہاں

زندگی اپنے حسنِ جلوت میں — رونقِ بزمِ دوستاں ہے وہاں

بزم میں کہکشاں کی کیفیت — حسن والفت کی زندگی یعنی

ہر ستارے میں کیفِ حسنِ سحر — دلکشی اور سادگی یعنی

سب ستارے قدم قدم آزاد — حسنِ تنظیمِ زندگی یعنی

سب ستارے روش روش مجبور — پاسِ آدابِ رہروی یعنی

سب نمودِ کمال کے پابند — بندگی اور سروری یعنی

ان کی رفتار ہیں دوامِ خرام — شوق کی سعیِ دائمی یعنی

ہر قدم مست، ہر قدم ہشیار — جذبِ ہمدوشِ آگہی یعنی

ان کی رفتار ہیں کمالِ روش — سارے عالم کی رہبری یعنی

میرِ مجلس امینِ رازِ وجود — بندہ اور شانِ ایزدی یعنی

مالکِ شش جہات حاکمِ کل — سر پہ تاجِ شہنشہی یعنی

مسند آرائے شانِ درویشی — فقر وفاقہ کی زندگی یعنی

نگہِ قاہری جلال آثار — برقِ جانِ ستمگری یعنی

چشم مخمور رحمت آمادہ — سلسبیلی وکوثری یعنی

تبصرے

جعفر منصور از مولوی ابوالقاسم صاحب رفیق دلاوری تقطیع خورد ضخامت ۱۵۱ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت بے جلد عہ پتہ:۔ اقبال اکاڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور۔

خلافتِ بنی عباس کا موسس اور پہلا خلیفہ ابوالعباس سفاح تھا جو تقریباً پانچ سال تک حکمرانی کرنے کے بعد وفات پاگیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا۔ یہ بڑی آن بان اور تزک و احتشام کا فرمانروا تھا۔ سیاسی تدبر کے ساتھ علم و فضل کی دولت سے بھی بہرہ یاب تھا۔ اسی نے بغداد آباد کیا۔ اور سیاسی فتوحات کے ساتھ بہت سے علمی تہذیبی اور تمدنی کارنامے بھی کئے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوجعفر منصور ہی سب سے پہلا خلیفہ ہے جس نے خلافتِ بنی عباس کو استحکام بخشا اور اسے عالمِ اسلام کا سب سے بڑا سیاسی اور مذہبی مرکز بنایا۔ ان خوبیوں کے ساتھ اس کا دامن بعض بے گناہوں کے خون اور جبر و تشدد کے دھبوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ لائق مولف نے اس کتاب میں شستہ اور پاکیزہ زبان میں اسی خلیفہ کے حالات اور کارنامے مستند حوالوں سے لکھے ہیں اور بعض نازک مواقع پر بھی ان کا قلم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹنے پایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از مولوی محمد ایوب صاحب اصلاحی تقطیع خورد ضخامت ۱۲۸ صفحات کتابت و طباعت متوسط قیمت عہ پتہ:۔ موتمر المصنفین کوچہ چیلاں بیت السعید دہلی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح طیبہ اور غزوات و اخلاق و مکارم کا تذکرہ بہت ہی اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ زبان عام فہم اور سلیس ہے اور واقعات مستند اور صحیح ہیں۔

آب... از ... فہ ... سلطان: تقطیع خورد ضخامت ۸۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۰ ار

پتہ:۔ ادارۂ ادبیات حیدرآباد دکن۔

مولفہ نے یہ کتاب گفتگو کے انداز میں بچوں کے لئے لکھی ہے جس میں انھیں پہلے حیدرآباد کے جغرافیہ سے متعلق موٹی موٹی باتیں بتائی ہیں۔ پھر یہاں کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد موجودہ حیدرآباد کی صنعتوں، پیشوں، زبانوں، رہن سہن کے طریقوں، حکومت کا نظام اور اس کے کارناموں وغیرہ کی نسبت موٹی موٹی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ عام اور سرسری واقفیت کے لئے یہ کتاب مفید اور دلچسپ ہے۔

المنبهات علی الاستعداد لیوم المعاد تقطیع خورد ضخامت ۱۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۴ر پتہ:۔ اقبال اکاڈمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور۔

یہ کتاب ایک طرح کی عربی ریڈر ہے جو علامہ ابن حجر ہیثمی مکی کی تالیف ہے۔ اس میں مختلف ابواب ہیں اور ہر باب میں متعدد نصیحت آموز اقوالِ نبویہ۔ صحابۂ کرام۔ بزرگانِ اسلام اور حکما کے مقولے ہیں یہ کتاب اخلاقی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے اس لائق ہے کہ ہمارے مدارس اور اسکولوں کے ابتدائی نصاب عربی میں اس کو شامل کیا جائے۔

نصرتِ دین و اصلاحِ مسلمین کی ایک کوشش از مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع خورد ضخامت ۸۸ صفحات۔ قیمت ۸ر

ایک اہم دینی دعوت از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ تقطیع خورد ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ۲ر

دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ الفرقان بریلی۔

یہ دونوں کتابیں اگرچہ دو مصنفوں کے قلم سے ہیں۔ لیکن ان کا موضوعِ بحث اور اندازِ بیان واستدلال قریب قریب یکساں ہی ہے۔ ان میں مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تحریک اصلاح و تبلیغ کے حالات اور اس کی اہمیت وضرورت کو خود مولانا مرحوم کے اقوال و مکالمات اور عہدِ نبوی کے نظام تلقین و تربیت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے اور اربابِ صلاحیت واستطاعت حضرات سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس تحریک کی اہمیت اور افادیت کو پورے طور پر محسوس کرکے اس میں شامل ہوں اور اس کی مدد کرکے عنداللہ اجر و ثواب کے مستحق قرار پائیں امید ہے کہ ان کا مطالعہ بہت سے بے خبر مسلمانوں کے لئے عبرت و بصیرت کا سبب ہوگا۔

۱۹۴۳ء۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت سے مجلد ہے

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

۱۹۴۴ء۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ اور مستند ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت۔ صدیوں کے قانونی مطالبے کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپے مجلد سات روپے۔

خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ہے مجلد ہے

۱۹۴۵ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

۱۹۴۶ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقامِ عبدیت مع الالوہیت کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد سے

قصص القرآن حصہ چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ... قیمت ... مجلد عہ

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) **محسنِ خاص** :- جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین** :- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین** :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبّا**۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
عتیق الرحمٰن عثمانی

برہان

جلد پنجدہم شمارہ (۶)

ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۴ھ و محرم سنہ ۱۳۶۵ھ مطابق دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس مہینہ کے ختم پر ندوۃ المصنفین کی زندگی کا آٹھواں سال پورا ہو رہا ہے۔ اس قلیل مدت میں اس ادارہ نے جو کام انجام دیا ہے خدا کا شکر ہے کہ اس پر کارکنوں کو شرمندہ اور محجوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے ابھی اس ادارہ نے عالمِ وجود میں قدم رکھا ہی تھا کہ دنیا کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ شروع ہو گئی۔ جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں ابتری اور پراگندگی پیدا کر دی۔ ایک نوزائیدہ نخلِ آرزو تیز و تند شعلہ بار ہواؤں کے تھپیڑوں میں اگر باغبان کی تمناؤں کے مطابق نشو و نما نہیں پا سکا تو اس پر نہ تعجب ہونا چاہئے اور نہ افسوس! کیونکہ اگر وہ ان سخت نامساعد اور ناموافق حالات میں اپنی طبعی حالت پر قائم بھی رہ سکا ہے تو اس کا یہ نفسِ قیام بجائے خود اس کی فطری توانائی کا بیّن ثبوت ہے۔ جنگ میں عام اشیاء کی عموماً اور کاغذ و طباعت کی گرانی کا خصوصاً کوئی حساب ہی نہیں رہا۔ پھر طباعت و اشاعت کے کاموں میں متعدد قسم کی سرکاری اور غیر سرکاری رکاوٹیں اس پر مستزاد تھیں۔ لیکن ان سب مشکلات کے باوجود ندوۃ المصنفین نے اپنے کاموں کو برابر جاری رکھا۔ اور اپنی وضع کو نباہنے کی کوشش میں وہ زمانہ کا سرد و گرم خاموشی اور وقار کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ یہ جو کچھ ہم سے ہو سکا ہے۔ محض اللہ رب العزت کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے ہو سکا ہے اور آئندہ بھی جو کچھ ہو گا اسی کی تائید و توفیق سے ہو گا۔

وھو المستعان وعلیہ التکلان

۴۴ء میں جو کتابیں شائع ہونی چاہئے تھیں۔ طباعت کی ناقابلِ عبور مشکلات کی وجہ سے ان میں سے دو کتابیں لغات القرآن جلد دوم۔ اور مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد دوم چھپ کر

تیار نہ ہو سکی تھیں۔ لیکن ہم نے اس ناگزیر کوتاہی کی تلافی اس طرح کردی ہے کہ ان دونوں کتابوں کے ساتھ ساتھ سالِ رواں یعنی ۴۵ء کی کتابوں کا سٹ بھی شائع کردیا ہے۔ اس اعتبار سے اس ایک سال میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے جو کتابیں چھپ چھپا کے اب تک تیار ہو چکی ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قرآن اور تصوف۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین بڑی تقطیع ضخامت ۱۷۵ صفحات
قیمت عہ مجلد ے

(۲) قصص القرآن حصہ چہارم۔ از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بڑی تقطیع صفحات ۵۰۰
قیمت پانچ روپے مجلد چھ روپے

(۳) انقلاب روس۔ صفحات ۳۱۶۔ قیمت مجلد تین روپیہ

(۴) مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت حصہ دوم از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہم

(۵) لغات القرآن ج ۲۔ از مولانا عبدالرشید نعمانی۔

شروع کی تین کتابیں ۴۵ء کے سٹ سے تعلق رکھتی ہیں اور آخر کی دو کتابیں ۴۴ء سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس سال کے ممبروں کی خدمت میں مزید معاوضہ کے بغیر ۴۴ء کی ممبری کی فیس کے سلسلہ میں پیش کی جائیں گی۔

ان نئی کتابوں کے علاوہ پرانی کتابوں میں سے "اسلام کا اقتصادی نظام" کا تیسرا اڈیشن، اور "مسلمانوں کا عروج وزوال" کا دوسرا اڈیشن بھی شائع ہو رہا ہے۔ یہ دونوں اڈیشن سابقہ اڈیشنوں کے مقابلہ میں ضخامت اور مباحث کے اعتبار سے کہیں زائد ہوں گے ۴۵ء کے ممبر حضرات سابق الذکر تین نئی کتابوں کے ساتھ چوتھی کتاب کی حیثیت سے ان دونوں نئے اڈیشنوں میں سے جس کتاب کو طلب فرمائیں گے وہ ان کی خدمت میں ارسال کردی جائیگی۔

اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور پیپر کنٹرول کی بہت سی دفعات میں مناسب ترمیم وتنسیخ بھی ہو چکی ہے۔ برہان کا سفید چکنے کاغذ پر شائع نہ ہو سکنا ہمارے لئے بڑی اذیت اور کوفت کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیکن قارئینِ کرام کو باور کرنا چاہیئے کہ سفید چکنے کاغذ کی اجازت حاصل کرنے کے لئے ہم ہر ممکن اور مناسب کوشش کر رہے ہیں۔ اس راہ میں ایک قانونی پیچیدگی حائل ہے۔ اس لئے اب تک اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ تاہم سعی برابر جاری ہے اور امید ہے کہ برہان جلد ہی اپنے پرانے رنگ روپ میں قارئین کی خدمت میں حاضر ہونے کے قابل ہو سکے گا۔

پچھلے دنوں برہان میں "مولانا عبید اللہ سندھی" پر جو مقالہ کئی ماہ تک مسلسل نکلتا رہا تھا اب وہ بجنسہٖ کتابی شکل میں سندھ ساگر اکیڈمی ٹمپل روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ اس ماہ کے اختتام تک پریس سے آجائے گا۔ جو صاحب ان مقالات کو یکجائی طور پر پڑھنے کے خواہشمند ہوں وہ لاہور سے طلب کر سکتے ہیں۔

مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی سابق استاذ حدیث جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل جو فیض الباری ایسی اہم کتاب کے مرتب کی حیثیت سے ہندوستان کی اسلامی علمی دنیا میں کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ندوۃ المصنفین کے باضابطہ رفیق کی حیثیت سے بہت دنوں سے کام کر رہے تھے لیکن اب جنابِ موصوف مستقلاً ندوۃ المصنفین میں ہی تشریف لے آئے ہیں اور احادیثِ صحیحہ پر ایک نہایت ضخیم، ٹھوس اور عظیم الشان کتاب مرتب کر رہے ہیں جو اردو میں اپنی نوعیت کی ایک عجیب چیز ہوگی اور مسلمانوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ اس کتاب کی جلد اول ۱۹۴۶ء کے سلسلہ میں شائع ہو رہی ہے

حضرت ابراہیمؑ اور ایک بادشاہ کا مکالمہ

از مولانا سید ابو النظر رضوی امروہوی

مولوی عبدالحق صاحب سکندر آبادی نے تعلیم یافتہ حضرات کے لئے عقلی بنیادوں پر تفسیر مرتب کرتے ہوئے کچھ شبہات الہلال ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۷ء میں "حضرت ابراہیم اور ایک بادشاہ کا مکالمہ" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ تاکہ مولانا اپنی خداداد قابلیت سے قرآن مجید کے مطالبِ حکیمانہ ایک ایسے نئے اسلوب سے بیان کرسکیں کہ آج کل کی مذہب برگشتہ طبیعتیں ان سے تشفی حاصل کرسکیں۔

مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہ نے الہلال کی مسلسل چار اقساط میں اس کا جواب دیا تھا اور اپنے مخصوص ادبی انداز میں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ادبی معجزہ سے مولوی عبدالحق صاحب کی کہاں تک تشفی ہوسکی تھی لیکن میری تشفی نہ ہوسکی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میری دماغی کمزوری، مطالعہ کی کمی اور حقائق سے ناآشنا ہونے کا نتیجہ ہو۔ لیکن جو کچھ میرے دل و دماغ نے اندازہ کیا وہ اپنی جگہ کھڑے رہ جانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وجہ سے خود مجھے اپنے طور پر حل تلاش کرنے کی فکر پیدا ہوگئی۔ اور اس فکر و احساس نے شاید باطنی شخصیت اور لاشعوری قوتوں کے سہارے ایک ایسی تعبیر، تاویل اور تفسیر تک پہنچا دیا جس سے میرا دل و دماغ طمانیت محسوس کرنے لگا۔ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرے لوگ کہاں تک مطمئن ہوسکیں گے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حل تلاش کرنے کا راستہ ضرور دریافت ہوگیا خواہ ہموار کرنے کی زحمت ہنوز باقی ہو۔

۲۷ء میں اس حل کا ایک خاکہ الہلال کو بھیجا گیا تھا مگر فوراً ہی وہ بند ہوگیا۔ اور اتفاق سے میرا مضمون بھی ایسا گم ہوا کہ مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوسکی

لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ اس ذہنی تصویر کا ہر آب ورنگ اور خال وخط پوری روشنی میں لے آیا جائے تاکہ آپ ان علمی مغالطات کی بنیادوں کو سمجھ سکیں۔ جنھوں نے آج تک اس گتھی کو نہ سلجھنے دیا

وما توفیقی الا باللہ۔

مولوی عبدالحق صاحب کو جو شبہات پیدا ہوئے تھے وہ ان کے ہی الفاظ میں حسب ذیل ہیں

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود دلیل کیوں دی، نمرود سے پروردگاری کا ثبوت کیوں طلب نہیں کیا؟

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہنا چاہیے تھا کہ موت وحیات بخشنے سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ اَن دیکھی ذات تمام جانداروں کو نیستی سے ہستی بخشتی ہے اور پھر ایک خاص وقت پر فنا کر دیتی ہے اس طرح تو بھی ایک چھوٹے سے چھوٹا کیڑا بنا دیکھ۔ لیکن آپ یہ نہیں کہتے۔

(۳) پہلی دلیل اگر کمزور نہ تھی تو دوسری دلیل کیوں دی گئی۔

(۴) دوسری دلیل پر بھی شبہات وارد ہوتے ہیں۔ جس شخص کی شوخ چشمی کا یہ حال تھا کہ موت وحیات کے وصفِ الٰہی تک کا بیان اسے چپ نہ کرا سکا۔ وہ اس دوسری دلیل سے کس طرح لاجواب ہوگیا۔ اگر وہ سورج کو پورب سے نکال دینے پر قادر نہ تھا تو موت وحیات بخشنے پر بھی قادر نہ تھا۔ اگر اس کا غلط مطلب نکال سکتا تھا تو اس کا بھی غلط مطلب لیکر کہہ سکتا تھا کہ میں بھی نکال سکتا ہوں

(۵) سورج پورب سے نکالنے کا مطالبہ حضرت ابراہیمؑ سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

(۶) دوسری دلیل پہلی دلیل سے وزنی اور ناقابلِ انکار نہیں۔

(۷) امام رازیؒ نے دونوں جوابات کو دو مختلف دلائل تسلیم نہیں کیا بلکہ مزید وضاحت، جدید تمثیل اور نیا پہلو قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن نے وسائط کے ذریعہ موت وحیات کا وجود ہی کہاں ثابت کیا افلاک کا ہماری شخصی زندگی سے کیا تعلق؟

(۸) علامہ عبدہ مصری کی تفسیر، تفسیر نیشاپوری، تفسیر ابنِ کثیر، تفسیر علامہ ابنِ مسعود، تفسیر روح المعانی۔ شیخ آلوسی وغیرہ میں بھی یا تو امام رازیؒ والا طرزِ استدلال ہی ہے یا پھر سرے

کسی طرح کی کاوش ہی نہیں کی گئی۔

مولانا ابوالکلام نے ان شبہات کا جو کچھ جواب دیا اسے بھی سن لیجئے۔ مولانائے محترم نے سب سے پہلے تو مختلف علمی گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے جن کی ستائش نہ کرنا گناہ ہوگا۔ متکلمین مفسرین اور علماء پر ضرورت سے زیادہ سخت تنقید فرمائی ہے مثلاً

(۱) مفسرین نے غیر قرآنی طریقہ اختیار کیا اور اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق تفسیر کی۔

(۲) قرآن کے الفاظ و مطالب کو لغوی معانی تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ قرآنی لغات کو فلسفی، اور منطقی تعریفات و حدود کی نوعیت سپرد کردی گئی ہے۔

(۳) قرآن کے فطری اور وجدانی اسلوبِ بیان کی جگہ یونانی فلسفہ کے اشتغال نے منطقی استدلال کا ذوق پیدا کردیا۔

(۴) مفسرین نے غلط سمجھا۔ نمرود کا دعویٰ صانع کائنات ہونے کا نہ تھا بلکہ شہنشاہیت کی بنیاد پر الوہیت کا۔ اس تنقید و نکتہ چینی کے بعد مولانا نے کچھ علمی پہلو، مقدمات کی حیثیت سے پیش کئے ہیں حالانکہ وہ مقدمات قائم کرنے کو خود غیر قرآنی طریقہ بتا چکے تھے۔ مثلاً

(۱) انبیاء کرام کی تعلیم کا مقصد بحث و نظر نہیں ہوتا۔ ایمان و یقین ہوتا ہے اس لئے وہ انسان کے وجدان سے خطاب کرتے ہیں نہ کہ مجرد ذہن و ادراک سے۔ دوسرے بحث کے مقدمات طے کرنے کا طریقہ بھی وہ پسند نہیں کرتے بلکہ براہِ راست تلقین کرتے ہیں۔

(۲) انبیاء کا طریقِ دعوت تو یہ ہے کہ اگر نوسو ننانوے باتیں کہہ کر چھوڑ دینی پڑیں اور ہزارویں بات سے مخاطب کے اندر فہم و بصیرت پیدا ہوسکے تو انھیں ایسا کرنے میں کبھی تامل نہیں ہوتا۔

(۳) داعی کی حیثیت طبیب کی سی ہے جو یکے بعد دیگرے غذائیں تجویز کرتا رہتا ہے۔ جب تک غذا ہضم نہ ہونے لگے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ ایک ہی غذا تجویز کرکے اس پر اَڑ جائے اور خواہ بدبخت مریض ہضم کرسکے یا نہ کرسکے یہ وہی لقمے اس کے حلق میں ٹھونستا رہے۔ اگر ایسا کریگا تو یقیناً وہ طبیب نہ ہوگا۔ نوعِ انسانی کا سب سے زیادہ جاہل فرد اور سب سے بڑا قاتل ہوگا۔

(۴) انبیاء کرام علم و یقین کی بہتر سے بہتر دانائی رکھتے ہیں۔ لیکن کسی شخص میں دماغ و فکر پیدا نہیں کر سکتے۔

ان مقدمات پر سیر حاصل بحث کرنے، دلائل کا تعدد تسلیم کرنے اور زبان و ادب کی بہترین قوتوں کو استعمال کرنے کے بعد مولانائے موصوف نے مجادلۂ ابراہیمی کو حسبِ ذیل ادبی، تجرباتی، نفسیاتی اور فکری انداز سے سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے جو اصل مبحث تھا۔

(۱) کئی ہزار سال گذرے اس بیمارستانِ ہستی میں ایک طبیب حق، ابراہیم خلیل بھی تھے۔ ان کا سابقہ بابل کے ایک مریض سے پڑا یہ بادشاہی کے گھمنڈ کا روگی اور جہل و طغیان کی بیماریوں سے بدحال تھا۔ انھوں نے اس کے سامنے علم و بصیرت کی ایک غذا رکھی "ربی الذی یحیی و یمیت" میرا تو اس پروردگار پر ایمان ہے جس کے قبضہ و تصرف میں ہماری موت و حیات ہے۔ یہ بہتر سے بہتر غذا تھی جو شک و انکار کے کسی مریض کے لئے ہو سکتی ہے لیکن اپنے معدہ کی صلاحیت بالکل کھو چکا تھا۔ وہ اتنی ہلکی اور سادہ غذا بھی ہضم نہ کر سکا۔ جہل و طغیان کے ہیجان میں بول اٹھا "انا احی و امیت" اگر تمہارے پروردگار کی یہی صفت ہے تو یہ بات تو مجھے بھی حاصل ہے۔ لاکھوں انسانوں کی جان میرے قبضہ و اختیار میں ہے۔ جسے چاہوں ہلاک کر ڈالوں۔ . . . . جسے چاہوں زندگی بخش دوں۔

یہ جواب سن کر حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہو گیا کہ غذا گو بہتر تھی لیکن مریض کے معدہ میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ اسے ہضم کر سکے۔ انھوں نے فوراً پہلی قاب ہٹالی اور ایک دوسری غذا پیش کر دی "فان اللہ یأتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب" اچھا اگر ایسا ہی ہے تو دیکھو یہ سورج جو ہمارے سروں پر چمک رہا ہے یہ ہر روز پورب سے نکلتا ہے اور پچھم کی طرف ڈوب جاتا ہے۔ تم اسے ایک مرتبہ پچھم سے نکال دکھاؤ۔ یہ غذا ٹھیک اس کے معدہ کی استعداد کے مطابق تھی۔ حلق سے اتری اور ہضم ہو گئی "فبھت الذی کفر" اب اس میں کج بحثی کا دم خم نہ رہا۔ دم بخود ہو کر رہ گیا۔

خدارا غور کیجئے بات کتنی صاف اور دلآویز تھی اور مفسرین نے اسے کس طرح مشکل اور

پیچیدگیوں کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کا طریقِ بیان مجادلانہ ہوتا اور ہدایت کا نہ ہوتا تو وہ اپنی پہلی بات پر ہی مخاصم سے الجھ پڑتے۔

(۲) باقی رہا یہ شبہ کہ جب مخاصم نے پہلی بات کے جواب میں ایک جاہلانہ دعوے کر دیا تھا تو دوسری بات کے جواب میں کوئی نہ کوئی بات کہدے سکتا تھا تو اس شبہ کی بھی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ یہ شبہ اس لئے پیدا ہوا تھا کہ "فبھت الذی کفر" کے معنی مناظرہ میں لاجواب ہو جانے کے سمجھے گئے تھے۔ لیکن جب واضح ہو گیا کہ "بھت" سے یہاں مقصود بات بنانے میں لاجواب ہو جانا نہیں ہے بلکہ ایک سچی بات سے متاثر ہو کر ہکا بکا رہ جانا ہے تو ظاہر ہے یہ شبہ کیوں وارد ہو۔ جب ایک حقیقت جس کے جھٹلانے اور نہ دیکھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا اس کے سامنے بے نقاب ہو گئی تو اس میں کج بحثی کا دم خم باقی نہ رہا۔

(۳) چونکہ یہ مناظرہ مصطلحانہ تھا اس لئے یہ سوالات و شبہات کہ حضرت خلیلؑ نے رجوع کیوں کیا، غیر متعلق ہیں۔

یہ تھا وہ جواب جو مولانا ابوالکلام ظلہ نے تمام مفسرین کو غلط فہم اور غلط کار ٹھیراتے ہوئے الہلال کے علمی اور ادبی صفحات پر دیا۔ قبل اس کے کہ میں اپنی "افتادِ طبع" کے مطابق کوئی طرزِ استدلال پیش کرنے کی جرأت کروں۔ یہ مناسب ہوگا کہ مولانائے محترم کے استدلال کی بعض کمزوریاں واضح کر دی جائیں تاکہ میرے استدلال کا وزن، اس کی قیمت اور پایۂ علمی کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) انبیاء کرام ایمان و یقین پیدا کرنے کے لئے نہ مجرد وجدان سے خطاب کرتے ہیں نہ مجرد ذہن و ادراک سے بلکہ طرزِ خطاب، وجدان و شعور دونوں کو آغوش میں لئے ہوئے ہوتا ہے خواہ اولیت کا شرف وجدان ہی کو کیوں حاصل ہو۔ کیونکہ قرآن اور جدید ترین علمی تحقیقات دونوں کے نزدیک انسانی کردار و عمل کا تمام تر تعلق پہلے وجدان سے ہے پھر ادراک و شعور سے۔ جذباتی لائن پر ہی دماغی لائن تیار ہوتی ہے اور نفسیاتی رجحانات کی تائید میں دلائل و تجرباتِ کا انبار لگا دیتی ہے۔ بہت کم ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ پہلے ایک فلسفی کی حیثیت میں غور کر لیا جائے اور پھر احساسات بیدار ہوں

احساس ہی فکر پیدا کرتا ہے اور فکر بھی احساس ہی کو ابھارتی اور اس سے کام لیتی ہے، مذہبی گروہ بندیوں
سیاسی پارٹیوں اور وطنی تحریکات میں آپ ہر ملک و قوم کو جذبات کی زنجیروں میں ہی جکڑا ہوا پائیں گے
بعض دلائل پر وجدانی تقاضہ کے مطابق ایک پارٹی زور دیتی ہے اور بعض دلائل پر دوسری پارٹی
ورنہ اگر دلائل کی سچائی ہی بنیادی چیز بنائی گئی ہوتی تو اسے ہر ذہن پر یکساں اثر ڈالنا چاہیے تھا۔
"ام علی قلوب اقفالھا" یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں، جیسی آیات سے قرآن بھی اس ہی
پہلو کی طرف اشارہ کرتا رہا ہے۔ جب دل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو ادراک و شعور کے نمایاں ہو سکنے
کے لئے کوئی راستہ نہیں رہتا۔ جب تک دل کی کوئی چیز جنبش نہ دے دماغ میں زلزلہ پیدا نہیں کر سکتی
لیکن شعوری ارتقاء اتنا کم مایہ بھی نہیں کہ انبیاءِ کرام اس کا احترام کرنے سے انکار کر دیں۔ وجدان ہی
کو سب کچھ یقین کر لینا انسانی فطرت سے ناآشنائی کا ثبوت ہوگا۔ انسان وجدان و شعور سے ترکیب یافتہ
فطرت رکھتا ہے اس کی پیاس ایک ہی ساغر سے نہیں بجھ سکتی، اس کے دونوں ہاتھوں میں جام ہونا چاہئیں
آج تک زندگی کے وہی قوانین اور نظامہائے کارکردگی کامیاب ہوتے رہے ہیں جن میں وجدان و شعور
دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ انبیاء کے طرزِ تخاطب کو بڑی حد تک وجدانی ہی قرار دینا اس غلط فہمی میں
مبتلا کر سکتا ہے کہ انسان کے شعوری ارتقاء کے لئے اس کے پاس کوئی خاص سبق نہیں۔

پلاؤ اور زردہ کی قاب کا انتخاب سراسر ایک ذوقی چیز ہے۔ یقیناً پلاؤ کی حیثیت کم نہیں
ہوگی۔ اگر کوئی شخص اُسے پسند نہ کرے لیکن اگر وہ زردہ پلاؤ، کیا آپ کے ذوق کا ہر کھانا کھانے سے
انکار کر دے تو بھی اس سے شکایت نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ قانونِ الٰہی نے انسان کے ذوقِ
روحانی کو اتنا آزاد نہیں تسلیم کیا۔ اگر ایمان و کفر اختلافِ ذوق سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو،
تب تو یہ مثال چسپاں ہو سکتی ہے ورنہ انسانی فطرت کو عدمِ احساس کا مجرم ٹھہراتے ہوئے،
"ذوقِ طبع" کے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ دراصل مفسرین نے جو
راستہ اختیار کیا وہ بھی درست تھا اور مولانا، جو راستہ اختیار کر رہے ہیں وہ بھی غلط نہیں۔ لیکن
کسی ایک ہی پہلو پر زیادہ زور دینا نہ ان کے لئے مناسب تھا نہ آج کسی کو اجازت دی جا سکتی ہے

وہ بھی ایک کمزوری تھی اور یہ بھی ایک کمزوری کے سوا کچھ نہیں۔ استدلال کا پہلا اثر قلب پر محسوس ہونا چاہئے۔ مگر اس کا فعلِ ثانوی ادراک و شعور کی تسکین ہی ہوگا۔ مولانا اپنے استدلال کی وجدانی لذت میں یہ بھول گئے کہ شعوری اضمحلال کا داغ اس کی پیشانی پر چمک رہا ہے۔

(۲) جہاں تک مخاطب کے دل میں ایمان و یقین پیدا کرنے کے جذبہ کا تعلق ہے۔ کوئی شخص مولانائے محترم کے اس تصور سے انکار نہیں کر سکتا کہ انبیار بار بار اور طرح طرح سے فطری احساسات کو ابھارنے کی جد و جہد کرتے رہنا چاہتے ہیں اور اس فرض کی ادائگی سے کبھی نہیں تھک سکتے۔ مگر جہاںتک انبیار کے کردار و عمل کا تعلق ہے اس چیز کی کوئی شہادت تاریخ نبوت میں نہیں ملتی کہ ذوقِ طبع کا غلط اندازہ کرنے کی وجہ سے انھیں قاب پر قاب بدلنا پڑی ہو، انبیار کفار، مشرکین منافقین اور گنہگاروں سے جو گفتگو بھی کرتے ہیں وہ ان کے ماحول، ذہنی سانچہ نفسیاتی ساخت اور قومی عصبیت تک کا لحاظ کرتے ہوئے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی گفتگو نہ مل سکے گی جو عربی ذہنیت، ان کے معاشی ماحول اور اجتماعی نظام سے نسبت نہ رکھتی ہو اگر کسی میں استعداد نہ تھی یا دیر سے احساسات بیدار ہو سکے تو اس نے سچائی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جس کے دماغ میں جذب و قبول کی صلاحیت تھی۔ اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دلائل کی سمت بدلتی رہی ہو۔

تھرمامیٹر کا پارہ ہر مریض کے درجۂ حرارت کے مطابق یقیناً چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ مگر وہ مریض کی کیفیات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کرتا۔ انبیار بھی ہر فکر و وجدان کی طبعی اور ماحولی استعداد کا لحاظ رکھ کر گفتگو کا ایک خاص پہلو متعین کر لیتے ہیں مگر اس اندازۂ ذہنی میں علی العموم ٹھوکر نہیں کھاتے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بدوی سے فلسفیانہ گفتگو شروع کر دی جائے اور ایک متمدن انسان سے غیر علمی گفتگو، ایک بت پرست کو زراعتی نظام کے محاسن بتلانے لگیں اور ایک کاشتکار سے صنعتی ترقیات کی بات چیت ہو۔ گفتگو سے پہلے ذوقِ طبع کا اندازہ نہ کر سکنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

پھر یہ بھی تو بتانا چاہئے تھا کہ قانونِ مرگ و حیات اور طلوع و غروب کے نظام میں وہ

کون سے ذوقی امتیازات تھے جن میں سے ایک کو ٹھکرا دینا ممکن تھا اور دوسرے کو فراموش کر دی
محال، یا انسانی ذوق کو اندھا فرض کرنا پڑے گا۔ جس کا اندازہ کسی کو کبھی نہ ہوسکتا ہو۔ اگر ایسا ہ
تو دلیل کی ہر عظمت اور اثر انگیزی سے انکار کر دینا چاہیے۔ اور یہ چیز جہاں تک عملی دنیا میں و
ہوسکتی ہے اس سے کون ناآشنا ہوگا۔ دراصل دلائل کی گوناگونی کا فلسفہ، اختلافِ طبائع کا ا
رہینِ منت نہیں جتنا کہ خود مستدل کے دائرۂ شعور کی تنگ نائیوں کا۔ جب تک دلائل اپنے دائر
تخیل ہی میں گردش کرتے ہوئے دیئے جاتے رہیں گے نہ مخاطب مطمئن ہوسکتا ہے نہ ایک دلیل کا
ہوسکتی ہے۔ لیکن جس لمحہ میں بھی دلیل کو مخاطب کے ماحولی تقاضوں اور تمدنی علوم کا آئینہ دار بنا دیا
جائے گا دوسرے دلائل کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔

انبیاء چونکہ " ماینطق عن الھوٰی ان ھوا لا وحیٌ یوحیٰ " کی بولتی ہوئی تصویر ہوتے ہیں
اس لئے ان کا شخصی دائرہ تخیل تبلیغی جدوجہد میں کام نہیں کرتا نہ کوئی مادی ماحول انھیں اپنی گرفت
میں لے سکتا ہے نہ طبعی موثرات، نہ ذہن و فراست کا اضمحلال، نہ انھیں تجربات کی ضرورت ہوتی ہے
نہ قیاسات کی۔ ان کے دلائل غیر اختیاری طور پر مناسب حال ہی ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا اندازہ کر سکنے
کا ان میں ایک ایسا طبعی ملکہ ہوتا ہے کہ ہم اس ملکہ کے رسوخ کا بہ مشکل ہی اندازہ کر سکیں گے۔ اگر
یہ خوبی ان میں نہ ہوتی تو ایک ملک یا قوم کو درست کر سکنے۔ اور ایک ایک شخص کے انفرادی ذوقِ
طبع کا اندازہ کرنے کے لئے صدہا سالہ عمر بھی کافی نہ ہوسکتی۔ دوسرے اگر ہر شخص کو نوسو ننانوے دلائل
سے مطمئن کرنے ہی کا پروگرام بنالیا جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسی پیغمبری کہاں تک
کامیاب ہوسکتی ہے۔

تعجب ہے کہ اتنی سادہ اور صاف بات تک مولانا کی نظر کیوں نہ پہنچ سکی خصوصاً جبکہ
مولانائے محترم کا دل و دماغ منطق و فلسفہ کی الجھنوں سے بالکل آزاد تھا۔ کیا یہ چیز سوچنے، سمجھنے کی
محتاج تھی کہ انبیاءِ کرام کی پہلی دلیل، پہلی صحبت اور پہلی نگاہ ہی دل میں نشتر لگانے والی ہونی چاہئے
بہ صورتِ دیگر ایک عام آدمی اور پیغمبر کی دعوت اصلاح میں کیا تفاوت رہیگا۔ اگر کوئی تفاوت

نہیں تو نتائج کا اختلاف کیوں ہوتا ہے۔ عرب میں جو انقلاب ہوا، کیا ہندوستان میں کوئی عالم اور لیڈر کر سکتا ہے؟ سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے انقلاب لانا مشکل نہیں جیسا کہ لینن اور اسٹالن کر سکے لیکن محض تبلیغ اور دعوتِ اصلاح سے ہر گونہ انقلاب برپا کر دینا آج بھی ممکن نظر نہیں آتا۔

(۳) یقیناً اخلاقی امراض کے سلسلہ میں ایک پیغمبر کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو خلطی امراض میں ایک طبیب کی ہو سکتی تھی لیکن مولانائے محترم نے یہ نہیں غور فرمایا اور شاید طبیب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ذہنی اور عملی کمزوریوں تک بآسانی پہنچ بھی نہ سکتے تھے کہ کسی طبیب کا ایسی غذا اور اتنی مقدار میں تجویز کرنا جو مریض کو ہضم نہ ہو سکے، عدم حذاقت، ناتجربہ کاری اور فنی استعداد کے گم ہونے کی دلیل ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں تو ایسی تجویز کو ناقابلیت کی کھلی ہوئی دلیل ہی تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ خود طبیب بھی اس مرض کی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو چکا اور ہر نشیب و فراز کا اندازہ کر چکا ہو۔ کیا ہر پیچیدگی سے خود گذرنے پر بھی اگر کوئی طبیب صحیح اندازہ نہ کر سکتا ہو تو اسے ایک قابل طبیب کہا جا سکتا ہے۔

مختلف امراض میں ہضم معدی کی جو ڈگریاں قانونِ فطرت کے تحت مقرر ہیں ایک طبیب کا فرض ہے کہ ان سے واقفیت حاصل کرے۔ ورنہ وہ مریض کو اسہال کی شکایت میں مبتلا کرنے کا مجرم ٹھیرایا جائے گا۔ اور اگر نو سو ننانوے مرتبہ ایسی ہی غلطی کو دہرایا گیا تو جنابِ طبیب کا جیل خانہ سے باہر رہنا مشکل ہے۔ طبیب صرف اس ہی وقت مجوزہ غذا کو تبدیل کرے گا۔ جب وہ اپنی پہلی مجوزہ غذا کو بے محل یقین کر لے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبر کو ہم ایک ناتجربہ کار، ایک بے پرواہ طبیب کی جگہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ حاذق سے حاذق طبیب کی بھی ایسی تجویز اس کی تجرباتی کمزوری ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ حضرت ابراہیم نہ صرف یہ کہ "کیف تحیی الموتی" سے طمانیتِ قلب اور حیات و مرگ کے نازک پہلوؤں کا تجربہ حاصل کر چکے تھے بلکہ وہ رہنمائی کے لیے انسان کے شعوری ارتقاء کے مراحل طے کرنے پر بھی بڑی حد تک مجبور نہ تھے۔ ان کی استعداد قدرتی استعداد تھی۔ تجرباتی استعداد نہیں۔ پھر ان سے ایسی ذوق ناشناسی کا ارتکاب کیسے ہوا اور خدا نے ان کی کمزوری کا اعلان

کیوں پسند کیا؟ کیا انبیاء کی تبلیغ و ہدایت تک میں انسانی کمزوریاں ثابت کرنا مقصود تھا یا بادشاہ کی نافہمی کا۔ اگر اس نے پہلی دلیل پر جرح کی اور دوسری پر خاموش ہو گیا تو یہ حضرت ابراہیم ؑ کی ذوق شناسی اور نمرود کی سنجیدگی اور شعوری ارتقاء کا ثبوت ہوگا۔ انسان ماحولی ذوق سے نہیں نکل سکتا اس لئے نمرود کا پہلا اختلاف کج بحثی یا غلط تاویل نہیں کہلائے گی۔ بلکہ اسے نفسیاتی رجحانات کا تقاضہ کہنا چاہیے۔ تبلیغ اس ہی پہلو کا صحیح اندازہ کر سکنے پر کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس میں نمرود کا نہیں حضرت ابراہیمؑ کا قصور تسلیم کرنا ہوگا حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

(۴) پیغمبر یا طبیب فکر و ہضم کی استعداد تو یقیناً کسی مریض میں پیدا نہیں کر سکتا مگر فکر و ہضم کی استعداد کا اندازہ کر لینا یقیناً اس کا ناقابل فراموش فرض رہے گا۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا تو اس کے وجود سے کیا فائدہ؟ قرآن مجید نے یہ ضرور بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جسے چاہیں ہدایت پذیرفتہ نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ فکری استعداد کی تخلیق ان کی گرفت و اختیار سے باہر ہے لیکن ان ہی کو "جادلھم بالتی ھی احسن" کا حکم دیا گیا۔ جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ مجادلۂ حسنہ کی استعداد ان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی تھی اور یہ استعداد اس وقت تک نامکمل ہی رہیگی جب تک کہ وہ فکری استعدادات اور نفسیاتی رجحانات کی گوناگونیوں کا اندازہ نہ کر سکیں۔ جس شخص کی پہلی بات دل پر اثر نہ کرے اس کی دوسری باتوں کا دل کی گہرائیوں میں جگہ حاصل کر لینا مشکل ہوگا۔ مخاطب کا ذہن اگر پہلے دفعہ ہی میں غیر مطمئن ہو جائے تو طمانیت کی طرف آتے آتے دیر لگتی ہے۔ کسی مقرر کی اگر پہلی تقریر اچھی ہو گئی ہو تو دوسری تقریر کے اعلان پر عوام کھنچے چلے آتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ پہلی ملاقات اگر دل پر نقش قائم کر سکے تو ساری عمر اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ ہزار بدگمانیاں بھی پہلی ملاقات سے کشمکش میں پڑ جاتی ہیں۔ یہ زندگی کے تجربات ہیں جنہیں ٹھکرایا نہیں جا سکتا مگر افسوس ہے کہ مولانائے محترم نے ادبی سیلاب میں بہتے ہوئے ان پہلوؤں پر غور نہیں فرمایا۔

یہاں تک تو مجھے مولانائے محترم کے مقدمات سے جو جزئی اختلاف تھا اس پر روشنی ڈالی گئی۔ اب میں اصل بحث کے سلسلہ میں دو ایک چیزوں پر کچھ اور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

بہت غور کرنے کے باوجود ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ نمرود سے لیکر مولوی عبدالحق صاحب بلکہ مولانا ابوالکلام صاحب تک ہر ایک کو "ربی الذی یحیی ویمیت" سے یہ غلط فہمی کیوں ہوئی کہ حضرت ابراہیمؑ کا منشار انفرادی حیات و مرگ تھی۔ مولانا عبدالحق بھی دریافت کر چکے ہیں کہ "افلاک کو ہماری شخصی زندگیوں سے کیا تعلق" اور مولانائے محترم نے بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ "میرا تو اس پروردگار پر ایمان ہے جس کے قبضہ و تصرف میں ہماری موت و حیات ہے" حالانکہ آیت کے اس ٹکڑے میں "ہماری" اور "تمہاری" موت وحیات کے تعین کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ یہ تو دماغ کی کارگری ہے کہ اس نے الجھنے کے لئے ایک پیچیدگی کا اضافہ کر لیا۔ "یحیی ویمیت" ایک عمومی تخیل ہے اور ساری کائنات[1] سے وابستہ، صرف انسانی زندگی سے اس کو وابستہ کر دینے کا کیا حق ہے؟ اور وہ بھی انسانی اجتماعیت کے جزئی تصور تک کو ٹھکراتے ہوئے انفرادی حیات و مرگ پر جب کبھی گفتگو کی جائے گی۔ بہت کم انسانی معدے اس غذا کو ہضم کر سکیں گے حیات و مرگ کا قانون۔ قانونِ تخلیق و ابداع کی طرح اقتدارِ اعلیٰ کی طرف رہنمائی بہ مشکل ہی کر سکتا ہے اگر انفرادیت سے اس کو متعلق کر دیا جائے۔ انفرادی زندگی گوناگوں جزئی قوانین میں پردہ بہ پردہ نہاں ہے۔

ہر بادشاہ، ہر ڈاکٹر، ہر ڈاکو، ہر تھانیدار، ہر جوگی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق مجھ سے ہے اگر حضرت ابراہیمؑ کا یہی منشار تھا تو پھر معدہ نہیں ثقیل غذا کی خرابی تھی، ہر ایک میں کچھ نہ کچھ طاقت ہے جس کی معجز نمائیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نمرود اگر حجتِ ابراہیمی کے اس پیچیدہ تصور کو نہ سمجھ سکا تو اسے قصوروار نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اگر ایسا نہ تھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے وہی غلط فہمی ہوئی جو مولانا ابوالکلام صاحب تک کو ہو سکتی تھی اور ہوئی۔

---

[1] "ملکوت السموٰت والارض" کا مطالعہ کرنے والا اس کائناتی ارتباط سے بے خبر نہیں ہو سکتا جو ایک روح کی تخلیق کیلئے نقطۂ آغاز کا کام دیتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب جس نظریہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں، کیا حضرت ابراہیمؑ اس سے آشنا نہ ہوں گے یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ روحانیت اور فلکیات کے مادی زندگی پر زبردست اثر ڈال سکنے کی تحقیق نمرود کے زمانہ میں ہو چکی تھی! ابوالنظر رضوی۔

بڑی حد تک مولانا ابوالکلام صاحب مولوی عبدالحق صاحب کے اس اعتراض کو بھی نظر انداز کر گئے ہیں جس کے ذریعہ انھوں نے سوال کیا تھا کہ ایک مچھر یا مکھی بنانے کا مطالبہ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود سے کیوں نہ کیا۔ اگرچہ اشارہ ضرور کیا تھا۔ مولوی صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ شخصی حیات و مرگ کی الجھن پیدا کرنے سے تخلیق و ابداع کا مطالبہ زیادہ مبہوت کن ہوتا۔ قرآن نے کئی جگہ صنم پرستوں سے یہ مطالبہ کیا بھی ہے مگر یہاں دراصل اس کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا۔ نمرود خالقِ کائنات ہونے کا دعوےٰ نہیں کر رہا تھا جو ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ انسان کو کبھی یہ مغالطہ نہیں ہوا۔ سارا فتنہ ربوبیت و پروردگاری کا ہے اور چونکہ انسانی فطرت پروردگار کی پرستش پر ہی تعمیر کی گئی تھی اس لئے ایسے مغالطات نے اسے بے راہ روی پر مجبور کر دیا۔ روزِ ازل میں بھی خدا نے انسان سے یہ اقرار نہیں کرایا کہ میں خالق ہوں یا نہیں بلکہ یہی سوال کیا گیا کہ "الستُ بربکم" کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ چونکہ یہ سوال اجتماعی زندگی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ساری زندگی سے وابستہ تھا۔ انسانی فطرت اس نکتہ کو پہچان گئی اور اس نے "بلیٰ" سے اس کا جواب دیدیا۔ مگر مادی زندگی نے پھر اسے انفرادیت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانے اور دوربینی سے کام نہ لے سکنے پر چونکہ بعض اعتبارات سے مجبور کر دیا تھا اس لئے وہ جزئی پروردگاریوں سے دھوکہ کھانے لگا۔

یہی دھوکہ تھا جسے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے ذہن سے دور کرنا چاہا۔ ایسی حالت میں خالق و صانع ہونے کی بحث کیونکر چھیڑی جاسکتی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب بنیادی تصور تک نہ پہنچ سکے ورنہ حضرت ابراہیمؑ کو "لقمہ" نہ دیتے۔ نمرود اس نکتہ کو تو سمجھتا تھا لیکن شخصی تصورات میں الجھ رہ گیا۔ اور یہی وجہ ہے حضرت ابراہیمؑ کو دوسرا فقرہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تعجب یہ ہے کہ نمرودی مغالطہ آج تک شاعرانہ توارد کی طرح اپنا کام کر رہا ہے۔ یہ دشنۂ پنہاں تا ہنوز

---

[1] یہ سوال خالقیت کے تصور سے پیدا ہوا اور خالقیت کا تصور علماء کی اس تفسیر سے پیدا ہوا کہ "ربی الذی یحیی و یمیت" سے مراد حیات و مرگ سے پروردگاری کرنے والا نہیں خالقِ حیات و موت ہے اگر خالقیت ہی زیر بحث ہوتی تو یہ سوال موزوں ہوسکتا تھا۔ (ابوالنظر رضوی)

زنگ آلود نہ ہو سکا۔

دوسری چیز مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا نے اس بارے میں قطعًا کوئی وضاحت نہیں فرمائی کہ نمرود کا مبہوت ہو کر رہ جانا ان کے نزدیک کیونکر عقلی شکست نہیں بلکہ صرف وجدانی شکست تھی۔ اس استدلال کو مکمل نہیں کہہ سکتے جو صرف دل کو شکست دے اور دماغ کے احساسِ برتری کو کم نہ کر سکے۔ غالبًا مولانا کے نزدیک حجتِ ابراہیمی کا عقلی پہلو کمزور تھا۔ حالانکہ مکالمہ کی سرگذشت کا کوئی حصہ اس کی تائید نہیں کر رہا۔ مبہوت ہونا شعوری کیفیت ہے۔ وجدان اس سے اثر پذیر ہو سکتا ہے لیکن براہِ راست اس کے تاثر کا نام مبہوت ہونا نہیں رکھا جا سکتا۔ کاش مولانا اس گوشہ کو بھی روشن کرنے کی فرصت پا سکتے۔ اس نقطہ تک پہنچ کر چاہتا ہوں کہ مجھے بھی اپنا حل پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

قرآن مجید کی جس آیت کے بارے میں بحث و گفتگو ہو رہی ہے پہلے اسے ملاحظہ فرمالیجئے تاکہ بنیادی تصور کو سامنے رکھکر معروضات پر آپ غور فرما سکیں۔

الم تر الی الذی حاجّ ابراهیم	کیا تو نے اس شخص کے حال پر نگاہ نہیں کی جس نے
فی ربه ان آتاه الله الملك	ابراہیم سے دلیل بازی[1] کی تھی کیونکہ اس کو خدا نے
اذ قال ابراهیم ربی الذی	بادشاہت دیدی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا میرا
یحیی و یمیت قال انا احی	پروردگار تو وہ ہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے
و امیت قال ابراهیم فانّ[2]	جواب دیا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں، ابراہیم
الله یأتی بالشمس من المشرق	نے کہا کہ خدا آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب
فأتِ بها من المغرب فبهت	سے نکال دے۔ اس پر وہ ہکا بکا رہ گیا جس نے

[1] میں "حاجّ" کا ترجمہ "جھگڑا نہیں کرتا۔ کج بحث سے بحث کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اگر نمرود ایک قابل آدمی تھا تو کج بحث نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ناقابل تھا تو اس کے مباحثہ کو قرآن کیوں یاد دلا رہا ہے۔ ماحولی ذوق کا اختلاف رکھنے والا کج بحث نہیں کہلا سکتا۔ [2] "فا" میرے نزدیک نمرودی دعوے سے تعلق قائم کرنے کے لئے لائی گئی تھی، جسے مولانا نے نظر انداز کر دیا۔ (ابو النظر رضوی)

الذی کفر۔ واللہ لایھدی القوم الظالمین۔ انکار کیا تھا۔ خدا اس پارٹی کو جو تجاوز عن الحدود کی بنیاد پر قائم ہو، منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

اس آیت سے چند امور صاف ہو جاتے ہیں، مجادلہ، ربوبیت و پروردگاری کے بارے میں تھا جو انسانی تاریخ کا ہمیشہ ایک جزو رہا ہے۔ پرورش کرنے اور مشکلات کے پردوں کو چاک کر کے زندگی کے منازل طے کرانے والے سے انسان فطری طور پر محبت رکھتا اور اس کی اطاعت کرتا رہا ہے۔ مظاہر ربوبیت کے وجودِ سیمیائی سے مغالطہ کھاتے رہنے کی وجہ کم نگہی، نفسیاتی تاثر کی شدت اور شعور کا تاثرات سے شکست خوردہ ہو جانا ہی کیوں نہ ہو۔ ہر ربوبیت اور مظہرِ ربوبیت کی عظمت و محبت اس کے رگ و ریشہ میں جذب ہوتی رہی۔

نمرود نے اپنی آمریتِ مطلقہ کو جب اپنے متمدن ممالک کی سیاسی، فوجی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے ہر پہلو پر غالب محسوس کیا اور دیکھا کہ سارے ملک کی زندگی میری ہی نوازشاتِ خسروانہ کی پرورش پا سکتی ہے۔ تو اس نے کواکب[۱] کی روحانی قوتوں کا اپنے آپ کو نمائندہ سمجھا، خصوصاً اس وجہ سے کہ تخیلی سائنس کی تمام ترقیات بھی اس کی گرفت میں تھیں اور عوام کے اس بنیادی تخیل سے فائدہ اٹھا سکنے کے لئے جو علم نجوم اور تخیلی سائنس میں کمال حاصل کرنے کی بنا پر ان کی زندگی کا نصب العین بن گیا تھا۔ یعنی کواکب ہی اس غیر محسوس توانائی کا سرچشمہ ہیں جو مادہ کے ارتقا کا باعث ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی پروردگاری کا دعویٰ کر دیا۔ چونکہ عوام کا بنیادی تصور ہی کمزور تھا اس لئے انھیں نمرود کو دیوتا اور ربوبیتِ کواکب کا مظہر تسلیم کرنے میں تامل نہ کرنا پڑا۔ جس طرح خدا پرست قومیں بھی انبیا اور اولیاء کو بالغیر اور بالواسطہ ہی، خدا کی تمام قوتیں سپرد کرتی رہی ہیں۔

---

[۱] آج کمیونسٹ کواکب کی جگہ ہیگل کے نظریۂ تضاد کو دے رہے ہیں اور معاشی پروردگاریوں کا مرکز اسٹالن کو بنا رہے ہیں۔ یہی رنگ نمرود کے زمانہ کا تھا۔ کل نمرود کو وہی پوزیشن حاصل تھی جو آج اسٹالن رکھتا ہے۔ آج نیچر کی غیر محسوس توانائی کے تغیرات سے پیدائش وارتقائے حیات کا مسئلہ حل کیا جاتا ہے۔ کل کواکب کی غیر محسوس طاقت کو سرچشمہ تسلیم کیا گیا تھا۔ ابو النظر رضوی۔

انھوں نے بھی کائنات کی توانائیوں اصل مرکز کواکب کو اور اس کا مظہر بادشاہ کو مانا تھا اور خدا پرستوں نے بھی جہاں تک مادی زندگی کا تعلق ہے۔ روحانیین اور بادشاہوں کو مظہرِ صفات الہٰی ظل اللہ بلکہ میم کے پردہ میں خدا قرار دینے سے تکلف نہیں کیا۔ جب غیر محسوس طاقتوں کے سایہ میں نمرود کی حکومت مستحکم ہوگئی اور استحکام نے اس کے غرور کا پارہ اور چڑھا دیا حتی کہ جب صراطِ مستقیم سے تجاوز ان حدود تک پہنچ گیا جہاں ضد کا پیدا ہو جانا قانونِ قدرت ہے اور جسے یورپ کا فلسفی ہیگل نظریہ تضاد[1] کہتا ہے تو خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیدا کیا جو اس ہی ماحول کے فرزند تھے۔ اور مرضیاتِ الٰہیہ کے علم بردار۔

عجائباتِ قدرت کا مطالعہ کرنے سے پیشتر وہ بھی اپنی سوسائٹی کے اس نظریہ سے متاثر تھے کہ کواکب کی رفتار، ان کی شعاعوں کے انحراف و استوار، شعاع کی توانائی، کواکب کی اقلیدسی اشکال وغیرہ ہی زندگی کو نشو و نما دینے، سنوارنے اور سنبھالنے کا کام کرتے ہیں۔ ماضی بھی ان کی مخصوص رفتاروں سے تیار ہوا تھا۔ حال بھی ان ہی کی نوازش و تغافل سے ترکیب پا رہا ہے اور مستقبل کے حوادث بھی اُن ہی کے فرماں پذیر ہیں۔ اگر کواکب کی پروردگاری کام نہ کر رہی ہوتی تو زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا لیکن اس کے باوجود چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تخلیق ہی ایسے نظریات کو شکست کرنے کے لئے ہوئی تھی اس لئے قدرت نے ان کی مخفی استعدادات کو ابھارا اور وہ ایک جدید زاویۂ نگاہ سے سماوی عجائبات کا مطالعہ کر سکنے کی توفیق سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے جس ستارہ میں بھی اضافی طور پر عظمت و کبریائی کا احساس کیا اس ہی کو "ھذا ربی" "ھذا اکبر"[2] کہتے ہوئے جبینِ نیاز

---

[1] کیمونسٹوں وغیرہ نے اس نظریۂ تضاد سے زندگی کے انقلابات کا فلسفہ پیش کیا ہے تاکہ مادی طاقتوں کے مثبت و منفی پہلوؤں کو خدا کی عظمت سپرد کی جاسکے۔ اور ماضی سے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے پروگرام بنانا بھی ممکن ہو جائے۔ مگر میرے نزدیک اس فلسفہ کی بنیاد ہی میں ایک شعوری اور استقرائی کمزوری ہے۔ اور اس بنا پر قانونِ الٰہی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام اور اس کے نظامِ حیات میں تفصیلی طور پر بحث کی جائیگی جسے کئی محبلات میں پیش کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ والتوفیق بیدہ۔ (ابوالنظر رضوی)

[2] مولانا عبید اللہ سندھی کا خیال ہے اور انھوں نے میری موجودگی میں اس پر روشنی ڈالی (باقی صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

جھکا دی۔ مگر جب انھوں نے ہر روشن ستارہ کو ڈوبتے، چھپتے اور تاریکیوں میں گم ہوتے ہوئے دیکھا تو احساسِ عظمت و برتری زخم خوردہ ہوگیا۔ ضمیرِ انسانی نے کروٹ لی اور ایسی عظمت و کبریائی کی دل آویزیوں سے انکار کر دیا جو تابندگی کو پایندگی نہ دے سکتی ہو۔ کارخانہ ہستی میں پروردگاری کا نظام تسلسل کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ لیکن جن عظمتوں سے ان پروردگاریوں کو وابستہ خیال کیا گیا تھا وہ خود اپنا تسلسل قائم نہیں رکھ سکتیں۔ ایسی حالت میں کیونکر یقین کیا جاتا کہ وہ پروردگاری کے نظام کا تسلسل قائم رکھ سکیں گی۔ جو خود ڈوب رہا ہو وہ دوسرے کو کس طرح ساحل تک پہنچا سکتا ہے ہو نہ ہو، پروردگاری کا سرچشمہ ستاروں کی دنیا سے بھی بلند تر عظمت ہی کا کوثر ہوگا۔

یہی وہ انقلاب تھا جس سے ان کی پاکیزہ فطرت نے نیا سانچہ تبدیل کر لیا۔ ستاروں کو پروردگار ماننے، ماننے ستاروں کے پروردگار تک پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے ایک اور ارتقائی منزل طے کی جسے مرگ و زیست کا فلسفہ اور اس کے گوناگوں تغیرات کا علم کہنا چاہیے۔ حضرت ابراہیمؑ مسلسل ارتقار اور پروردگاری کا بنیادی راز سمجھنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے اس دقیق ترین نکتہ کا حل تلاش کرنا چاہا جو موت کے راستہ سے بھی حیات و پروردگاری کا دعویٰ کر رہا تھا "کیف تحی الموتیٰ" اس ہی تشنگی کو بجھانے کا مطالبہ تھا۔ اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کے بعد وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ ربوبیت و ارتقار کا نظام و تسلسل مرگ و زیست کی قوتوں پر گرفت رکھنے والا ہی قائم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) کہ حضرت ابراہیمؑ نے "ہذا ربی" کی جو آواز بلند کی وہ وحدت الوجود کی بنیاد پر تھی ورنہ ستاروں کو رب نہ کہہ سکتے۔ مجھے مولانائے محترم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں حضرت ابراہیمؑ نے "ہذا ربی" ہی نہیں فرمایا بلکہ "ہذا اکبر" کے ذریعہ اعتراف ربوبیت کا راز بھی بتا دیا تھا۔ ان کے نزدیک عظمت ہی پروردگاری کے لئے دلیل راہ بن سکتی تھی یعنی عظیم ترین ہستی ہی کو پروردگار ہونا چاہیے۔ اسلام نے بھی اس تصور کو "اللہ اکبر" سے زندہ رکھا ہے مگر چونکہ کواکب کی عظمت کا تسلسل انھوں نے نہ پایا اس لئے پروردگاری کا تسلسل بھی اس سے وابستہ نہ کر سکے۔ حالانکہ کائنات میں نظام ربوبیت بغیر کسی وقفہ کے برسرِ عمل تھا، بنابریں حضرت ابراہیمؑ نے اعلان کر دیا کہ میں ایسی پروردگاری سے جذباتِ عقیدت و پرستش وابستہ نہیں کر سکتا بھلا اس چیز سے اور وحدت الوجود سے کیا تعلق؟ وحدت الوجود ایک ذہنی حقیقت ہے عملی فطرت رکھنے والے انبیار غیر عملی حقائق کی ترجمانی نہیں کیا کرتے۔ ابو النظر رضوی

کرسکتا ہے اس کے سوا جو کچھ ہے فریب نظر اور طلسم خیال۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ دریافت کرنا کہ مردوں کو کیونکر زندہ کیا جائے گا۔ دراصل موت سے زندگی اور ربوبیت وارتقاء کا راستہ معلوم کرنا تھا۔ کیونکہ "ملکوت السموات" کے مشاہدہ نے طبعی قوانین کے تحت جگمگانے اور ڈوب جانے یا زندہ ہوجانے اور مرجانے کا انداز تو پہلے ہی بتادیا تھا جب حضرت ابراہیمؑ ربوبیت کے نظامِ مسلسل اور رازہائے مرگ وزیست سے بھی باخبر ہوگئے تو اس دور کے نظریۂ ربوبیت کی اصلاح ان کے ذمہ رکھی گئی۔ نمرود جو سیاسی اقتدار سے اس غلط نظریہ کو کامیاب بنا رہا تھا اور غرورِ شاہی نے خود اس کے دل ودماغ پر بھی پردے ڈال دیئے تھے حضرت ابراہیمؑ نے بعض دوسری عملی تدابیر کے ساتھ اس سے گفتگو کرنے کو بھی اپنے پروگرام کا جز بنا لیا جیسا کہ انبیاء ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ سیاسی اقتدار پر جب تک ضرب نہ لگائی جائے کوئی پروگرام "تیمانہ" حیثیت میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اس ہی گفتگو کا مذکورہ آیت میں تذکرہ کیا ہے۔

ایک طرف حضرت ابراہیمؑ ہیں جو ربوبیت کے بنیادی فلسفہ کو سمجھے ہوئے تھے اور دوسری طرف نمرود تھا جس کی نگاہ شخصی ربوبیت کے مخصوص گوشوں سے بلند نہ ہوسکی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ گفتگو کے درمیان میں اس سے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک وہی پروردگار ہونا چاہئے جو مرگ و حیات دونوں پر گرفت رکھتا ہو، نہ زندگی اس کے قانونِ ربوبیت سے باہر قدم رکھ سکے، نہ موت کیونکہ قانونِ ربوبیت کا نفاذ کرسکنے کے لئے عضوی ساخت رکھنے والی کائنات کے سارے نظام سے کام لینا پڑے گا۔ ایک پودے اور ایک انسان کی پرورش بھی اس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ کائنات کی مشنری کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ گردش نہ کر رہا ہو۔ صدہا قوانین پرورش کے نظام کو سنبھالنے اور آگے بڑھاتے ہیں۔ ان قوانین کا توازن قائم رکھنے، مادہ کو خطِ مستقیم پر چلانے اور طرح طرح کی استعدادات کو نمایاں کرنے کے لئے تعمیر وتخریب اور مثبت ومنفی کام کرنے والا نظام جب تک کسی ہستی کے اشارہ پر رقص نہ کر رہا ہو ایک انسان، ایک پرند، ایک پودے، ایک

پھول اور ایک پنکھڑی کو بھی نشو ونما دینے کے امکانات پیدا نہیں ہو سکتے۔ لہذا اس ہی کو پروردگار ہونا چاہیئے جو زندگی اور موت دونوں پر نظامِ ربوبیت کو غالب کر سکتا ہو۔ مگر چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک سادہ اور مختصر سی بات فرمائی تھی۔ "ربی الذی یحیی ویمیت" نمرود اس کے عمومی تصور تک نہ پہنچ سکا۔ اس کا فکر و وجدان شخصی تصورات ہی میں گردش کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے "ابراہیمی نظریہ" کو بھی اپنے ذہنی اور وجدانی سانچہ پر ہی ڈھال لیا۔

یہ چیز نمرود ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی عام طور پر لوگ گفتگو کرتے ہوئے پہلے پہلے ان ہی تصورات میں گم رہتے ہیں جو ان کا دائرۂ تخیل پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ دوسرے کا کیا مطلب تھا بلکہ اپنے مطلب کو اس کا مدعا قرار دے کر مناظرہ کرنے لگتے ہیں۔ اکثر اس چیز کا اثر خود استدلال کرنے والے پر بھی پڑ جاتا ہے۔ اور وہ جذباتی اشتعال میں غلط لائنوں پر بحث کرنے لگتا اور ایک بے معنی جنگ کی نوعیت پیدا کر دیتا ہے۔ درمیان میں اگر کوئی سنجیدہ اور آزاد پوزیشن رکھنے والا جج ہوا تو یہ ہنگامہ فرو ہو جاتا اور دونوں اپنی غلط فہمیوں کا احساس کر لیتے ہیں ورنہ پوری پوری کانفرنسیں ناخوشگواری کے ساتھ ختم کر دی جاتی ہیں۔ بہر حال نمرود نے اپنے انفرادی تصور کے رنگ میں جسے محدود اجتماعیت بھی کہہ سکتے ہیں، جواب دیا " انا احی وامیت" میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ . . . .

. . . آپ کا خیال تھا کہ جو زندگی اور موت پر قابو نہ رکھتا ہو وہ پروردگاری نہیں کر سکتا۔ پروردگاری کے لئے ایجابی پہلوؤں کو ابھارنے اور سلبی طاقتوں کو محدود ڈگریوں میں رکھ سکنے کی طاقت ضروری ہے۔ مجھے آپ کا نظریہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں۔ واقعی جو زندگی مثبت و منفی قوتوں پر کنٹرول نہ کر سکتا ہو وہ پروردگار نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے تو آپ کے معیار سے بھی پروردگار ہونے کا حق رہے گا۔ کیا میں پورے ملک ہر قوم اور ہر فرد کی پرورش نہیں کر رہا۔ کیا کوئی صوبہ، کوئی گروہ، اور کوئی شخص میری زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، اور سیاسی پروردگاریوں سے بے پرواہ ہو سکتا ہے۔ کیا تعمیر و تخریب اور مرگ و زیست کی تمام قوتیں میری گرفت میں نہیں۔ کون ہے جسے میں تباہ

نہ کر سکوں، پھانسی پر نہ چڑھا سکوں اور کون ہے جو میری نوازشات و توجہاتِ خسروانہ کے باوجود کسی کو لذتِ حیات اور عیشِ دوام سے محروم کر سکے۔ اگر یہ سب سچ ہے اور آپ بھی اپنے نظریہ کی صداقت پر قائم ہوں تو پھر کیوں میری پروردگاریاں دیکھتے ہوئے آپ بھی سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔

حضرت ابراہیمؑ سمجھ گئے کہ نمرود اس ہمہ گیر اور مسلسل تصور تک رسائی نہیں حاصل کر سکا جو پروردگاری کے لئے ضروری تھا بلکہ جغرافیائی اور شخصی حدود ہی کو اس نے محدود پروردگاری کے لئے کافی خیال کر لیا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس کی پروردگاری کو تسلیم کرتے ہوئے صرف اتنی خواہش ظاہر کی کہ اس دعوے کا ثبوت فراہم کر دیا جائے۔ نمرود نے دریافت کیا کہ آپ کی طمانیتِ قلب کس قسم کے ثبوت سے ہو سکتی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِی بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ   خدا سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو

فَأْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔   پچھم سے نکال دے۔

یعنی موجودہ نظامِ حیات و پروردگاری (نہ کہ قوانینِ تخلیق و ابداع) نظامِ فلکی کی اس گردش سے وابستہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے طلوع کرے چنانچہ آپ کی سائینٹفک ریسرچ بھی اس کے خلاف نہیں ورنہ کواکب کی روحانی طاقتوں کو آپ پرستش کے قابل کیوں سمجھتے اور ان کی رفتاروں سے ماضی و مستقبل کو کیوں وابستہ کیا جاتا۔ چونکہ آپ کے نزدیک بھی نجوم و کواکب کی وہ ہی رفتاریں جو نظامِ شمسی سے وابستہ ہیں۔ کارخانۂ ہستی کو زندگی اور تابندگی تقسیم کر رہی ہیں اس لئے کواکب کی پروردگاری تو مابہ النزاع نہیں ہو سکتی۔

سوال صرف اتنا ہے کہ یہ نظام، یہ رفتاریں، یہ طلوع وغروب "تقدیر العزیز العلیم" کی فرماں پذیری ہے یا آپ کے اشارۂ چشم و ابرو کا۔ اگر آپ اس نظام کے تبدیل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں تو آپ کی پروردگاری سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر نظامِ شمسی کے اس تغیر سے کارخانۂ ہستی پر موت کی ہیبت ناکیاں طاری نہ ہوں تو نظامِ زندگی پر آپ کی گرفت ثابت ہو جائے گی۔ اور اس ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ موت بھی آپ کی جنبشِ نگاہ کی تابع تھی

یا نہیں۔ یا بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ اگر وہ تقدیر، وہ اندازۂ استعداد اور مقررہ رفتاروں کا وہ نظامِ جذب و انجذاب شکست ہو جائے۔ جس کے تحت آج کائناتِ ارضی سرسبز و شاداب ہے اور انسان اس کے زیرِ سایہ علوم و تمدن میں برابر ترقی کر رہا ہے تو یقیناً موجودہ زندگی فنا ہو جائے گی۔ اس کے بعد ایک نیا نظامِ حیات مغرب سے آفتاب کو طلوع کر کے قائم کیجئے۔ اس طرح "انا احی و امیت" کا ثبوت فراہم ہو جائے گا جو پروردگاری کی پہلی اور آخری نشانی تھی۔

اس مطالبۂ ثبوت کی نوعیت سمجھانے کا ایک اور بھی طریقہ ہے۔ نہایت سادہ اور قرآنی اسلوبِ بیان سے قریب تر۔ وہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ نمرود پروردگاری کا مساویانہ دعوے کر کے مجھے اپنا حلقہ بگوش بنانا چاہتا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ چونکہ کائناتِ ارضی اور اس کی وسیع ترین فضاؤں کا آفتاب اور اس کی رفتاروں کے مخصوص نظام سے کسبِ حیات و ارتقار کرتے رہنے کا سلسلہ آپ ہی نہیں، آپ کے آباؤ اجداد سے بھی قدیم تر ہے۔ اس لئے یہ تو نہیں قیاس کیا جا سکتا کہ وہ آج تک آپ کی جنبشِ نگاہ پر گردش کرتا رہا ہے اسے تو یقیناً ایک ایسی ہی ذات نے قائم کیا ہو گا جو ازل سے ہو اور جسے خدا کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو حیات و مرگ پر مساویانہ اقتدار کا دعویٰ ہے تو طلوع و غروب کا نظام بالکل تبدیل کر دیجئے۔ تاکہ خدا کا بنایا ہوا نظامِ حیات شکست ہو جائے۔[1] اس نے بنایا تھا۔ آپ نے بگاڑ دیا۔ دونوں کی مساویانہ طاقت ثابت ہو گئی۔

---

[1] قرآن نے جہاں یہ دعویٰ کیا تھا کہ "لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر و لا اللیل سابق النہار ذلک تقدیر العزیز العلیم" نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے، نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ یہ ہی ہے ایک طاقت ور اور باخبر ہستی کا قائم کیا ہوا نظام۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند، سورج کی رفتاریں ان کی جبلت کا تقاضہ ہیں۔ اور انھیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہیں اس نے آثارِ قیامت میں جس کے دوسرے معنی تخریبِ نظام ہیں۔ بتایا تھا کہ "یوم یأتی بعض اٰیاتِ ربّک طلوع الشمس من المغرب" یعنی پروردگار موجود ہونے کے ثبوت میں یا یوں کہئے کہ آیاتِ ربوبیت میں سے دوسری نشانیوں کے ساتھ ایک نشانی مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا ہے۔ اس کے دو معنوی پہلو نکل سکتے تھے۔ ایک یہ کہ پروردگار سے انکار کرنے والوں کو نظامِ حیات کے تخریبی تغیر سے یقین ہو جائے گا کہ جو کچھ ہم سمجھتے تھے وہ درست نہ تھا۔ اب بازپرس کا وقت آ ہی گیا۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

بصورت دیگر اس پروردگاری کو آپ سے نسبت نہ دی جاسکے گی۔ جس کا نظم نہ آپ تیار کر سکے تھے، نہ آپ بگاڑ سکتے ہیں۔ بنانے والے کی برابر طاقت رکھنے والا ہی بگاڑ سکتا ہے۔ آپ دونوں میں سے صرف ایک کام کر دیجئے۔ زندگی اور موت آپ کے تحتِ قدرت بھی ثابت ہو جائے گی۔

نمرود ستارہ پرست قوم کا ایک فرد تھا اور ستارہ پرستی کا آغاز نجوم وہیئت کے ان مشاہدات ہی سے ہوا تھا جو کائنات کے ہر گوشہ میں قوت، احساس اور جوشِ نمو تقسیم کرتے ہوئے ربوبیت کا سیلاب لا رہے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان کی سائنٹیفک تحقیقات اتنی ترقی یافتہ نہ ہو سکی تھی کہ لوگ عام طور پر خود ستاروں کو ایک نظام میں جکڑا ہوا محسوس کر سکتے۔ یا ان روحانی قوتوں کا مرکز تلاش کر سکتے۔ جسے وہ کواکب کی طرف منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ قوتیں خود ان ہی کی شخصیتوں میں ودیعت کر دی گئی تھیں یا طبعی عوامل کے تحت۔ لیکن اقتضائے دورہ کی کمزوریوں سے بے خبر ہونے کی بناء پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دوسرے یہ کہ پروردگاریوں کا ایک ہی قانون و نظام نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھ لیا تھا بلکہ خدا اس کو تبدیل کرکے دوسرا نظامِ ربوبیت بھی اس ہی زندگی میں قائم کر سکتا ہے۔ پہلی چیز ہی زیادہ وزنی ہے۔ قیامت، مادی زندگی کا تخریبِ عام سے پہلے کوئی نظامِ ربوبیت قائم کرنے نہیں آئے گی۔ قرآن کی صدہا آیات اس کی تائید کر رہی ہیں اور اس ہی لئے نمرود سے مغرب کو مشرق بنانے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ زندگی کا نظام مٹ جائے۔ لیکن علماء نے اس آیت کے دوسرے پہلو سے کافی دلچسپی لی۔ بعض نے لکھا کہ "فی ذالک رد علی اصحاب الھیئۃ ومن وافقھم ان الشمس وغیرھا من الفلکیات بسیطۃ لا تختلف مقتضیاتھا ولا یتطرق الیھا تغیر ما ھی علیہ" (فتح الباری جزء حادی عشر ص ۳۰۷) حالانکہ نمرود سے مطالبہ بھی اس ہی تصور کے تحت کیا گیا تھا اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی یہی دعویٰ کیا گیا ہے۔ خواہ بساطت وغیرہ کو علت نہ قرار دیا گیا ہو ہاں ان فلاسفہ کی اس سے ضرور تردید ہو سکتی ہے جو اس نظامِ فلکی کو ابدی تسلیم کرتے ہوں ورنہ یونانی فلاسفہ جو خدا اور نیک عملی پر ایمان رکھتے تھے اس آیت کی رد میں نہیں لائے جاسکتے اور بعض علماء نے اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور فرمایا کہ یہ دوسرا نظامِ ربوبیت ایک سو بیس سال تک رہیگا۔ شاید مدعا یہ تھا کہ پروردگاری کی یہ جدید نمائش ایک معقول زمانہ تک ضرور ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ نظامِ شمسی کا یہ جدید تغیر اس سے بھی زیادہ عرصہ تک رہے کیونکہ توازن قائم رکھنے والی توانائی کا نظام بہر حال رفتہ رفتہ ہی شکست ہوگا۔ عقل بھی یہی کہتی ہے اور قرآن بھی مگر اسے ربوبیت کا جدید نظام نہیں کہہ سکتے ہاں انقلاب کا عبوری دور کہہ سکتے ہیں۔ بنا بریں مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ نمرود سے مذکورہ مطالبہ زندگی کے مقابلہ پر موت کو غلبہ دے سکنے کا مطالبہ تھا۔ (ابوالنظر رضوی)

عقائد و نظریات تبدیل نہیں ہو سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ فطری استعدادات اور انسانی احساسات کا تزکیہ پیغمبرانہ قوتوں سے کیا جاتا۔ انسان حقائق تک پہنچنے کے لئے اشاعتِ علوم کا محتاج نہیں اس کا شعور و وجدان سب کچھ محسوس کر سکتا ہے مگر خود اس استعداد کا نمایاں ہو سکنا بعض اسباب و علل کے بغیر ممکن نہیں۔ جن میں سے اکتسابی علل بھی ہیں اور غیر اکتسابی بھی۔

بہر حال ستارہ پرستی کرنے والی قوم، کائناتِ ارضی کے اس ربط و وابستگی سے ناآشنا تھی جو اسے موجودہ نظامِ شمسی سے جذبِ حیات کے لئے ہونا چاہیے۔ اس ہی لئے حضرت ابراہیمؑ نے پروردگاری کا جو ثبوت طلب کیا تھا اسے کواکب پرستانہ ذہنیت اور ذوقِ طبع کے خلاف نہیں کہہ سکتے۔ اس سے زیادہ توافق کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ اس ہی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ نمرود ایک ایسی حقیقت کا انکار کرے جو خود اس کے دائرۂ تخیل کا ترجمان ہو۔

فبھت الذی کفر جس نے خدا کی ربوبیت کا انکار کیا تھا نتیجہ میں ہکا بکا رہ گیا۔

یہ کہنا کہ یہ ہی مطالبہ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ سے کیوں نہ دہرایا نہ صرف اس نقطۂ نظر سے درست نہیں کہ اسے جس قدر شوخ، بے باک اور کج فہم سمجھ لیا گیا یا اپنی پوزیشن محفوظ کرنے کے لئے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہ اتنا شوخ چشم ہی نہ تھا اس کی ساری گفتگو عام انسانی فطرت اور شخصی ذوقِ طبع کے عین مطابق تھی۔ ہر دوسرا شخص اس ماحول اور اس فکر و وجدان کے تحت وہی باتیں کرتا جو نمرود کرتا رہا۔

(حضرت ابراہیمؑ اس کے ذوقِ طبع اور ماحولی تصورات سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس بنا پر وہ اس بیماری کی ہر علامت، ہر کمزوری اور ہر پہلو کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ بات چیت کی وہ نبض شناسی کا بہترین معجزہ تھا) بلکہ اس بنا پر بھی اسے وقعت نہیں دی جا سکتی کہ اگر بالفرض خدا کا پروردگار ہونا ثابت نہ ہوتا تب بھی اس کے دعوہائے ربوبیت کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کا انکار کسی سلبی جذبہ اور خدا کی نفرت یا دشمنی پر مبنی نہ تھا بلکہ وہ اپنی پروردگاری کو تسلیم کرانا چاہتا تھا۔

سوال دہرانے کے دوسرے معنی یہ ہی ہو سکتے تھے کہ اسے یہ چیز تسلیم ہے کہ پروردگاری

کے لئے جس نظامِ شمسی کو شکست کرکے قانونِ مرگ وزیست پر قابو یافتہ ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہئے تھا اس کا کوئی امکان نہیں یعنی حضرت ابراہیمؑ کا پروردگار ہو یا نہ ہو۔ میں یقیناً پروردگار نہیں۔ صرف اتنی بات ہی سے حضرت ابراہیمؑ اس مجادلۂ ربوبیت میں کامیاب ہوجاتے اور وہ سارا معاشی نظام جو نمرود کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے ستارہ پرستی کے تصور پر گردش کر رہا تھا انقلاب و گردش کے طوفان سے شکست قبول کرلیتا۔ اور اس نظام کا شکست ہوجانا ہی قانونِ الٰہی کے تحت نظامِ حیات قائم کرنے کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دیتا۔

علاوہ ازیں مطالبۂ ابراہیمی کو دہرانا اس وجہ سے بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا کہ نمرود دہریہ اور خدا کا منکر نہ تھا[1]۔ خالقیت اس کے نزدیک بھی انسانی دسترس سے باہر تھی اور جب یہ ثابت ہوجاتا کہ نمرود جیسی عظمت وسطوت رکھنے والا بادشاہ بھی پروردگاری کی کوئی طاقت نہیں رکھتا تو اس کے نفسیاتی رجحانات پروردگاری کا انتساب کرنے کے لئے خالق وصانع عالم سے ادھر ٹھہر ہی نہ سکتے تم اس کا دل خود پکار اٹھتا کہ اگر میں بھی پروردگار نہیں ہوں تو خدا کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہوسکتا۔ سورج آج ہی سروں پر نہیں چمک رہا بلکہ ہزاروں برس اسے روشنی تقسیم کرتے ہوئے گذر گئے۔ اگر نمرود جیسی ہستیاں بھی اس کی نمایندگی کرتے ہوئے ربوبیت کا دعویٰ نہیں کرسکتیں تو پھر کون اس کا مستحق ہوسکیگا۔ لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ وہ ہی پروردگار ہوسکتا ہے جو نامعلوم عرصہ سے تخلیق اور تخلیقی ارتقار کا ذمہ دار رہا ہو اور یہ ہی حضرت ابراہیمؑ کا مقصدِ تبلیغ تھا۔ نمرود کا مطالبۂ ابراہیمی کو پورا نہ کرسکنا اور مطالبہ کو دہرانا ایک ہی نتیجہ پیدا کرتا۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مطالبہ دوہرانے سے فخر و غرور کا سر او پچا کرنے کے امکانات ہوسکتے تھے۔

اب صرف ایک سوال اور رہ جاتا ہے جس کا جواب دینا باقی رہ گیا کہ اگر نمرود سے بغیر نوعیت متعین گئے[2]

---

[1] خدا کے منکر بھی آج تک اپنے آپ کو خالق نہ کہہ سکے، ناقابلِ گرفت توانائی ہی کو خالق و پروردگار تسلیم کرنا پڑا۔ پھر نمرود سے یہ توقع کیونکر قائم کی جاسکتی ہے ۔ [2] دراصل مولوی صاحب کے ذہن میں اس سوال کے وقت خالقیت کا تصور تھا جو موضوعِ بحث سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا۔ لیکن میں نے ایک قدم آگے بڑھکر ربوبیت کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اس گتھی کو سلجھانا ضروری خیال کیا۔ کاش یہ مضمون خود مولوی عبدالحق صاحب کی نظر سے بھی گذر سکتا جن کا پتہ معلوم نہیں۔ (ابو النظر رضوی)

پروردگاری کا ثبوت طلب کرلیا جاتا تو وہ پہلے وقفہ ہی میں سپر انداز ہوجاتا، حالانکہ اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ صاف کہہ سکتا تھا کہ متمدن دنیا میں آپ جو گوناگوں ترقیات دیکھ رہے ہیں یہ میری ہی پروردگاری کا نتیجہ ہے۔ آبپاشی کے ذرائع سے میں نے جنگلوں کو سرسبز کھیتوں میں تبدیل کردیا، وسائل صحت و تندرستی سے صحتِ عامہ کو جوان کردیا، کالجوں سے علمی نشو ونما میرے ہی توسط سے ہورہی ہے اور بہتر سے بہتر تعمیرات کرسکنے کے مواقع میں نے ہی پیدا کئے۔ ملک کی دولت میں مسلسل اضافہ میری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ امیری اور غریبی میری ہی چشم کرم کے کشاد و بند کا دوسرا نام ہے کوئی فرد اور کوئی جماعت میرے فیصلہ کے بعد نہ زندہ رہ سکتی ہے نہ اسے کوئی مار سکتا ہے۔ زندگی کا کونسا گوشہ ہے جو میری پروردگاری سے نہ جگمگا رہا ہو۔

حضرت ابراہیمؑ اس کا کیا جواب دیتے لازمی طور پر خاموش ہوجانا پڑتا یا شاہدات سے انکار کرنے کے لئے ایسا پیچیدہ راستہ اختیار کرنا پڑتا جو مناظرہ کا دروازہ کھول دے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے ربوبیت و پروردگاری کے ثبوت کا معیار مقرر کرلینا پسند کیا۔ جب اس معیار کے مطابق اس نے پروردگاری کا دعوی کیا تو انھوں نے ایک ایسا ثبوت طلب کیا جو معیار کے بنیادی تصور کو بہترین اور وسیع ترین صورت میں نمایاں کرسکتا تھا۔ نمرود ثبوت فراہم نہ کرسکا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ثبوت اس کی معلومات، ذوقِ طبع اور قومی نظریہ کے بالکل ہم رنگ تھا۔ ایسے حالات میں انسانی فطرت کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ جذبات و شعور کے دوگونہ مطالبات کے درمیان مبہوت ہوکر رہ جائے۔ شخصی جذبات کا تقاضہ پروردگاری کا اعتراف کرانا تھا اور انسانی ذہن کا تقاضہ اعترافِ شکست کرلینا وہ کچھ نہ طے کرسکا کہ کیا کرے۔ دو قوتوں یا متوازن کششوں کے درمیان معلق ہوکر رہ گیا۔ کیا اس پر بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اقدام کیوں کیا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔

یہ تھا وہ "مجادلہ حسنہ" جس کا سبق ہمارے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا۔ کیونکہ ان کے پیغمبرانہ پیغامات کو قومی اور بین الاقوامی انقلابات سے گذرنا تھا اور ہدایت کی کوئی روشنی نہیں پہنچائی جاسکتی تھی۔ اگر وہ اور ان کے مبلغین مناظرہ کی بجائے مجادلۂ حسنہ کو شمعِ راہ نہ بنا سکتے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس مجادلہ میں دلائل کا اختلاف موجود ہے۔ کیا ذوقِ طبع کا اندازہ نہیں کیا جاسکا۔ کیا

احساسِ شکست کو ذوقِ طبع کا سہارا مالینا ضروری ہے؟

یہ تھا وہ حل جو مجھے مطمئن کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنی جگہ مکمل تعلیم اور بہترین اسباق رکھتا ہے۔ مگر انسان کے محدود ذہنی اور نفسی دوائر تمام پہلوؤں تک ایک وقت میں اور ایک جماعت کے ذریعہ نہیں پہنچ سکتے۔ ہر زمانہ میں ہر مسلمان کو اس پر غور کرتے رہنا چاہئے۔ کوئی نکتہ کسی کی سمجھ میں آجائے گا اور کوئی نکتہ کسی کی۔ اس طرح تمام رجحانات اور ہر ذہنی ارتقار کی تسکین کا سامان مہیا ہوتے رہنا ممکن ہے۔ ورنہ اگر ہمیشہ پیچھے کی طرف ہی دیکھتے رہے تو آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ حالانکہ زمانہ ہر پہلو سے بدل رہا اور نئے نئے سوالات پیدا کر رہا ہوگا۔

اسلام میں حکومت کا تصور

از جناب محمد آصف صاحب سیوہاروی بی۔اے

آغازِ انسانیت سے لیکر آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں کسی رنگ اور کسی طرز کی حکومت کسی حصہ زمین پر نہ رہی ہو۔ سیاسی مفکروں میں اگرچہ حکومت کی پیدائش کے سلسلہ میں بہت کچھ اختلاف ہے لیکن اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ انسان ہمیشہ کسی نہ کسی حکومت کے ماتحت رہا ہے اس میں شک نہیں کہ حکومت کی تعریف وقت اور زمانہ کے اعتبار سے مختلف رہی ہے لیکن بعض شرائط جو اداروں کو حکومت کہلائے جانے میں ممد و معاون ہوتی ہیں، قدیم سوسائٹی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ افلاطون کا یہ خیال "کہ کنبہ اور حکومت میں صرف وسعت کا فرق ہے" زیادہ صحیح نہیں ہے پھر بھی کنبہ اور حکومت میں بعض اہم جز مشترک پائے جاتے ہیں اور کنبہ بڑی حد تک موجودہ حکومت کی تشکیل میں معاون رہا ہے، کنبہ داری سے قبل کی سوسائٹی یقیناً آغازِ انسانیت سے قبل کی سوسائٹی قرار پائیگی اور اس لئے اس دور میں کسی قسم کی حکومت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ارسطو کا قول "انسان مل جل کر رہنے والا جانور ہے وہ کبھی بغیر سوسائٹی کے نہیں رہا" یہ بھی ہمارے خیال میں آغازِ انسانیت سے متعلق ہے۔

اس وقت دنیا میں جو سیاسی اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں ایک اہم سبب حکومت سے عوام کی ناواقفیت بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں حکومت کے جو ڈھانچے پائے جاتے ہیں۔ وہ کسی نے ایک دن میں بنا کر نہیں کھڑے کر دیئے بلکہ حکومت بھی اور چیزوں کی طرح ارتقائی منزلوں سے گزرتی رہی ہے۔ روم اور یونان کی معروف العوام حکومتوں سے لے کر موجودہ دور کی حکومتوں تک ان میں سینکڑوں تبدیلیاں ظہور پذیر

ہوئیں اور حکومت بے شمار انقلابی وادیوں کو طے کرکے اور "ہفت صد ہفتاد قالب" دیکھکر موجودہ منزل تک پہنچی ہے۔ اس زمانہ میں حکومت کی مختلف النوع اشکال اور نت نئے نظریوں کے سامنے انسان مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے اور جب تک حکومت کے بارے میں اس کو کافی وشافی علم نہ ہو وہ اپنے خیالات کو ایک مرکز پر جمع نہیں کرسکتا۔

اہلِ یورپ میں تو بہت پہلے سے ایک گروہ جمہوریت سے بدظن تھا اور اسی گروہ نے مل کر "نازی" "فاشیٹ" "کمیونسٹ" حکومتوں کی بنا ڈالی۔ مگر اب ہندوستان بھی جس کی معراج کبھی صرف جمہوری حکومت حاصل کرنا تھا اسوقت جمہوریت سے بدظن ہے اور یہاں کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد جمہوریت کے نوزائیدہ پودہ کی بیخ کنی پر آمادہ نظر آتی ہے۔ یہ سوال کہ کونسی جماعت راہِ راست پر ہے اس کا جواب آسان نہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کسی اصول کے ماتحت رائے قائم کرتے ہیں۔ عوام حکومت کی بھول بھلیاں سے ناواقف ہیں وہ ہر شعلہ پر شمع کا گمان کرکے پروانہ وار اس کا طواف شروع کردیتے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت اور بھی قابلِ افسوس ہے۔ ان میں ایک بہت بڑا طبقہ یہ یقین کر بیٹھا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہوجانے سے اسلامی اصول بھی فنا ہوگئے۔ وہ مغربی مورخین کی ساحرانہ تحریروں کے زیرِ اثر یورپ سے ایسے مرعوب و مسحور ہوگئے کہ کسی اسلامی ادارہ کی طرف توجہ کرنا جہالت کا مترادف سمجھتے ہیں۔ تاریخِ سیاست میں تو ان کا سرے سے نام ہی نہیں۔ مفکرینِ یورپ میں جہاں کسی مفکر نے یہ کہا کہ مسلمانی حکومتیں صرف دینی حکومتیں (Theocracy) تھیں، مغرب زدہ سادہ لوح مسلمان بھی یہ سمجھنے لگا کہ سیاست کی اندھیریوں کے لیے خضرِ راہ مغرب کے علاوہ کوئی نہیں۔ ایسا گمان رکھنے والوں سے ہماری گذارش ہے ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

حکومت کی تعریف اس تمہید کے بعد اب ہم اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ حکومت وہ سیاسی نظام ہے جس کے ذریعہ ریاست اپنے احکام جاری کرتی ہے یا جیسے فرانسس لیبر

(Francis Leeb) نے کہا ہے کہ حکومت وہ آلہ یا کل ہے جس کے ذریعہ ریاست ہر اس موقع پر کام کرتی ہے جب وہ براہِ راست اپنے اقتدار کو کام میں نہیں لاتی۔

حکومت کے اقسام | حکومت کی قسموں کے متعلق بہت سے اختلافات موجود ہیں اور سیاسی مفکروں نے مختلف اصول کے ماتحت اس کی مختلف قسمیں قرار دی ہیں۔ بعض مفکر تقسیم کا اصول ان آدمیوں کی تعداد قرار دیتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اقتدارِ اعلیٰ ہو۔ اس اصول کے ماتحت حکومت کی تین قسمیں کی گئیں ہیں۔

(۱) سلطانی یا شخصی حکومت . . . . (Monarchical)

(۲) اشرافی . . . . (Aristocratic)

(۳) جمہوری . . . . (Democratic)

اگر سرکاری اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ہے قطع نظر اس سے کہ اس کے ماتحت کتنے افسر کام کرتے ہیں تو طرزِ حکومت شخصی کہلائے گا۔ اس سلسلہ میں عام کسوٹی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اگر کسی حکومت کا حکمران سلطنت پر حقِ وراثت سے حکمرانی کرتا ہے تو وہ حکومت شخصی کہلائے گی۔ لیکن حکومت کی یہ تقسیم ارسطو کے زمانہ کی ہے۔ موجودہ زمانہ میں حکومت کا طریقہ اس قدر بدل گیا ہے اور اتنے جدید طرز پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کو کسی ایک عنوان کے ماتحت ملانا دشوار ہے۔

مثال کے طور پر انگلستان کی حکومت کو لیجئے جس میں بادشاہت سلسلہ بہ سلسلہ ایک ہی خاندان میں چلی آتی ہے اور حکمران صرف اس حق سے فرمانروائی کرتا ہے کہ اس سے قبل اس کا باپ حکومت کرتا تھا، انگلستان کے نامکمل آئین کے مطابق بادشاہ قانون کا سرچشمہ ہے حکومت اس کی حکومت ہے۔ وزارتیں اس کے وزرا ہیں۔ عدالتیں اس کی عدالتیں ہیں اور وہ خود قانون کے بالا و مبرا ہے۔ انگریزی ضرب المثل کہ "بادشاہ کوئی جرم نہیں کرسکتا" بھی اسی لئے ہے کہ بادشاہ قانون کا منبع ہے اور اس لئے قانون سے بالاتر ہے۔ مگر یہ سب کچھ ایک کیمیائی نمود کے سوا

کچھ نہیں۔ حقیقت میں بادشاہ کو کوئی اختیار نہیں اور تمام اختیارات وزیر اعظم بادشاہ کے نام پر استعمال کرتا ہے۔ بادشاہ محض ایک کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ایسے موقع پر قدیم تعلیم کی حقیقی دقت محسوس ہوتی ہے بہ اعتبار صورت انگلستان کی حکومت شخصی حکومت ہے اور بہ اعتبار روح جمہوری۔ اور یہ مسئلہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اگر امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ حکومتوں پر قیاس کیا جائے۔ بہرنوع جن اصولِ تقسیم کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے ہر وہ حکومت جس میں ایک شخص کو سرکاری اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے اور وہ حق وراثت سے گدی کا مالک بنا ہے اور تخت سلطنت پر تازیست قایم رہنے کا حق رکھتا ہے۔ وہ حکومت شخصی کہلائے گی۔ اور اگر سرکاری اقتدارِ اعلیٰ چند انسانوں یا آبادی کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں ہو تو حکومت اشرافی کہلائے گی۔ اس طرزِ حکومت میں آبادی کی اقلیت، اکثریت پر حکمرانی کرتی ہے لیکن اگر آبادی کی اکثریت کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے اور سرکاری اقتدارِ اعلیٰ میں ایک کثیر تعداد حصہ دار ہے، خواہ شرکت نمایندہ جماعت کے ذریعہ سے ہو، تو ایسی حکومت جمہوری حکومت کہلاتی ہے۔

حکومت کی یہ تقسیم بہت پرانی ہے اور اس دور میں اس کی اہمیت تقریباً فنا ہو گئی ہے کسی حکومت کے متعلق محض اتنی بات کہنے سے کہ وہ شخصی یا اشرافی حکومت ہے، حکومت کی بناوٹ اور اس کے عملی طریقے کی وضاحت نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے حکومت کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس تقسیم کے ماتحت حکومتہائے انگلستان، روس اور ترکی سب ایک خانہ میں آجاتی ہیں۔ حالانکہ یہ امر کہ یہ حکومتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ اسی طرح فرانس اور امریکہ ایک ہی قسم کی حکومت کے ماتحت منقسم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غرض کہ یہ تقسیم اس زمانہ میں ناقص بھی ہے اور غیر مفید بھی۔

اسی طرح دوسرے لوگوں نے حکومت کی تقسیم کی ہے۔ مان ٹسکیو (Montesquie) نے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں (۱) حکومت جمہوریہ (Republics) (۲) شخصی حکومت

(۳) حکومت خود مختاری - جمہوری حکومت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "حکومت جمہوریہ وہ حکومت ہے جس میں کل جماعت یا آبادی کا ایک حصہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہو"۔ حکومت خود مختاری وہ ہے جس میں ایک انسان اپنی مرضی سے تمام نظم و نسق کرے۔ یہاں اصولِ تقسیم ضروری طور پر تعداد ہے اور جزوی طور پر طرز و منشائے حکومت ہے۔

وولزلے (Woolsly.) نے حکومت کی چار قسمیں لکھی ہیں (۱) شہنشاہیت (Monarchy) (۲) اشرافیہ (Aristocracy) (۳) جمہوریہ (Democracy) (۴) مخلوط ریاست (Compound State) اسی طرح مختلف مفکرین نے مختلف قسمیں کی ہیں۔ نیز ان مفکروں میں اصطلاحات کی تطبیق کے سلسلہ میں بہت کچھ اختلاف ہے۔

اس تقسیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ کوئی تقسیم کسی جامع اصول کے ماتحت نہیں۔ ان میں سے کسی تقسیم کو بھی ہم کسوٹی بنا کر دنیا کی حکومتوں کو نہیں پرکھ سکتے، ہر شخص نے اپنے نظریہ کے مطابق علیحدہ علیحدہ تقسیم کی ہے۔ اتنے ہی اصول ہیں جتنے کہ مفکر۔ اور نہ ان نظریوں کے اندر کوئی جامع اصول مشترک ہے۔ ان میں سے کوئی نظریہ ایسا نہیں جس سے فی الواقع مختلف حکومتوں کے مابین امتیاز قائم کیا جا سکے۔

ساخت اور طرز و منشائے حکومت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ تقسیم کے سوا چارہ نہیں۔ بعض حکومتیں بناوٹ کے لحاظ سے یکساں ہیں مگر ان کا طرزِ حکومت بالکل جداگانہ ہے اس لئے جو تقسیم اپنے قالب اور ساخت کے لحاظ سے ہوگی۔ وہ طرزِ حکومت پر ٹھیک نہیں اتر سکتی۔ اسی بنا پر مختلف حیثیتوں سے حکومتوں کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اور یہ بحث اس قدر طویل ہے کہ اس پر خود ایک بسیط مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہمیں صرف دیکھنا یہ ہے کہ جتنی حکومتیں اب تک دنیا میں قائم ہوئیں ان کا کیا منشا تھا اور مفکروں کی حکومت کے بارے میں کیا رائے ہے اور بہترین حکومت کس حکومت کو کہا جا سکتا ہے۔

مشہور و معروف شاعر پوپ نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات کہی ہے۔

"For Forms of Government let fools Contest
That which is best administered is best."

"یعنی اقسام حکومت کے بارے میں بیوقوفوں کو جھگڑنے دو۔ جو حکومت بہتر طریقہ پر انتظام وانصرام کرتی ہے وہی بہترین ہے"

اگرچہ سیاسی مفکروں کے لئے یہ بات تشفی بخش نہیں ہوسکتی مگر اس سے یہ اصول ضرور نکلتا ہے کہ حکومت کی ظاہری ساخت اتنی اہم نہیں جتنا اہم طرز ومنشائے حکومت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حکومتیں دو ہی طرح کی ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ جو چند یا کسی ایک شخص کے احکام کا آلۂ کار رہوں اور دوسری وہ جس میں ہر انسان حکومت کے بارے میں مساوی حقوق رکھتا ہو، ہر شخص اپنے حقوق کا استعمال کرے یا نہ کرے یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ بحث صرف اس پر ہے کہ ہر شخص کو حکومت میں دخل دینے کا حق حاصل ہو۔ خواہ اس کی رائے کی پذیرائی ہوسکے یا نہ ہوسکے۔ حکومت کی بنیاد آبادی پر قائم ہے۔ اور آبادی کے تحفظ اور آسائش وراحت پر حکومت کی تعمیر ہوتی ہے۔ آبادی ہی ملکر حکومت بناتی ہے اور آبادی ہی کی فلاح وبہبود حکومت کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ پس اگر تمام آبادی حکومت میں برابر کی حصہ دار ہے تو حکومت انصاف پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص یا جماعت اپنے اقتدار ومنفعت کے لیے حکومت کرتی ہے تو وہ ظالم ہے۔ شخصی حکومت میں بھی جمہوریت قائم رہتی ہے جیسے امریکہ میں اور اشرافی حکومت میں بھی جیسے سوئزرلینڈ میں جہاں وزرا کی ایک جماعت مل کر حکومت کرتی ہے اور شہنشاہیت میں بھی جیسا کہ انگلستان کا طرزِ حکومت ہے۔ منصفانہ اور غیر منصفانہ حکومت کی سیکڑوں قسمیں ہوسکتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح بناوٹ کے لحاظ سے بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ منصفانہ حکومتوں کے تحت تمام وہ شخصی، اشرافی، جمہوریتیں، صدارتی، ری پبلک اور دینی حکومتیں آجاتی ہیں جن کی بنیاد آبادی کے مساوی حقوق پر قائم ہو۔ اسی طرح غیر منصفانہ حکومت کے تحت تمام وہ حکومتیں آجاتی ہیں جن میں آبادی کے ساتھ ناانصافی برتی جائے۔

لفظِ مساوات بہت سے غلط معنوں کا حامل ہے اس لئے اس لفظ کا محلِ استعمال اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ یہ اس جگہ ایک خاص معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مساوات سے مراد مساوی حقوق سے ہے یعنی ہر شخص کو بغیر خوف وخطر حکومت پر اعتراضات کرنے کا حق حاصل ہو۔ اس حق کا غلط استعمال

بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر فتنہ پرداز اپنی کام جوئیوں کی تلقین کو اپنا حق بتا سکتا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کہ کونسی بات مناسب ہے اور کونسی نامناسب اکثریت کا حق ہے اور اکثریت ہی کی بات قابلِ قبول ہو سکتی ہے، لیکن اسلام میں اکثریت کا تصور ایک آزاد اکثریت کا تصور ہے۔ اگر آبادی اکثریت اور اقلیت میں باقاعدہ طور پر منقسم ہے تو یہ ایک خطرناک قسم کی تقسیم ہے جو آزادی کے منافی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جمہوریت جماعتی نظام سے وابستہ ہے۔ اور جماعتی پابندی حکومت کی پابندی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ہر جماعت پہلے سے لائحہ عمل بنا لیتی ہے اور اس پر اس شد و مد سے عمل پیرا ہوتی ہے کہ کسی فرد کو اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی اور بالفرض اگر کسی نے اس کی جرأت کی بھی تو فوراً اس کو جماعت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ [۱]

دوسری بات جو اسلام میں سب سے زیادہ نمایاں اور دوسری قسم کی حکومتوں سے بہر حیثیت مختلف ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں دستورِ اساسی خدا کا بنایا ہوا ہے۔ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں۔ اسلامی دستورِ اساسی (شریعت) غیر متبدل اور ناقابلِ تغیر (Rigid) قانون ہے اور کسی دوسرے دستورِ اساسی سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ کوئی اور دستورِ اساسی جو اگرچہ ظاہری اعتبار سے بے لوچ اور غیر متبدل معلوم ہوتا ہے جیسے امریکہ کا قانونِ اساسی وہ بھی بعض سخت شرائط کے ماتحت تبدیل ہو سکتا ہے

---

[۱] (ہندوستان میں سبھاش چندر بوس سابق صدر کانگریس کی مثال اس کی تصدیق کرتی ہے) پارلیمنٹ کی با اقتدار جماعت وزارت بناتی ہے اور ہر طرح ملک پر مسلط رہتی ہے۔ اگر افراد کی اہم تعداد اس جماعت سے اختلافِ رائے ظاہر کرے تو فوراً وزارت مستعفی ہو جائے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ۳۱ اپریل ۱۹۴۴ء کو مخالف جماعت کی طرف سے ایک ترمیم پیش ہو جانے پر مسٹر چرچل نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر حکومت کی تجویز من و عن نہ منظور کی گئی تو وزارت اپنی خدمات واپس لے لے گی۔ گویا اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے حکومت کرے اور اقلیت زبانی جمع خرچ کے علاوہ اگر کسی معقول بات پر اصرار کرے یہاں تک کہ اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے تو یہ وزارت پر بے اعتمادی کا اعلان سمجھا جائے گا۔ اسلامی حکومت کے اندر اسی لئے اس طرح کی منظم جماعتوں کا التزام نہیں ہے۔ بلکہ ہر مسئلہ پر ہر شخص کو آزاد رائے دینے کا پورا حق حاصل ہے۔

اور ہوا ہے مگر اسلامی دستور اساسی اپنی جگہ پر چٹان کی طرح جوں کا توں قائم ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ شریعت ہمیشہ کسی نہ کسی پیغمبر پر نازل ہوئی اور اب ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین اور لا نبی بعدی کے بعد اسلامی شریعت میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے فرمانِ ربانی الکملت لکم دینکم کے بعد اب کسی تبدیلی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ اور ان الحکم الا للہ (یوسف) "حکم خدا کے سوا کسی کا حق نہیں" کے بعد انسان کو اس معاملہ میں دم مارنے کا بھی موقع نہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے "اسلام کا اقتصادی نظام" میں اس اجمال کی تشریح اس طرح بیان فرمائی ہے۔

"اسلام نے جب حریتِ اسلامی کا علم بلند کیا تو سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اس کے اجتماعی نظام میں حکومت، کارفرمائی اور وضع قانون اساسی کا معاملہ دنیا کے کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ حکم صرف خدا کا ہے اور حکمرانی صرف ذاتِ واحد کی ہے۔ وہی واضع قوانین ہے اور اسی کی کارفرمائی سب پر حاوی ہے۔

ملک الناس الٰہ الناس (الناس) وہ (خدا) انسانوں کا بادشاہ (بھی) انسانوں کا خدا ہے۔

الا لہ الحکم (انعام) خبردار ہو حکم "اسی خدا" کا ہے۔

لیکن اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ خدائے بزرگ و برتر نے انسانوں کو مجبور و معذور کر دیا چونکہ انسانی زندگی کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس لئے اس کے لئے کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جس میں لچک نہ ہو۔ اور اسلام دینِ فطرت ہے اسی لئے اس کے قانون میں معنیٰ کے اعتبار سے اس قدر لچک ہے کہ اس میں انسانی زندگی بالکل سموئی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قیاس کو مشروع کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کی ذات بابرکات نے قضا کے اصول وآئین پر جو فرمان تحریر فرمایا تھا اس میں وضع قانون کے متعلق فرمایا ہے "جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن اور حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو۔ اس پر بار بار غور کرو، اس کی مثالوں اور نظیروں کو پہچان کر ان پر قیاس کرو۔

کنز العمال میں قضاۃ کو ہدایات کے تحت مذکور ہے کہ حضرت فاروق کا ارشاد تھا "مقدمات میں اول قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو، اگر قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث کی طرف رجوع کرو اگر حدیث میں مذکور نہ ہو تو اجماع سے ورنہ اجتہاد سے کام لو۔

آنحضرتؐ نے ان افعال واقوال کے بارے میں جن کا منصب رسالت سے تعلق نہیں ارشاد فرمایا ہے کہ "میں آدمی ہوں اس لئے جب دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اس کو لو، اور اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بھی ایک انسان ہوں (الفاروق ص ۱۹۰)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لشکر کشی وغیرہ کے احکام کو اسی قسم کی رائے پر محمول کیا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی قانون اس زمانہ کے لئے مفید تھا اور اب دنیا اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ اسلام کے قدیم قوانین موجودہ ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک سطحی بات ہے کیونکہ اسلام کے قوانین فطری احکام ہیں اور فطرت تا قیامت ایک ہی حالت پر رہے گی۔ انسان فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور وہ زیادہ دنوں تک اپنی فطرت کو نہیں جھٹلا سکتا۔

حکومت کی شعبہ وار تقسیم | عام طور پر حکومت کی تقسیم تین حصوں میں کی جاتی ہے۔

قانون ساز	1, Legislative
انتظامی	2, Executive
عدالتی	3, Judicial

لیکن یہ تقسیم موجودہ زمانہ کے پیچیدہ نظام کے پیش نظر ضرورت سے زیادہ نہیں ہے۔ ارسطو نے حسب ذیل تفریق قائم کی تھی۔

بحث یا مشورہ سے متعلق	1, Deliberative
حاکمانہ	2, Magisterial
عدالتی	3, Judicial.

اگرچہ یونان کی سابق حکومتوں کے اندر ایک ہی شخص ان تینوں قوتوں کا مالک ہوتا تھا اور ارسطو کا نظریہ

صرف ایک نظریہ تھا جس پر عملدرآمد بالکل نہیں ہوتا تھا۔

(Palybus.) فبلوبیس اور (Cicero) سسرونے تعادل و توازن قوت پر بہت زور دیا ہے ان کا خیال تھا کہ ایک قوت دوسری قوت کے اس طرح ماتحت رہے کہ کوئی قوت اپنی حد سے متجاوز ہو کر کام نہ کرسکے۔

موجودہ دور سیاست کا آدم بوڈان ہے اس نے انتظامی اور عدالتی قوتوں کی تفریق پر زور دیا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ صاحب حکومت (اس نے لفظ پرنس Prince استعمال کیا ہے) کو خود عدالتی قوت ہاتھ میں نہیں لینی چاہے اور عدالتی اختیارات ایک آزاد کمیٹی کو دیدیئے جائیں اور تفریق اختیارات ہی انصاف کا واحد ذریعہ ہے فرانسیسی مصنف (Montesquieu) مانٹسکیو نے اپنی کتاب (Esprit des Lois) میں جو ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی۔ تفریق اختیارات کے مسئلہ کو اپنا لیا۔ مانٹسکیو آزادی کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور آزادی کو انسان کا سب سے بڑا جوہر تصور کرتا تھا۔ اسی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے تفریق اختیارات کا نظریہ پیش کیا۔ مانٹسکیو کا نظریہ حسب ذیل ہے۔

"جب قانون ساز اور انتظامی اختیارات ایک ہی فرد یا جماعت میں متحد ہوجائیں تو اس حالت میں کسی قسم کی آزادی نہیں رہتی . . . . . اگر قوت فیصلہ اختیارات قانون سازی کے ساتھ مشترک ہوجائے تو رعایا کی زندگی اور آزادی بے باکانہ اور ظالمانہ حکومت کا نشانہ بن جائے گی . . . . . اگر وہ انتظامی اختیارات کے ساتھ مشترک ہوجائے تو منصف ایک جابر کی طرح برتاؤ کرسکتا ہے۔"

اس نظریہ نے امریکہ کے دستور اساسی اور انقلابی فرانس کو بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ مانٹسکیو کا یہ خیال کہ انگلستان کے قانون کا جوہر اور اس کی بقا کا سبب تفریق اختیارات ہے صحیح نہیں تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں انگلستان کی حکومت میں تفریق اختیارات نہیں پائی جاتی اور مانٹسکیو نے انگلستان کی حکومت پر غلط تنقید کی اور یہی غلطی انگلستان کے ماہر قانون (Black Stone) بلیک اسٹون سے ہوئی۔ ان دونوں نے انگلستان کے صرف قانون پر نظر کی اور حکومت کے

عمل کو یکسر نظر انداز کردیا۔ حالانکہ یہ ایک فاش غلطی تھی۔

اس نظریہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عدالتی اختیارات کو دیگر اختیارات سے علیحدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ قانون ساز اور انتظامی حکام کو قانون و انصاف میں دخل اندازی سے روکتا ہے (Esmein) کے قول کے مطابق یہ ہر اختیار کے سر اپنی تشریح کرنے کی ذمہ داری عاید کرتا ہے۔

(Bodin) بوڈان پہلا شخص ہے جس نے تفریقِ اختیارات کے مسئلہ کو سوچا اور سمجھا۔ بوڈان کی پیدائش ۱۵۳۰ء میں ہوئی۔ اور اس کے بعد جیسا کہ اوپر لکھ چکے ہیں، مانٹسکیو نے اس پر قلم اٹھایا لیکن یہ مسئلہ اس دور میں نظریہ سے آگے نہیں بڑھا لیکن ہم کو تعجب ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ۶۳۴ء میں حضرت عمر فاروق خلیفہ مقرر ہوئے اور جب ہم اس خلیفہ کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو تاریخ میں یہ الفاظ بھی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ صیغۂ عدالت کے زیرِ عنوان الفاروق میں مذکور ہے۔

"یہ صیغہ بھی اسلام میں حضرت عمرؓ کی بدولت وجود میں آیا۔ ترقی تمدن کا پہلا دیباچہ یہ ہے کہ صیغۂ عدالت، انتظامی صیغہ سے علیحدہ قائم کیا جائے دنیا میں جہاں جہاں حکومت و سلطنت کے سلسلے قائم ہوئے، مدتوں کے بعد ان دونوں صیغوں میں تفریق ہوئی لیکن حضرت عمرؓ نے خلافت کے چند ہی روز بعد اس صیغہ کو الگ کردیا۔"

"شروع میں بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے کچھ دنوں تک انتظامی اور عدالتی صیغے ایک رہے لیکن جب پورا نظام قائم ہوگیا تو قضا کا محکمہ مستقل کردیا۔"[1]

ان سطور کی روشنی میں کسی دعوے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ متعصب نگاہوں کے علاوہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی سیاست ابتدا ہی سے کتنی اونچی تھی اور سیاست کے میدان میں جو کارہائے نمایاں مسلمانوں نے کئے وہ کسی قوم سے نہ ہوسکے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز (H. G. Wells) جیسے پروپیگنڈا کرنے والے مورخ اپنے دل خراش فقروں اور غلط بیانیوں سے مسلمانوں کو سیاست کے بارے میں

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ شاہ معین الدین احمد۔

مفلس قرار دے سکتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں :-

"اہلِ عرب خفیف سی سیاسی صلاحیت رکھتے تھے اور انھیں سیاسی تجربہ بالکل نہیں تھا۔"[1]

مگر صداقت کے دلدادہ "ہر چمکتی ہوئی شے سونا نہیں ہوتی" کہہ کر ان کتابوں کو طاقِ نسیاں میں اٹھا کر رکھ دیتے ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ جنگل کے قانون سے اسلام کی زرین روایات کو مٹانے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ (Encyclopaedia Britannica.) والوں نے تو سرے سے مشرقی اقوام کو ہی سیاست سے بے بہرہ سمجھ لیا اور وہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ کتاب مذکورہ کی گیارہویں جلد میں اقسام حکومت کے زیر تحت مذکور ہے۔

"اقسام حکومت کا سوال صرف یورپی اقوام سے متعلق ہے۔ شہنشاہیت اشرافیہ اور جمہوریہ کے محاسن و معائب یورپ کی تاریخی حکومتوں کے مظاہرِ محاسن و معائب ہیں۔ سیاسی تاریخ لکھنے والوں کی زبان کی عمومیت ہمیں اس امر سے اندھا نہ کردے کہ وہ مقابلتہً انسانوں کے ایک قلیل گروہ کے متعلق خیال کر رہے ہیں۔"

سبحان اللہ کیا یاوہ گوئی ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اسی کو کہتے ہیں۔ گویا مشرقی اقوام میں اس قسم کی حکومتیں نہ قائم ہوئیں اور نہ مشرق نے ان حکومتوں کے نظریوں میں معاونت کی۔ حضرات بھول جاتے ہیں کہ مشرقی لوگ زیادہ عملی تھے ان میں یہ مباحث کم ہوتے تھے کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا۔ وہ انڈا اور مرغی سے برابر استفادہ کرتے تھے۔ لیکن ہاں مثل مشہور ہے کہ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ آج یہ لوگ برسرِ اقتدار ہیں جو چاہیں کہیں۔ لیکن لنکن کے الفاظ میں "وہ تمام آدمیوں کو ہمیشہ کیلئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

مسلمانوں کے سیاسی خزانے خطبات اور احکامات کے اندر دفن ہیں۔ یہ لوگ سیاست کو ایک جزوِ زندگی خیال کرتے تھے اور اس لئے اس کو زندگی سے علیحدہ کوئی اور چیز نہیں سمجھتے تھے دوسرے

---

[1] A Short History of the world. P. 164.

اس زمانہ میں مضامین کی یہ پیمائی تقسیمیں بھی نہیں تھیں۔ پس متلاشیٔ حق کو ڈھونڈھنے سے سب کچھ مل سکتا ہے۔ اور حق پر پردہ ڈالنے والوں کو کچھ بھی نہیں دکھائی دے سکتا۔ مثال کے لئے مسئلہ قضا کو لیجئے یورپی تاریخ "رومن امپائر کے دوازدہ گانہ قواعد جو رومیوں کے بڑے مفاخر خیال کئے جاتے ہیں" پیش کرے گی۔ مگر اسلامی تاریخ اس سے زیادہ شاندار احکامات پیش کرتی ہے اور وہ حضرت عمر فاروق رضؓ کا قضا کے اصول و آئین پر ایک فرمان ہے جو آپ نے حضرت ابو موسی اشعریؓ گورنر کوفہ کے نام لکھا تھا موجودہ زمانہ میں چونکہ حکومت کی باگ ڈور مغربی اقوام کے ہاتھ میں ہے اور مشرقی اقوام پر ایک سکر چھایا ہوا ہے۔ اس لئے مشرق کے بیش بہا خزانے دنیا کے سامنے اس صورت سے نہیں آئے۔ لیکن حق کی جستجو کرنے والوں کے لئے یہ بے بہا موتی ہر وقت چشم براہ ہیں۔

اگرچہ تفریق اختیارات کے مسئلہ کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس پر عمل پیرا ہونے میں آج جو دقتیں پیش آرہی ہیں اس کے پیشِ نظر اس نظریہ کی اہمیت بہت زیادہ باقی نہیں رہتی۔ ۔ ۔ حکومتِ امریکہ جس کا قانونِ ریاستی سب سے زیادہ اس مسئلہ پر زور دیتا ہے وہ بھی پوری طرح اس مسئلہ پر کاربند نہیں ہو سکی۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں تفریقِ اختیارات اتنی ضروری نہیں جتنی اختیارات کی ربط دہی اور گرہ بندی ضروری ہے۔ ہر حصہ کو اپنے تئیں پبلک کا ملازم سمجھنا چاہیئے اور اس کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ انتظام و انصرام امور میں مدد کرے۔ چنانچہ ایچ جے لاسکی رقمطراز ہیں:۔

"قانون ساز مجلسیں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتیں۔ جب تک کہ وہ قانون کے نفاذ میں دخل اندازی کرنے کے نیز بوقت ضرورت ججوں کے فیصلوں کو جو عام طور پر ناقابلِ اطمینان سمجھے جائیں ایکٹ کے ذریعہ مسترد کر دینے کے قابل نہ ہوں"

لاسکی کے نقطۂ نظر سے قطع نظر یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ تفریقِ اختیارات جہاں کارکردگی و تاثیر بخشی کی حامل ہے وہاں بعض اوقات شبہات اور اندرونی اختلافات کا بھی باعث بنتی ہے۔ ہر اختیار زیادہ سے زیادہ اپنی طاقت کو استعمال کرنے کا خواہشمند اور دوسروں کو اس کے استعمال سے

علیحدہ رکھنا چاہتا ہے۔ فائنر (Finer.) کا قول ہے کہ تفریقِ اختیارات کا نظریہ حکومت کو غفلت اور بےچینی کے متضاد حالات میں پھنسا دیتا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ انتظامی اور عدالتی اختیارات کا علیحدہ ہونا انصاف کے لئے ضروری ہے۔

(۱) (Legislature.) قانون ساز

جمہوری طرز کی حکومتوں کو اسمبلی، پارلیمنٹ وغیرہ بہ الفاظِ دیگر مجلسِ قانون ساز پر بہت ناز ہوتا ہے۔ لیکن یہ قانون ساز مجلسیں بہت زیادہ عمر نہیں رکھتیں (Jenks) جینکس کے قول کے مطابق اگلے زمانہ میں قانون بنائے نہیں جاتے تھے بلکہ منکشف کئے جاتے تھے۔ جب اول اول پارلیمنٹ کا آغاز ہوا تو اس کا مقصد قانون بنانا نہیں تھا بلکہ روپیہ مہیا کرنا اور روپیہ کی منظوری دینا تھا۔ مگر اب قانون ساز مجلسیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگا کہ جمہوری حکومت میں صرف قانون ساز مجلسیں ہی قانون کا منبع ہیں۔ پروفیسر ہالینڈ (Halland) نے پانچ حسب ذیل ذرائع اور گنوائے ہیں۔

(۱) Custom or Usage رسم ورواج یا دستور

(۲) Religion مذہب

(۳) Judicial decision عدالتی فیصلے و تجاویز

(۴) Scientific Commentaries سائنس کی تفسیرات

(۵) Equity اصول معدلت (جن سے قانون کی کوتاہی کی اصلاح کی جاتی ہے اور جو عام رواج اور قانون نافذالوقت پر مرجح سمجھا جاتا ہے)

لیکن سب سے زیادہ اہم ذریعہ قانون ساز مجلسیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی انتظامی حصہ قانون سازی سے بالکل دست بردار نہیں ہوگیا۔ امریکہ میں صدرِ جمہوریہ کو بعض اختیارات ہیں جن کو وہ قانون ساز مجلس (Senate) کے ⅔ ممبران کی منظوری کے تحت استعمال کرتا ہے۔ برطانیہ میں پارلیمنٹ صرف قانون کا خاکہ تیار کرتی ہے۔ ان خاکوں کی تفصیلات انتظامی حصہ کے مختلف

محکمے اپنے احکامات سے بناتے ہیں جن میں سے بعض تفصیلات وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہو
ہیں اور جن کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہوتی ہے۔

سوئزرلینڈ میں قانون بنانے کے لئے براہِ راست جمہوریت کے بھی حسب ذیل باقیات
پائی جاتی ہیں۔

(۱) استشارۂ جمہور۔ (کسی خاص مسئلے میں کل رائے دہندوں سے بلا واسطہ فیصلہ چاہنا)۔
(Referendum) عام طور سے اس سے یہ مراد ہے کہ کوئی قانون جو قانون ساز اسمبلی
پاس کردے اس وقت تک مکمل و باضابطہ نہیں سمجھا جاسکتا جب تک
کہ ایک مقررہ تعداد جمہور کی اس کے موافق رائے نہ دیدے۔

(۲) Initiative) شہریوں کا حق قانون سازی (جو مجلس وضع قوانین کے سو
دوسرے شہریوں کو حاصل ہوتا ہے)۔

استشارۂ جمہور حق رد ہے کہ قانون پاس ہو یا نہ ہو لیکن شہریوں کا حق قانون سازی
انھیں خود قانون کے تجویز کرنے کا حق دیتا ہے۔

(۳) (The Plebiscite. رائے عامہ (کسی اہم جمہوری معاملے میں رائے
دہندگان کا بلا توسط نمائندہ رائے دینا) عموماً اس حق کا استعمال کسی ملک کے حصہ کے تبادلے کے
موقع پر کیا جاتا ہے۔ بسنہ ۱۹۳۵ء میں سار کا علاقہ (Saarreigm) جرمنی کو رائے عامہ کی بدولت ملا
صوبہ برار نظام کو اسی کی وجہ سے دیا گیا۔

یہ حق یورپ میں اٹھارویں صدی سے جاری ہے اور مشرق میں بھی بوقت ضرورت اس سے
کام لیا گیا ہے۔

ہر مملکت میں قانون ساز مجلسیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور ان کی تفصیلات میں پڑنا ان صفحات
کا مطلب نہیں۔ یہاں اتنی بات جان لینی ضروری ہے کہ قانون ساز مجلسیں پارٹی بندی پر قائم ہوتی
ہیں اور جس پارٹی کو اکثریت حاصل ہوتی ہے وہی وزارت بناتی ہے اور اسی کا ملک پر تسلط ہوتا ہے

اگر تمام دنیا کی جمہوری حکومتوں کے آئین وطرزِ حکومت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان حکومتوں کا مقصد صرف اکثریت کے حقوق کی نگرانی کرنا ہے اور اس اکثریت میں بھی اکثر محض بھیڑ بکریوں کی طرح بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے بے سوچے سمجھے چلتے ہیں۔ اور یہی حال نمایندگی کا ہے۔ نمائندہ منتخب کرنے والوں کی نفسیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روزروشن کی طرح عیاں ہوجائے گی کہ یہ نمایندگی ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔

اسلامی حکومت موجودہ زمانہ کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ اس کا نظام اس معنی میں جمہوری نظام ہے کہ شریعت نے امت (Publnlm.) کو پوری پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنی رائے دے سکیں، خلیفہ کو منتخب اور معزول کر سکیں اور انصاف کے خلاف کسی حاکم کو قدم نہ اٹھانے دیں، حضرت عمرؓ ایسے بارعب خلیفۂ اسلام کے روبرو ایک معمولی حیثیت کے مسلمان تک کو یہ کہنے کی جرأت تھی کہ اگر آپ ذرا راہِ حق سے پھرے تو ہم آپ کو چرخہ کے تکلہ کی طرح سیدھا کردیں گے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں رقمطراز ہیں۔

"اور جس طرح "امت مسلمہ" پر لزوم جماعت اور اطاعتِ امیر کو ضروری قرار دیا اسی طرح امیر (خلیفہ) پر یہ واجب کیا کہ وہ مہماتِ امور میں اہلِ حل وعقد سے مشورہ کرے اور حسب اقتضاءِ معاملات جمہور سے مشورہ کرنا اپنے اہم فرائض میں سمجھے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے۔"

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ۔ (آل عمران)	اور ان (صحابہؓ) سے مشورہ کرو اور جب کسی بات پر تمہارا عزم قائم ہوجائے تو صرف اللہ پر بھروسہ رکھو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "عزم" سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "امیر کا اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر اس مشورہ پر کاربند ہونا لیا ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم۔	اور ان کے (مسلمانوں کے) معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

لاخلافۃ الا عن مشورۃ — خلافت بغیر مشورہ کے خلافت نہیں ہے۔

تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ اسلامی حکومت میں خلیفہ اور ایک معمولی انسان میں کوئی فرق نہ تھا اور انصاف کی نگاہ میں دونوں شہری بالکل برابر تھے۔ دوسرے یہ کہ ہر قدم پر معاملات مجلس شوریٰ کی رائے سے طے پاتے تھے۔ اگر ہم اسلامی حکومت کی ترکیب اور ساخت پر نظر کریں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کو جمہوریت سے تعبیر کرنا ایک حد تک بجا ہے۔

مولانا شبلی مرحوم الفاروق میں فرماتے ہیں۔

"جمہوری اور شخصی حکومت میں جو چیز سب سے بڑھکر مابہ الامتیاز ہے وہ عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے۔ یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا زیادہ حق حاصل ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ یہاں تک کہ سلطنت جمہوری کی اخیر حد یہ ہے کہ مسند نشین حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائیں اور وہ جماعت کا رکن اور صرف ایک ممبر رہ جائے۔ برخلاف اس کے شخصی سلطنت میں تمام دار و مدار صرف ایک شخص پر ہوتا ہے۔"

حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبہ کے مشہور الفاظ ہیں۔

انا بشر ولست بخیر من احدکم	میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں اور تم میں سے
فراعونی فاذا رأیتمونی استقمت	ایک معمولی فرد سے بھی بہتر نہیں ہوں۔ پس تم میری
فاتبعونی واذا رأیتمونی زغت	نگہبانی کرو، پس اگر میں راستی اختیار کروں تو میری
فقومونی۔	پیروی کرو۔ اور اگر مجھے کجرو پاؤ تو سیدھا کر دو۔

ان الفاظ کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں شوریٰ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور خلیفہ کا مرتبہ ایک شہری سے زیادہ نہیں۔ لیکن مسلمانوں کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا نظام جمہوریت مکمل ہے۔ اگرچہ نظریات کے اعتبار سے اسلامی قانون بالکل مکمل ہے۔

لیکن عملاً موقع اور محل کے اعتبار سے جزئی تنقیحات اور تشقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

(۲) .. انتظامی (Executive) - انتظامی محکمہ اور انتظامی عمال کی حیثیت حکومت میں بڑی نمایاں ہے۔ غیر جمہوری حکومتوں میں تو انتظامی عمال جو بادشاہ، شاہنشاہ۔ یا ڈکٹیٹر کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہیں۔ لیکن جمہوری حکومت میں بھی حکومت کا یہ حصہ اس سے کہیں زیادہ کام انجام دیتا ہے۔ جتنا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اس صورت سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عموماً لوگ غلطی سے اسی کو حکومت کہتے اور سمجھتے ہیں۔ فائنر (Finer) کے قول کے مطابق۔ انتظامی محکمہ حکومت میں مابقی ترکہ پانے والا (Residnary Legatie) ہے دوسرے دعوے دار مثل شوریٰ اور عدالتوں کے حصہ کے مابعد۔

موجودہ حکومتوں میں نام کے منتظم اور دکھاوٹے کے حاکم بھی برسر اقتدار ہیں اور ان کو حقیقی منتظم اور حکام سے علیحدہ پہچاننا ضروری ہے۔ مثال کے لئے انگلستان میں بادشاہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ اور اصلی قوت واختیارات وزیر اعظم اور اس کی وزارت کے ہیں اور یہی دراصل حکومت کے حاکم اور انتظامی محکمہ کے منتظم ہیں

فرانس کے صدر جمہوریہ کو نہ اختیارات حاصل ہیں اور نہ شاہی شان وشوکت صدر جمہوریہ امریکہ کو اگرچہ شاہی شان وشوکت حاصل نہیں مگر اس کو اختیارات حاصل ہیں۔ وہ حقیقی معنی میں حاکم ہے۔ جہاں جہاں یہ نمائشی حکمراں فرماں روا ہیں۔ ان کی حکمرانی دکھاوٹی ہے اگرچہ تمام حکومت ان کے نام سے چلتی ہے اور تمام احکامات ان کے دستخط سے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کسی حکم پر وزیر کے دستخط نہیں تو وہ حکم محض بے کار ہے۔ اسی طرح وائیمر قانون کی روسے جرمنی کا صدر بھی محض نام کا صدر تھا اور اس کو حقیقی اختیارات سے دور کا بھی سروکار نہ تھا۔

شوریٰ کا کام قانون بنانا اور انتظامی محکمہ کا کام اس قانون کا نفاذ اور قانون کی تکمیل ہے شوریٰ قانون بنا کر الگ ہو جاتی ہے اور تمام انتظام اسی محکمہ کو کرنے پڑتے ہیں اور اسی لئے یہ "حکومت" کہلائی جاتی ہے۔

اسلامی حاکم نہ انگلستان کی طرح ہے نہ فرانس کی طرح، نہ امریکہ کا صدر ہے، اور نہ سوئزرلینڈ کی کونسل ہے۔ بلکہ وہ خدا کا خلیفہ ہے۔ اور اس کا کام "نیابت الٰہی" اور "خدمتِ خلق" ہے۔

حضرت آدمؑ کے لئے فرمانِ خداوندی ہے۔

انی جاعل فی الارض خلیفہ (بقرہ) میں اپنا زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

اور حضرت داؤدؑ کے لئے ارشاد ربانی ہے۔

یٰداؤدانا جعلناک خلیفۃ فی الارض (ص) اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے

نہ وہ کسی پارٹی کا آدمی ہوتا ہے نہ اس پر کوئی پارٹی حاکم ہوتی ہے، نہ پارٹی کی خاطر سیاست چلاتا ہے بلکہ جمہور کا منتخب کردہ ایک ملازم ہوتا ہے جو خدا کے حکم

"امر بالمعروف ونہی عن المنکر"

پر عمل کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جمہور، وہی جمہور جس نے اسکو چنا ہے۔ اس پر عمل کرتی ہے اگر نہیں کرتی تو وہ ان کو سزائیں دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ جمہور اس کے حکم سے سرتابی کرتی ہے بلکہ اس لئے کہ مجرم خدا کے حکم سے سرتابی کرتا ہے اور خدا کی بتائی ہوئی حد اس پر عائد کرتا ہے۔ اس طرح پر خلیفہ راہ حق کا راہنما بھی ہے اور خدمتِ خلق کا خادم بھی۔ وہ نیابت الٰہی کے منصب سے اگرچہ تمام افراد امت کا والی ہے لیکن اس کے عزل و نصب میں افرادِ امت دخیل و سہیم ہیں اور وہ مہماتِ امور میں "شوریٰ" کا پابند ہے اور اہل الرائے کی مشاورت ہی اس کا عزم ہے [1]

حضرت عمرؓ کے اس خط سے جو آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھا تھا خلیفہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"بلاشبہ رعایا کے اعمال اسی وقت تک "خلیفہ" کی طرف رجوع رہیں گے جب تک امیر خدا کی طرف رجوع رہے گا اور نیابت الٰہی کی ذمہ داری کو ادا کرتا رہے گا"

اولی الامر منکم کی کس قدر واضح تشریح ہے۔

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام از مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی ص ۸۴۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں سے اگر کوئی شخص لوگوں کے معاملات کا والی بنا اور اپنے ان کے معاملات کی اس طرح حفاظت نہ کی جس طرح اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے تو جنت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔

(۲) Judicial عدالتی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ملک کی مجلس آئین ساز اور محکمہ انتظامی بہت عمدہ ہو لیکن وہاں ایک آزاد اور غیر جانبدار عدالت نہیں تو اس ملک میں انصاف کی کوئی توقع نہیں۔ اسلام جس کی تمام تر بنیاد انصاف و مساوات ہے۔ اس کے نزدیک کوئی سلطنت وحکومت قیام کے قابل نہیں جب تک وہاں مساوات وانصاف کا پورا پورا انتظام نہ ہو۔ اسلامی مساوات کے نمونہ تاریخ اسلام میں اس کثرت سے ملتے ہیں کہ دنیا کی تمام تاریخیں مل کر بھی اس سے آدھے واقعات نہیں پیش کر سکتیں۔

غزوۂ بدر میں رحمۃ اللعالمین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تیر سے مجاہدین کی صفیں ٹھیک کر رہے ہیں۔ سواد بن غزیہ صف سے الگ ہیں۔ رحمت اللعالمین چوکا دیکر ان سے صف میں برابر کھڑے ہونے کو فرماتے ہیں۔

فقال یارسول اللہ اوجعتنی وقد	سواد نے کہا یا رسول اللہ آپ نے مجھکو تکلیف دی حالانکہ
بعثك اللہ بالحق والعدل فاقدنی	اللہ نے آپ کو حق وانصاف کے لئے مبعوث کیا ہے پس
فکشف رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آپ اجازت دیجئے کہ میں آپ سے بدلہ لوں رسول اللہ
وسلم عن بطنہ فقال استقد	صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اپنا بطن مبارک کھولدیا اور
قال فاعتنقہ فقبل بطنہ	فرمایا سواد! اپنا بدلہ ضرور لو، سواد فوراً آپ کے گلے سے
لہ	لپٹ گئے اور بطن مبارک چوم لیا۔

دونوں جہان کے سردار کی، انصاف پسندی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ جس نے حیوانوں کو انسان بنایا۔ جس نے عرب کی قوم کو تمام عالم میں ممتاز بنایا اس قوم کا ایک معمولی فرد

لہ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۷۱۔

اسی آقا سے اس طرح گفتگو کرتا ہے کہ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ہم کو وہ گفتگو ناگوار ہوتی ہے مگر آپ کی شانِ انصاف کہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی فرد کسی چیز کو ظلم خیال کرتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس عنوان کے تحت آسکتی ہے تو اس کو طلب کرنے اور انصاف چاہنے کا حق حاصل ہے۔
دنیا کی تاریخ اس قسم کا ایک واقعہ بھی نہیں پیش کر سکتی کہ کسی بااختیار انسان سے کسی معمولی فرد کو انصاف چاہنے کا حق اپنے مقابلہ میں دیا ہو، تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی تاریخ میں اس قسم کا ایک نہیں سینکڑوں واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اسلام کے اندر راعی اور رعیت کے اندر بالکل مساوات رہتی ہے اور یہی انصاف کی بنیاد ہے۔ عدالت کے متعلق حضرت عمرؓ نے جو فرمان جاری کیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

> "خدا کی تعریف کے بعد قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں اپنے مجلس میں، اپنے انصاف میں برابر رکھو۔ تاکہ کمزور، انصاف سے مایوس نہ ہو اور زورآور کو تمہاری رورعایت کی امید نہ پیدا ہو، جو شخص دعوے کرے اس پر بار ثبوت ہے اور جو شخص منکر ہو اس پر قسم ہے، بشرطیکہ اس سے حرام، حلال، اور حلال، حرام نہ ہونے پائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کے بعد اس سے رجوع کر سکتے ہو، جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر خیال کرو پھر قیاس لگاؤ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک میعاد مقرر کرو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ، ورنہ مقدمہ خارج۔ مسلمان سب ثقہ ہیں باستثنائے ان اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں درے لگائے گئے ہوں یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہو، یا ولا اور وراثت میں مشکوک ہوں"۔ [1]

اگر آج کل کی عدالتوں پر بحث کی جائے تو اس میں ملکی انتظامی واقعات کا ذکر ناگزیر ہوگا اس لئے وقت کے فرمان کے آگے سر جھکانا مناسب ہے۔ واقعاتِ عالم نظروں کے سامنے ہیں۔

---

[1] الفاروق ص ۴۹ و ۵۰۔

ہر شخص خود انصاف کر سکتا ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ مختلف ممالک میں جو گورکھ دھندے عدالتی صیغے کے بنائے گئے ہیں وہ سب سینما کی نمود کے سوا کچھ نہیں اور کہیں بھی انصاف ہونا ممکن نہیں۔ اس میں امریکہ و فرانس، انگلستان اور ہندوستان کی کوئی تخصیص نہیں۔

این خانہ تمام آفتاب است

جزا اور سزا کے معاملہ کو خدا کے اس حکم پر ختم کیا جاتا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے ایک تحفہ کے طور پر پیش کیا ہے اور جس پر عمل کرنے والا دین اور دنیا کی نعمت کا والی بن جاتا ہے۔

وان عاقبتم فعاقبوا	اور (دیکھو) اگر تم بدلہ لو تو چاہیے کہ جتنی اور
بمثل ما عوقبتم بہ	جیسی کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی اسی کے
ولئن صبرتم لھو	مطابق ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (یہ نہ ہو
خیرا للصّٰبرین۔	کہ زیادتی کر بیٹھو) لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور
(۱۶ - ۱۲۷)	بدلہ نہ لو (یاد رکھو) برداشت کرنے والوں کے لئے) برداشت
(ترجمان القرآن ابو الکلام آزاد)	کر جانے میں بہتری ہے۔

حضرت خنساء

عرب کی بہترین مرثیہ گو شاعرہ

جناب مولوی حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد ایم اے

حضرت خنساء ایامِ جاہلیتِ عرب کی وہ مشہور مرثیہ گو شاعرہ تھیں جنھیں بعض جلیل القدر ادبا نے عہدِ جاہلیت کا بہترین شاعر تسلیم کیا ہے۔ آپ نہ صرف مرثیہ گوئی میں یکتائے روزگار ہیں بلکہ عرب کی دنیائے شاعری میں لاثانی مرتبہ رکھتی ہیں۔ اگر ان کے دونوں بھائی میدانِ جنگ میں مارے نہ جاتے تو انھیں دنیائے شاعری میں لاجواب عروج حاصل نہ ہوتا۔ درحقیقت ان کی شاعری ان کے دونوں بھائیوں کی موت کا ایک المناک مرثیہ ہے جسے وہ تمام عمر الاپتی رہیں۔

ابتدائی حالات خاتون موصوف کی ولادت و وفات میں بہت اختلاف ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش عہدِ اسلام سے پہلے ہوئی تھی۔ تاہم جدید ترین تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ آپ ۵۷۵ء میں پیدا ہوئیں اور ۶۶۵ء مطابق ۴۵ھ میں نوّے سال کی عمر میں حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں فوت ہوئیں۔

ان کا اصلی نام تماضر بنت عمرو بن الحارث تھا۔ ان کا خاندان آل الشرید کہلاتا تھا۔ جو جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں قبیلہ بنو سلیم کی شاخوں میں نہایت ممتاز رہا ہے۔

حضرت خنساء حسن و جمال میں اپنے زمانے کی خواتین سے کسی طرح کمتر نہ تھیں۔ آپ عمر میں اپنے بھائی معاویہ اور صخر دونوں سے چھوٹی تھیں۔ بھائی بہنوں میں اس قدر محبت تھی کہ بھائیوں کے قتل کے بعد بہن نے تمام عمر آہ و بکا کو نہ چھوڑا۔

جب آپ بیس برس کی ہوئیں تو آپ کی لیاقت اور فہم و ذکا کا چرچا سن کر قبیلہ بنو جشم کے

سردار درید بن الصمہ نے جو مشہور شاعر اور زبردست شہسوار تھا۔ نکاح کی درخواست کی۔ خنسار کے والد ماجد نے اپنی صاحبزادی سے اس بارے میں مشورہ لیا لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا اور کہا "میں اپنے چچیرے نوجوان بھائیوں کو چھوڑ کر ایک بڈھے کھوسٹ سے نکاح نہیں کر سکتی" چونکہ عرب میں والدین لڑکیوں کی رضامندی کے بغیر شادی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس بنا پر یہ شادی نہ ہو سکی۔

ازدواجی زندگی سب سے پہلے آپ کی منگنی رواحہ بن عبدالعزیز اسلمی سے ہوئی تھی لیکن نکاح سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کی شادی عبدالعزیٰ سے ۵۹۳ء میں انجام پذیر ہوئی۔ ان سے ایک لڑکا ابو شجرہ عبداللہ پیدا ہوا یہ لڑکا بڑا جنگجو اور بہادر تھا۔ اس نے یوم حوزۃ الثانی میں اپنے ماموں صخر کے ساتھ دشمنوں سے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اور دادِ شجاعت حاصل کی تھی۔

عبدالعزیٰ کے انتقال کے بعد آپ کی دوسری شادی مرداس بن ابی عامر اسلمی سے ہوئی جو آپ ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس رشتۂ مناکحت سے مندرجہ ذیل لڑکے اور لڑکیاں تولد ہوئیں۔

یزید، معاویہ۔ حزن۔ عمرو۔ سراقہ۔ اور عمرۃ۔

اسلامی عہد ۸ھ میں عرب کے قبیلے جوق در جوق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اسلام لانے کے لئے آتے تھے۔ اس سلسلے میں بنو سلیم کا بھی ایک وفد جس میں حضرت خنسار اور ان کا سوتیلا بھائی عباس بن مرداس بھی شامل تھے حاضر ہوا اور سب ارکانِ وفد دائرۂ اسلام میں آ گئے۔

حضرت خنسار کے دو بھائی معاویہ اور صخر اسلام قبول کرنے سے پیشتر عہد جاہلیت کی خانہ جنگیوں میں قتل ہو گئے تھے اس لئے آپ تمام عمر ان کے ماتم میں سوگوار رہیں۔ چونکہ بچپن ہی سے آپ کو اپنے بھائیوں کے ساتھ بیحد محبت تھی اور وہ بھی آپ کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے تھے اس لئے قدرتی طور پر آپ کے قلب پر ان کی موت کا صدمہ اس قدر جاگزیں ہوا کہ تمام عمر آپ کی آنکھیں ان کے غم میں اشکبار رہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود نوحہ وبکا کو نہ چھوڑ سکیں۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں چند لوگوں نے آپ کی شکایت حضرت عمر فاروقؓ سے کی اور حضرت عمرؓ نے انھیں اس قدر چیخنے چلانے اور ماتم کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن آپ نے کلیتہً اشکباری سے رکنے میں اپنی معذرت ظاہر کی تاہم

ماتم اور نوحہ کے دیگر لوازم مثلاً منہ پر تھپیڑ مارنا، سر اور بال نوچنا ترک کر دیئے تھے۔

مجاہدانہ خدمات | عہدِ اسلام میں حضرت خنسار کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ آپ عہدِ اسلام کی اہم ترین جنگ قادسیہ میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوئیں اور اپنے لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ اسلام کی خاطر اسی جنگ میں ایرانیوں کے مقابلے میں شریک ہو کر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ آپ کے چاروں لڑکوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ اس جنگ میں نہایت جوانمردی کے ساتھ لڑے اور شہید ہو گئے۔ جب آپ کو اپنے لڑکوں کی شہادت کی خبر ملی تو بجائے رنجیدہ ہونے کے آپ نہایت خوش ہوئیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے لڑکوں کے ذریعہ سے آخر وقت میں اسلام کی خدمت کر سکیں۔ آپ کے اس جذبۂ اسلامی کی بنا پر عہد اسلامی میں بھی آپ کا رتبہ بلند ہو گیا اور آپ قرنِ اولیٰ کی بہادر صحابیات میں شمار ہوتی تھیں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ بھی آپ کے اس فعل سے بہت خوش ہوئے اور اپنی مدتِ خلافت تک آپ کے چاروں لڑکوں کا وظیفہ جو آٹھ سو درہم ہوتا تھا صرف آپ کی ذات کو دیتے رہے تھے۔

وفات | کثرت نوحہ و بکا اور بڑھاپے سے حضرت خنسار بہت ضعیف ہو گئی تھیں۔ آخر عمر میں آپ لاٹھی کے سہارے چلتی تھیں، سر کے بال تمام گر گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے سر منڈایا ہوا ہے۔ آخر عمر میں آپ نے اپنی لڑکی عمرہ کی شادی کی رسم ادا کی تھی۔ اس خوشی کے بعد آپ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۶۶۴ء مطابق ۴۵ھ میں آپ اس دارِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ آپ کی اولاد آل الشرید کہلاتی تھی اور مشہور اسلامی مورخ ابنِ خلدون ذکر کرتا ہے کہ آل الشرید بعد کے زمانہ میں افریقہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور مورخ مذکور کے زمانے تک ان کی نسل نہایت شان و شوکت سے زندگی بسر کرتی تھی۔

اشعار کی ترتیب | ایامِ جاہلیت میں اشعار کے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ بلکہ ہر قبیلے کے افراد اپنے باکمال شعرا کے اشعار زبانی یاد رکھتے تھے اور انہیں اپنا قومی سرمایہ سمجھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل عہدِ جاہلیت کے اشعار کا کافی ذخیرہ محفوظ ملتا ہے۔ چونکہ حضرت خنسا قبیلۂ بنو سلیم سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے اس قبیلہ نے آپ کے اشعار کو محفوظ رکھا اور یہ سلسلہ روایت در روایت ادبار، شعرار

اور سخن سنجوں کی جماعت میں پھیل گیا۔ اسلامی عہد میں اگرچہ آغاز میں آپ کا دیوان باقاعدہ مرتب نہیں ہوا۔ لیکن عربی ادب کی کتابوں اور اشعار کے مجموعوں میں آپ کے اشعار اور مرثیے بکثرت شامل کیے گئے یہاں تک کہ آٹھویں صدی میں ادبار اور فضلائے ادب نے آپ کی شاعری کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول کی انھوں نے دیوان خنسا کو باقاعدہ مرتب کیا اور باکمال ادیبوں نے اس کی شرحیں لکھنی شروع کیں۔ جس طرح کہ دوسرے شعرا کے دیوانوں کی شرحیں مرتب کی گئی تھیں۔ ان شارحین میں ابن السکیت، ابن الاعرابی اور ثعالبی جیسے مشہور ادبا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خوش قسمتی سے ان ادبا کی شرحیں دیوانِ خنسا کے دو قلمی نسخوں میں دستیاب ہو گئیں اور ان سے بیروت کے مشہور ادیب شیخو لوئیس کو اپنی شرح "انیس الجلسار فی شرح دیوان الخنسار" مرتب کرنے میں بہت مدد ملی۔ انھوں نے شاعرہ موصوفہ کے دیوان کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا اور ۱۸۸۸ء میں سب سے پہلے دنیا کو بے نظیر شاعرہ سے روشناس کرایا۔ بعدازاں مصر میں بھی شاعرہ موصوفہ کا دیوان چھاپا گیا۔

اہلِ یورپ کی قدردانی حیرت ہے کہ مشرق سے زیادہ مغرب نے آپ کی قدر کی اور فرانسیسی زبان میں ڈی کوپیر (Decoppier) نے دیوان کا ترجمہ بیروت میں ۱۸۸۹ء میں شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ دلچسپ اور عمدہ طرز پر تحریر شدہ تھا۔ اس ترجمہ کے علاوہ مستشرقین یورپ نے حضرت خنسار کی شاعری اور سوانح حیات پر کئی دلچسپ کتابیں تحریر کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور تصنیف جی گبریالی (G. Gabrielli) کی ہے جو اطالوی زبان میں بمقام فلورنس ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ روڈوکاکس (N. RhodoKaKis) نے ۱۹۰۴ء میں حضرت خنسار کے متعلق ایک کتاب شائع کی۔

خنسار کی شاعری عربی زبان کا مشہور ادیب مبرد خنسار کے متعلق رقمطراز ہے۔

"سب سے بہتر مرثیہ وہ ہے جس میں مرنے والے پر اظہارِ رنج کے ساتھ ساتھ مدح بھی ہو اور اگر ان اشعار کو فصاحت و بلاغت اور موثر طریقے سے ادا کیا جائے تو ایسا مرثیہ شاعر کا انتہائی کمال ہے اس معیار پر حضرت خنسار کا مرثیہ پوری طرح اترتا ہے:"

حقیقت یہ ہے کہ شاعرہ موصوفہ کے مرثیے دلی رنج والم کے گہرے تاثرات کی صحیح تصاویر اور انسانی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صنفِ نسواں میں قدرت نے یہ ملکہ ودیعت کر رکھا ہے کہ وہ اپنے اندرونی جذبات وخیالات وعواطف کو مؤثر طریقہ سے ادا کر سکیں ان کا شیشۂ دل اس قدر نازک ہوتا ہے کہ ذراسی بات پر اسے ٹھیس لگتی ہے اور ان کے احساسات و جذبات مجروح ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صنفِ لطیف جب شعروادب کے میدان میں آئی ہیں تو نہایت کامیاب ہوئی ہیں، ایسی حالت میں عرب کی یہ خاتون جنھیں ہم قارئینِ کرام سے روشناس کرا رہے ہیں۔ کیسے خاموش رہ سکتی تھی جبکہ عرب کا ذرہ ذرہ شعریت کا مظہر تھا اور ان کے نازک شیشۂ دل پر وہ چوٹ لگی ہو جو بقول اس کے کسی نے نہیں کھائی ہے۔ ان کے دل میں رنج وغم کا ایک طوفان موجزن تھا۔ جو تمام عمر اشکباری پر بھی تھم نہ سکا، اور آخر میں ان کی جان لیکر رخصت ہوا، ان کے اشعار دردناک اور مجروح دل کی ایک فریاد ہے وہ بے شبہ ہماری آنکھوں کے سامنے ان کے بھائیوں کے صفات واخلاق کی مکمل تصویریں پیش کرتے ہیں اسی وجہ سے دوسرے مرثیہ گو شاعروں کے برخلاف ان کے مرثیے تصنع اور تکلف سے پاک ہیں اور اس قدر موثر ہیں کہ جب انسان انھیں اصلی زبان میں پڑھتا ہے تو وہ اس کے دل پر تیر و نشتر کی طرح چبھتے ہیں۔ خنساء عربی زبان کی غالباً سب سے پہلی مرثیہ گو شاعرہ ہیں۔ ان سے پہلے مہلہل شاعر ایسا گذرا ہے جس نے چند مرثیے کہے ہیں۔ لیکن اسے باقاعدہ مرثیہ گو شعرا کی صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے عربی مرثیہ گوئی کے بانی کی حیثیت سے انھوں نے فطری اور پُر اثر شاعری کی بنیاد ڈالی جو آنے والے عربی شعرا کے لئے چراغِ ہدایت ثابت ہوئی۔

ابتدائی عربی شاعری میں بہت مدت تک فطرتی اور جذباتی رنگ جھلکتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عربوں نے یونان اور روما کے فلسفے کو رواج دیا اس وقت انھوں نے یونانی اور لاطینی شاعری کو ہاتھ تک نہیں لگایا کیونکہ عربوں کے پاس ایسا ذخیرۂ ادب موجود تھا جس میں فطرتِ انسانی کی سادہ مگر صحیح طریقے سے ترجمانی کی گئی تھی اور وہ یونانی اور لاطینی شاعری کی صنم پرستی اور خرافات

قصوں سے پاک وصاف تھا۔ خنسار کے بعد عربی زبان وادب اور شاعری میں بہت ترقی ہوئی۔ اور عربی زبان بدوؤں اور صحرانشینوں کی زبان سے ایک مہذب اور شائستہ قوم کی زبان بن گئی تھی۔ مرثیہ گوئی اور دوسری اصناف شاعری میں کافی ترقی ہوئی مگر خنسار کی سادہ اور پردرد شاعری بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی

لیلی الاخیلیہ سے مقابلہ

بعض لوگوں نے جن میں مشہور ادیب اصمعی اور ابوزید بھی شامل ہیں۔ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لیلی الاخیلیہ جو اسلامی عہد کی مشہور شاعرہ خاتون تھیں حضرت خنسار سے جمال شعری، سلامت و روانی اور تخیلات میں بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کا یہ خیال ایک حد تک درست بھی ہے کیونکہ خنسار کے زمانے میں عربی شاعری ابتدائی حالت میں تھی۔ خیالات کی وسعت وفراوانی، سلامت وروانی اس قدر نہ تھی جو اسلامی عہد میں پیدا ہوئی اور اس کے علاوہ وہ زمانہ عہد جاہلیت کا تھا اور ماحول بھی بہت محدود تھا ان حالات میں خنسا کی شاعری میں وہ خصوصیات نہیں پیدا ہوسکتی تھیں جو لیلی الاخیلیہ سے مختص ہیں تاہم حضرت خنسار کی سادہ اور پراثر شاعری کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا۔

نمونہ کلام

قارئین کرام کی معلومات اور تفنن طبع کے لئے ہم حضرت خنسار کے منتخب اشعار کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ خنسار کا سوزوگداز جو اصل زبان میں موجود ہے ترجمہ میں پیدا نہیں ہوسکیگا۔

ا۔ اے میری آنکھو آنسو نہ بہاؤ اور رونا بند نہ کرو تم میرے فیاض بھائی صخر پر کیوں آنسو نہیں بہاتی ہو؟ کیا تم اس بہادر خوبصورت نوجوان سردار کے لئے نہیں روؤگی جو قدآور اور شریف خاندان والا تھا اور نوعمری ہی میں اپنے قبیلہ کا سردار بن گیا تھا۔ جب کوئی قوم بزرگی اور شرافت حاصل کرنے کے لئے مستعد ہوتی تھی تو وہ بہت پہلے اپنا ہاتھ بڑھاتا تھا اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر کمال حاصل کرتا تھا۔ اس کی قوم مصیبت کے وقت اسے بلاتی تھی۔ اگرچہ وہ سب سے نوعمر تھا۔ لیکن شرافت کا سہرا اسی کے سر رہتا تھا وہ بہترین کام یہی سمجھتا تھا کہ قابل فخر کارنامے سرانجام دے۔

۲۔ ایک دفعہ حضرت خنسار نے فاختہ کو چلاتے دیکھا فوراً ان کا غم تازہ ہوگیا اور بیساختہ یہ اشعار زبان پر لائیں

مجھے صخر یاد آیا جب فاختہ ایک درخت پر نالہ وفریاد کررہی تھی اس کی آواز سن کر میں غم کے آنسو

اس کے درمیان قبر کے بڑے بڑے پتھر اور جنگل حائل ہیں۔"

"اے آنکھ تو اس قدر نہ رو کہ آنسو خشک نہ ہو سکیں اور میری یہ آنکھیں اشکوں سے لبریز رہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ زمانے کا تیر خطا نہیں جاتا اور جسے زمانے نے ہلاک کر دیا ہو وہ لوٹ کر نہیں آتا۔"

"اگر صخر جیسا فیاض آدمی قبر میں آسودہ ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ دنیا میں تو نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت کا مالک تھا۔ (کمال حاصل کر گیا)

خزانہ ادب کی روایت ہے کہ مشہور شاعر جریر سے دریافت کیا گیا "سب سے بڑا شاعر کون ہے" اس نے جواب دیا "اگر خنساء نہ ہوتی تو میں ہوں۔" لوگوں نے پوچھا وہ کس بات میں تم سے بڑھی ہوئی ہے اس نے کہا ان اشعار سے جن کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

۳۔ بے شک زمانہ جس کے عجائبات بے انتہا ہیں، ہمارے لئے برائی چھوڑ دیتا ہے اور نالائق اور بیوقوف لوگ تو زندہ رہتے ہیں ہمیں عقلمند لوگوں کی موت کے رنج کا داغ دیا جاتا ہے۔ اس سرزمین میں صرف ان کے سر اور قبریں باقی رہتی ہیں۔ سروں میں سے پرندہ نکل کر ان کے انتقام کے لئے چلاتا رہتا ہے (پرانے عربوں کا عہدِ جاہلیت میں یہ عقیدہ تھا کہ مقتول کے مرنے کے بعد اگر اس کا انتقام نہ لیا جائے تو ایک پرندہ جو غالباً منحوس اُلّو ہوتا ہے، کھوپڑی میں سے نکلتا ہے اور اس کی قوم کو انتقام پر ابھارتا ہے وہ یہ چلاتا ہے "مجھے سیراب کرو۔" اور جب تک مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے وہ چلاتا ہی رہتا ہے۔ یعنی انتقام لینے پر جاہلیت کے عربوں کے عقیدے کے مطابق اسے سیرابی ہوتی ہے اور اس وقت وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

"دن اور رات میں انقلاب ہوتا رہتا ہے لیکن یہ فنا نہیں ہوتے مگر انسان فنا ہو جاتا ہے"

چونکہ ان اشعار میں گہرے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس لئے جریر نے انھیں بہت پسند کیا مندرجہ ذیل اشعار اس کے آخری قصیدے سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے اپنے بڑے بھائی صخر کے مرثیہ کے طور پر تحریر کئے۔

"جب شام ہوتی ہے تو مجھے تمام رات اس کی یاد بیدار رکھتی ہے اور جس وقت صبح ہوتی ہے

اس وقت بھی میں صخر کے ماتم میں مشغول نظر آتی ہوں۔ صخر کون ہے؟ صخر وہ شخص ہے جو میدانِ جنگ اور نیزہ باری کے وقت کام آیا کرتا تھا جو ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی حمایت کیا کرتا تھا۔ وہ زمانے کی مصیبتوں پر غالب رہا کرتا تھا، اور بڑی بڑی گتھیوں کو بلا نزاع سلجھا دیا کرتا تھا۔ رات کے وقت آنے والے مہمان یا پناہ لینے والے مسافر، جن کے خوفزدہ دل ہر گھنٹی کی آواز پر کانپ جایا کرتے تھے، اس کے مہمان ہوتے تھے۔ انھیں یہیں پناہ ملتی تھی۔ وہ ان مہمانوں کی اس قدر خاطر مدارات کرتا تھا کہ وہ اپنی تکلیفیں بھول جاتے تھے اور ہر قسم کے آفات سے محفوظ رہتے تھے۔ کسی جن و بشر پر اس طرح مصیبت کا پہاڑ نہیں ٹوٹا۔"

میں طلوعِ آفتاب و غروبِ آفتاب کے وقت صخر کو یاد کرتی ہوں اگر میرے اردگرد رونے والوں کی کثرت نہ ہوتی تو یقیناً میں خودکشی کرلیتی۔ لیکن میں بہت سی عورتوں کو دیکھ رہی ہوں کہ وہ بھی اپنے منحوس دنوں پر نوحہ خوانی کررہی ہیں۔ ایک عورت کو میں نے کل شام اپنے بھائی پر نوحہ کرتے دیکھا مگر یہ عورتیں میری طرح نہیں روسکتیں (جس نے تمام عمر اشک باری میں ختم کردی ہے) تاہم میں ان کے غم کو دیکھکر دل کو تسلی دے لیتی ہوں۔

"اے بھائی! خدا کی قسم میں تہیں ہرگز نہ بھولوں گی تا آنکہ میری جان جائے اور میری قبر پھٹ جائے۔ ہائے افسوس! کیا میرا بھائی صبح و شام قبر ہی میں لیٹا رہے گا۔"

آخر میں یہ دکھیاری بہن سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتی ہے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے   سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس بدنصیب خاتون نے تمام عمر اپنے بھائی کے فراق میں اشکباری کرکے گذاری۔ مگر رونے سے کیا ہوتا ہے صرف دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے ورنہ بقول عرفی ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

ادبیات

نوائے جبریلؑ

از جناب ماہر القادری

پیغام سُناتے ہیں یہ اب تک لبِ جبریلؑ ہے ذاتِ محمدؐ ہی پہ ہر خیر کی تکمیل

وہ مدرسے بازارِ تجارت ہیں کہ جن میں مذکورِ احادیث نہ قرآن کی ترتیل

بے سوز ہے بے روح ہے یہ گرمیٔ محفل واعظ کے فسانوں میں ہے تخئیل ہی تخئیل

اس دور میں اربابِ تصوف کے اشارے قرآن کا مفہوم بھی کر دیتے ہیں تبدیل

یہ واعظ و صوفی کی حکایات و کنایات یہ حسنِ مراعات[1] ہے وہ صنعتِ تعلیل[2]

الواحِ زبور آج بھی اس غم میں ہیں خاموش باقی نہ رہی عصمتِ اوراقِ اناجیل

مغرب میں عجب چیز ہے تاریخ و روایات تنقید میں بھی لاگ ہے اور جرح نہ تعدیل

اس قوم کے ایمان کا اللہ ہی حافظ! جس قوم میں ہوتی ہو مزارات کی تقبیل

ہے بدر کا میدان مسلمان کی فردوس اتنی بھی بہت کچھ ہے اس اجمال کی تفصیل

یہ خانقہی سلسلۂ رشد و ہدایت کچھ جدتِ تشبیہ ہے کچھ ندرتِ تمثیل

برلن کی ہو تہذیب کہ لندن کا تمدن

یہ فتنۂ نمرود ہے وہ مکرِ عزازیل

---

۱ و ۲ علم معانی و بیان کی مشہور صنعتیں۔

دو منظر

از جناب ماہر القادری

دربارِ کسریٰ:۔

نغمۂ بربط، صدائے چنگ و نے   شیشہ و ساغر، فروغِ موجِ مے

لحظہ لحظہ گردشِ جام و سبو   پے بہ پے رقصِ بتانِ لالہ رُو

پردہ ہائے اطلس و کمخواب و زر   غیرتِ فردوس۔ سقفِ بام و در

عود و گل، فانوس و نقل و انگبیں   جنتِ شداد بر روئے زمیں

ایں طریقِ عیش با جاہ و حشم   عشرتِ جمشید، زندہ در عجم

مزدک و زردشت در فکر و نگاہ   آتشِ سوزندہ، معبود و الٰہ

سطوتِ شاہی بہ ایں جاہ و وقار

آدمی را آدمی پروردگار

بارگاہِ فاروق اعظمؓ:۔

کوزۂ گل، بوریا، نانِ جویں   یک قبا کہنہ، شکستہ آستیں

چوبِ خرما سقف را تمکین داد   سادگی ایں خانہ را تزئین داد

بر درش یک حاجب و دربان نیست   حرفِ او جز آیۂ قرآن نیست

تاجِ دیں بر سر، جہاں زیرِ قدم   فاتحِ روم و فلسطین و عجم

بر زمیں بنشستہ مثلِ دیگراں   جانشینِ اسوۂ پیغمبرانؑ

لرزہ بر اندامِ کفر از نامِ او   سوزِ عشقِ مصطفیٰؐ پیغامِ او

تیرگی را ہمچو صبحِ شرق کرد

درمیانِ حق و باطل فرق کرد

رعنائیاں | از جناب شکیل بدایونی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر
قیمت تین روپے پتہ:۔ کتب خانہ عزیزیہ جامع مسجد دہلی

جناب شکیل بدایونی۔ اردو کے نوجوان مقبول شاعر ہیں۔ نظم اور غزل دونوں پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ ان کا تخیل رنگین اور بیان کا انداز عام طور پر شیریں اور مترنم ہوتا ہے۔ حضرتِ جگر مرادآبادی ایسا شاعر جسے "شاعرِ فطرت" تسلیم کرے اس کو پھر اپنے کمالِ شعرگوئی کے ثبوت کے لئے کسی اور سند کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ زبان کی بعض کمزوریوں اور خامیوں کو خود جگر صاحب نے بھی مانا ہے۔ لیکن ہم کو جگر صاحب کے اس نظریہ سے اتفاق نہیں ہے کہ

"میں زبان کو لباس اور معنویت کو محبوب تصور کرتا ہوں اور میرے نزدیک حسین وہی ہے جو پھٹا پرانا۔ میلا کچیلا لباس پہن کر خود لباس کو بھی حسین بنادے نہ یہ کہ خود محتاج زیبائش وآرائش ہو" (ص ۹)

اس میں شک نہیں کہ خدا جس کو خوبی عطا فرماتا ہے وہ بناؤ سنگار اور زیبائش وآرائش کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن حسن کی فطرت یہ ہے کہ وہ خود جس طرح حسین ہے۔ اسی طرح وہ چاہتی ہے کہ اس کا مظہر یا لباس بھی حسین ہو اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو اگرچہ حسن کا حسن بجائے خود قائم رہتا ہے اور اس کی ذات وصفات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم یہ ضرور ہوتا ہے کہ حسن کی جلوہ فروشی کا وہ عالم باقی نہیں رہتا جو لباس ومظہر کے بھی حسین ہونے کی صورت میں ہو سکتا تھا اس انمل بے جوڑ پیوند کا اثر یہ ہوتا ہے کہ چشمِ مشتاق وتماشابیں کو دیدِ جمال سے وہ سکون واطمینان اور سیر نگاہی و شگفتگی حاصل نہیں ہوتی جو اسے طبعی طور پر حاصل ہونی چاہیے تھی۔ آفتاب کی کرنیں، نجاست د

غلاظت پر پڑتی ہیں تو عفونت کا غبار اڑ کر اُن کے حسنِ تابش کو بھی گرد آلود کر دیتا ہے۔ لیکن جب یہ ہی شعاعیں شبنم کے چمکیلے قطروں پر عکس فگن ہوتی ہیں تو اب ان کے حسن کا عالم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ جگر صاحب غالباً اس نظریہ ہی کے باعث اپنے کلام کو زبان کے اعتبار سے اس مرتبہ تک نہیں پہنچا سکے جو معنوی اعتبار سے اسے حاصل ہے ورنہ اگر جگر کا تخیل، میرؔ و مومنؔ، یا داغؔ و حسرتؔ کی زبان کے قالب میں جلوہ نما ہوتا تو کون بتا سکتا ہے کہ اس شرابِ آتشیں کی تیزی و تندی کا کیا عالم ہوتا۔ ہمارے نزدیک جگر صاحب کا یہ نظریہ نوجوان شاعروں کے لئے سخت ترین غلط فہمی اور گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے اس لئے ہم کو اپنا نقطۂ نظر کسی قدر وضاحت سے ظاہر کرنا پڑا۔ بہر حال شکیل کا کلام ان کے شاعرِ فطرت ہونے کی غمازی کر رہا ہے اور مشق اور مطالعہ اگر جاری رہا تو بے شبہ ایک دن وہ مسلّم اساتذۂ سخن میں ہوں گے۔ اس مجموعہ میں حمد و نعت، غزلیات، قطعات اور نظمیں غرض یہ کہ سب کچھ ہیں۔ بعض بعض اشعار تو اس درجہ البیلے اور بانکے ہیں کہ داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے مثلاً

بزمِ کون و مکاں ترے صدقے — خلوتِ حسنِ شش جہت کی قسم
دل کی بیتابیاں ترے صدقے — ہے قیامت کا انتظار ہنوز

بجھتی ہے شمع گھر میں اندھیرا کئے بغیر — جاتے ہیں دل میں چھوڑ کے وہ جلوۂ خیال
مجھ تک وہ آ گئے ہیں ارادہ کئے بغیر — اکثر تو دل گرفتگیٔ شوق کی قسم

دو اشک تھے سو دیدۂ تر سے گذر گئے — اپنی تو اب تمام ہوئی کائناتِ غم
جب فزوں ہوتا ہے غم آنکھیں چرا جاتا ہے دل — اور کیا ہوتی بنائے عالمِ دیوانگی

مسلمانوں کی مشہور لڑائیاں از جناب محمد آیس خاں صاحب ناغز۔ تقطیع خورد، ضخامت ۸۸ صفحات طباعت و کتابت متوسط قیمت عہ پتہ :۔ انجمن ترقی اردو ہند عابد روڈ حیدر آباد دکن۔

اس کتاب کے لائق مولف ایک بڑے فوجی عہدہ دار ہیں اور ہندوستانی فوج کے ساتھ بڑے بڑے معرکوں میں شریک رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی مطالعہ کا ذوق خداداد بھی رکھتے ہیں۔ اسی ذوق کا نتیجہ

یہ کتاب ہے جو غالباً موصوف کی پہلی قلمی کوشش ہے اس میں اسلامی تاریخ سے چن کر گیارہ مختلف لڑائیوں کا بیان ہے جو ایران، شام، اسپین، سندھ، جزیرہ سسلی، فلسطین اور خراساں وغیرہ میں لڑی گئیں اور جن میں مسلمانوں نے سامانِ جنگ اور سپاہیوں کی دشمن کے بالمقابل کمی کے باوجود شجاعت اور بہادری کے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ یہ کتاب موضوعِ بحث کے اعتبار سے مختصر بہت ہے لیکن لائق مولف نے یہ اختصار قصداً اس لئے اختیار کیا ہے کہ "مطالعہ کسی کو گراں نہ ہو اور مسلمان اپنے اسلاف کی بہادری کے کارناموں سے واقف ہو جائیں"۔ عام بچوں اور بچیوں کے علاوہ اس کتاب کا مطالعہ ان مسلمانوں کو ضرور کرنا چاہئے جن غریبوں کو اپنی اقلیت کا ڈر کسی کل چین نہیں آنے دیتا۔

مسکراتے آنسو از بھارت چند صاحب کھنہ تقطیع خورد ضخامت ۱۵۲ صفحات کتابت وطباعت متوسط قیمت ۱۲/ پتہ:۔ عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل اردو گلی حیدر آباد دکن۔

کھنہ صاحب اردو زبان کے نئے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ لیکن قلم میں روانی اور بیان میں شگفتگی کا جوہر ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔ یہ کتاب موصوف کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں ہندوستان کی عام سماجی زندگی کے مختلف خط وخال نمایاں کئے گئے ہیں۔ اس طرح پلاٹ میں افادیت کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ کھنہ صاحب کے قلم کی رفتار بتا رہی ہے کہ اگر وہ برابر لکھتے رہے اور اردو زبان کے مسلم اساتذہ کے اسالیبِ نگارش کو سامنے رکھکر وہ اپنے ذوقِ ادب کی تکمیل کرتے رہے تو ایک دن صفِ اول کے ادیبوں میں ان کا شمار ہو سکیگا۔ ان افسانوں میں "ادیب بیوی" "نوکر" "شیرنی کا بچہ" اور "تین خط" ہمیں خاص طور سے پسند آئے۔ ایک شگفتہ تحریر میں "لبِ سڑک" ص ۴۹ "ظہور ہونے والی" ص ۵۰ "رنگ برنگے" ص ۵۶۔ اور "دن بدن" ص ۸ جیسی غلط ترکیبیں بری طرح کھٹکتی ہیں۔